نوجوانوں میں اخلاقی اقدار کا فقدان اور اعلیٰ تعلیمی ادارے

(سیرت طیبہ کی روشنی میں اصلاحی اقدامات)

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

مہرین زاہد

ایم فل، علومِ اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

صدرِ شعبہ علوم اسلامیہ، نمل اسلام آباد

شعبہ علومِ اسلامیہ

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۰ء

نوجوانوں میں اخلاقی اقدار کا فقدان اور اعلیٰ تعلیمی ادارے

(سیرت طیبہ کی روشنی میں اصلاحی اقدامات)

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

مہرین زاہد

ایم فل، علومِ اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

صدرِ شعبہ علوم اسلامیہ، نمل اسلام آباد

شعبہ علومِ اسلامیہ

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۰ء

© مہرین زاہد

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **نوجوانوں میں اخلاقی اقدار کا فقدان اور اعلی تعلیمی ادارے**

سیرت طیبہ کی روشنی میں اصلاحی اقدامات

Deterioration of Ethical values in youth and higher educational Institutes

Its solution in the light of Sunnah

نام ڈگری: ایم فل علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: مہرین زاہد

رجسٹریشن نمبر: MP-IS-AS16-215

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری
(نگران مقالہ) _____ نگران مقالہ کے دستخط

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) _____ ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے دستخط

بریگیڈیئر محمد ابراہیم
(ڈائریکٹر جنرل) _____ ڈائریکٹر جنرل کے دستخط

تاریخ: _____

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں مہرین زاہد ولد زاہد افضل

رولنمبر: MP/ S16/215 رجسٹریشن نمبر:1185/MP/IS/S16

طالبہ، ایم فل، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ

بعنوان: **نوجوانوں میں اخلاقی اقدار کا فقدان اور اعلی تعلیمی ادارے**

سیرت طیبہ کی روشنی میں اصلاحی اقدامات

Deterioration of Ethical values in youth and higher educational Institutes

Its solution in the light of Sunnah

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور **ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: مہرین زاہد

دستخط مقالہ نگار: 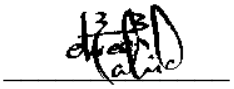

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

فہرست موضوعات

نمبر شمار	موضوعات	صفحہ نمبر
۱.	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	IV
۲.	حلف نامہ فارم	V
۳.	فہرست موضوعات	VI
۴.	انتساب	VIII
۵.	اظہار تشکر و امتنان	IX
۶.	رموز اشارات	X
۷.	مقدمہ	XI
۸.	**باب اول: اخلاق کا مفہوم، ضرورت اور دائرہ کار**	۱
۹.	فصل اول: اخلاق کا مفہوم	۲
۱۰.	فصل دوم: اخلاق کی اہمیت واثرات	۱۱
۱۱.	فصل سوم: اخلاق کی اقسام	۳۰
۱۲.	فصل چہارم: اخلاق کا دائرہ کار	۵۴
۱۳.	**باب دوم: نوجوان قوم کے معمار**	۷۸
۱۴.	فصل اول: نوجوانوں کی اہمیت	۷۹
۱۵.	فصل دوم: اخلاقی اقدار کی ترویج میں نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار	۸۷
۱۶.	فصل سوم: اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں	۹۸
۱۷.	**باب سوم: مروجہ نظام تعلیم اور اخلاقی اقدار کا جائزہ**	۱۱۴
۱۸.	فصل اول: تعلیم کی اہمیت و مقاصد	۱۱۵
۱۹.	فصل دوم: نظام تعلیم کے بنیادی عناصر	۱۲۹
۲۰.	فصل سوم: نصاب تعلیم اور اخلاقی اقدار کا فروغ	۱۴۴
۲۱.	**باب چہارم: اعلیٰ تعلیمی ادارے اور نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب**	۱۵۳

۲۲.	فصل اول: تعلیمی اداروں کا تعارف	۱۵۴
۲۳.	فصل دوم: سروے نتائج اور تجزیاتی مطالعہ	۱۶۸
۲۴.	فصل سوم: نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب	۱۷۹
۲۵.	فصل چہارم: مروجہ نظام تعلیم کے مسائل اور اخلاقیات	۱۹۴
۲۶.	**باب پنجم: نظام تعلیم میں اخلاقی اقدار کو سمونے کے نبوی اقدامات**	۲۰۵
۲۷.	فصل اول: آنحضرت ﷺ کا طریقہ تعلیم وتربیت	۲۰۶
۲۸.	فصل دوم: تربیت اخلاق اور منہاج نبوی	۲۱۸
۲۹.	فصل سوم: نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کا فروغ اسوہ سیرت کی روشنی میں	۲۲۹
۳۰.	نتائج مقالہ	۲۴۲
۳۱.	سفارشات	۲۴۵
۳۲.	فہرست آیات مبارکہ	۲۴۹
۳۳.	فہرست احادیث	۲۵۳
۳۴.	فہرست شخصیات	۲۵۷
۳۵.	مصادر ومراجع	۲۵۸

انتساب

میری یہ تحقیقی کاوش میرے والد محترم زاہد افضل کے نام ہے۔ جنھوں
نے تعلیم کے ہر مرحلے میں میری بھرپور معاونت کی اور والدہ کی قربانیوں
،جدوجہد اور دعاؤں کی بدولت میں آج اس مقام پر پہنچی ہوں۔

اظہار تشکر

سب سے پہلے خدائے بزرگ و بر تر کا شکر ادا کرتی ہوں، جس کی دی ہوئی صلاحیتوں اور مدد کے ساتھ میں مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔اس کے بعد میں شعبہ علوم اسلامیہ ،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کی شکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے ایم فل(علوم اسلامیہ) کے لیے یہ مقالہ لکھنے کی منظوری دی۔میں اپنے نگران مقالہ محترم جناب ڈاکٹر سید عبدالغفار بخاری کی شکر گذار ہوں جن کی کمال شفقت اور رہنمائی سے میرا یہ کام تکمیل کے مراحل تک پہنچا۔

تحقیقی مقالے کا کچھ تعلق field research سے تھا۔اس مقالے میں سروے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سروے کے لیے تین یونیورسٹیوں کا وزٹ کیا گیا تھا،جو کہ خاصا کٹھن کام تھا۔طلباء کے مصروف مطالعاتی اوقات میں سوالنامہ پر کروانے کے لیے ان سے وقت لینے میں دشواری ہوئی۔ اس حوالے سے میں خصوصی طور پر اپنے والد محترم زاہد افضل اور بھائی فرحان زاہد کی مشکور ہوں جنھوں نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ میں گورنمنٹ ڈگری کالج کلر سیداں کی شعبہ کمپیوٹر سائنس کی لیکچرار کومل حراز اہد کے تعاون کی مشکور ہوں جنھوں نے Data analysis میں میری رہنمائی فرمائی۔ ان کے تعاون کے بغیر سوالناموں کا تجزیہ کرنا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔ میں ان احباب کی بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے میرے لیے وقت نکالا اور سروے فارم کے سوالنامے کو حل کر کے مجھے واپس کیے۔

مہرین زاہد

رموز اشارات:

اس مقالہ میں درج ذیل رموز و اشارات کا استعمال کیا گیا ہے۔

ص = صفحہ نمبر کے لئے

P= انگریزی حوالہ جات کے لئے

" " = اقتباسات کے لیے

/ = لکیر کی دائیں طرف جلد نمبر اور بائیں طرف صفحہ نمبر

کتاب کے مکمل حوالہ میں پہلے کتاب کا پھر مصنف کا نام اس کے بعد ناشر اور مقام اشاعت صفحہ اور جلد نمبر

﴿﴾= قران مجید و حدیث کے لیے

(( ))= حدیث کے لیے

مقدمہ

موضوع تحقیق کا پس منظر:

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس نے معاشرے کے افراد کی نہ صرف مادی تربیت بلکہ روحانی و اخلاقی تربیت پر بھی زور دیا اعلیٰ اخلاق اور بلند پایہ صفات کے حاملہ نوجوان ہی قوم کے لئے ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ نوجوانوں میں تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت، خالق کے ساتھ جوڑنے اور انسانی تعلقات کو مربوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ عصر حاضر میں اخلاقی تنزلی سے معاشرہ بے شمار مسائل کا شکار ہے۔ نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اخلاقی قدروں کو فراموش کیئے ہوئے ہیں۔ یہی المیہ ہے کہ امت مسلمہ علمی ومادی لحاظ سے ترقی کے عروج کے باوجود انحطاط کا شکار ہے۔ وہ کیا وجوہات ہیں کہ اخلاقی قدریں ایک سوالیہ نشان بن گئی ہے اور تعلیم کے حصول کے باوجود مہذب معاشرے کی تشکیل غیر یقینی نظر آتی ہے۔ زیر بحث موضوع پر بہت سی تصانیف پائی جاتی ہیں جن میں اخلاق، نوجوان اور تعلیم پر الگ الگ تو بحثیں ملتی ہیں لیکن ان سب کو یکجاء کر کے ان پر مفصل تجزیہ کسی مستقل کتاب کی صورت میں منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی سیرت و کردار اور مکارم اخلاق سے، عرب کے جاہلانہ اور فرسودہ روایات کو تہذیب یافتہ بنا دیا۔ دور حاضر میں انہی نبوی عوامل اور محرکات پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جن سے معاشرے کو اخلاقی پسماندگی سے نکالا جاسکے۔ مقالہ ہذا میں نوجوانوں میں اخلاقی فقدان کے اسباب اور نبوی اصلاحات پر توجہ دی جائے گی۔ تحقیق کا میدان اعلی تعلیمی اداروں کو لیا جائے گا اور سروے کی روشنی میں اقدامات تجویز کیئے جائیں گے لہذا اس پر تحقیقی و تجزیاتی بحث کی ضرورت ہے اور اسی لئے زیرِ نظر مقالہ میں اس کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے۔

موضوع کا تعارف:

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر دور میں معاشروں کی تعمیر میں نوجوانوں کا ایک اہم کردار رہا ہے جب جب انسانوں کی بنجر زمین کو زرخیز کرنے کے لیے اس میں خون بہانے اور قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آئی تو یہی نوجوان میدان عمل میں آئے انہوں نے اپنے ذوق عمل اور عزم وہمت سے وہ کارنامہ ہائے سر

انجام دیئے جو رہتی دنیا تک فراموش نہ کئے جاسکیں گے غرض نوجوانوں کا کردار ہر دور میں نالاں رہا ہے اور نوجوان نسل ظہور اسلام سے آج تک بلا امتیاز زمان و مکان امت کا ستون گردانے جاتے رہے ہیں۔ نوجوان طبقہ امت مسلمہ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اسلام کی عزت و ترقی اسکے ناموس کی ذمہ داری اور لشکر اسلام کی کمان بھی نوجوانوں پر رہیں۔ اسلام نے نوجوانوں کو خاص مقام عطا کیا ہے اور اس کو مستقبل کا معمار اور اسلامی قیادت کا سپہ سالار قرار دیا ہے لیکن یہ سب اس وقت تک قائم رہا جب تک نوجوان نظریہ و افکار کے ساتھ ساتھ علم و عمل کے مختلف میدانوں میں بھی کوشاں رہے اور بلند سیرت و کردار سے اسلام کی عزت و ترقی نیز اس کے ناموس کی ذمہ داری سنبھالی۔ عصر حاضر میں جس تیز رفتاری سے دنیا میں مادی ترقی ہو رہی ہے اسی رفتار سے اخلاقی قدروں کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا ہے بلکہ پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اسلام دنیا کا واحد نظام حیات ہے جس میں اخلاقیات کو مادیت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے حضرت محمد ﷺ کی ذات اخلاق عالیہ کے سب سے اعلیٰ منصب پر فائز ہے، آپ کی ان گنت اوصاف حمیدہ اور بے شمار و بے مثال کمالات جلیلہ میں سے ایک وصف خاص خلق عظیم بھی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ

آپ ﷺ کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، معاشرت سے ہو یا سیاست سے، حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے الغرض آپ کی جملہ ہدایات و تعلیمات حسن خلق کا مظہر اتم ہیں۔ آپ ﷺ نے نوجوانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت کو بھی بہت سر انجام دیا اور انہیں الہامی تعلیم سے نہ صرف جزیرہ عرب کہ اس وقت کی بلکہ قیامت تک تمام بسنے والی انسانیت کے لیے ہمہ گیر انقلاب کی نوید سنائی۔

تعلیم ہی وہ بنیادی ذریعہ ہے جس سے ریاستی و معاشرتی اور مذہبی و اخلاقی اقدار سے متعارف کرایا جا سکتا ہے، جس قدر نوجوانوں کی اخلاقی اقدار و روایات کی طرف توجہ کی جائے اتنا ہی امت اور معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو گا۔ جبکہ موجودہ پاکستانی معاشرے میں تعلیم یافتہ جماعت نے نہ صرف اخلاق کو خیر آباد کہ دیا

ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حصول تعلیم اور تربیت کا اب کوئی ربط ہی باقی نہیں رہا ہے تعلیم حاصل کرنا اور تعلیم یافتہ ہونا دو الگ باتیں نظر آتی ہیں نیز ادب و آداب کا قصہ کوئی علیحدہ ہی چیز ہے۔

موضوع تحقیق کی اہمیت:

قوم کے نظریات جو کہ اسلامی و اخلاقی اقدار کے پس منظر میں تربیت پاتے ہیں اور آگے چل کر قوم کے عروج و زوال کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ان نظریات کو زندہ رکھنے کے لیے بنیادی کردار نظام تعلیم کو ہی ادا کرنا ہوتا ہے، تعلیم ہی سب سے طاقتور، مؤثر اور باعتبار ذریعہ ہے جو کہ علمی و اخلاقی تربیت کو پروان چڑھانے کا فریضہ انجام دیتا ہے ،اعلی کردار اور بلند پایاں نوجوان ہی ترقی و ناموس کا پیش خیمہ ہوتے ہیں لیکن عصر حاضر میں نظام تعلیم خصوصاً اعلی تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کی اخلاقی تربیت سے غفلت برتی جارہی ہے۔ اسلامی معاشرہ انحطاط کا شکار ہے یہ اخلاقی پسماندگی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اسباب و محرکات کو تلاش کیا جائے جو اس اخلاقی تنزلی کا ذریعہ ہیں تاکہ مہذب و شائستگی انگیز معاشرہ تشکیل پائے اور قوم ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو۔ مزید برآں سیرت طیبہ کی روشنی میں نوجوانوں کو ان عوامل سے روشناس کرایا جائے جن کے توسط سے تعلیمی نظام کے تحت اخلاقی تربیت بروئے کار لائی جاسکے۔

موضوع تحقیق کا بنیادی مسئلہ:

نوجوان نسل امت مسلمہ کا ایک قیمتی سرمایہ اور معاشرے کا یک اہم اثاثہ ہیں کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے نوجوانوں کی اخلاقی و تعلیمی تربیت بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ آج امت مسلمہ علمی و مادی ترقی کے باوجود انحطاط کا شکار ہے جسکی اہم وجہ نوجوانوں میں اخلاقی پسماندگی ہے اعلی تعلیمی اداروں میں اعلی سندوں کے حصول کے باوجود نوجوانوں میں حسن اخلاق بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں میں پیشہ وارانہ و فنی تعلیم اور علمی رجحانات پر زور دیا جاتا ہے مگر اخلاقی قدروں کو اہمیت حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ آج تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی لحاظ سے بحران کا شکار ہے جس نے انسانی زندگی کو بہت سی مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ مقالہ ھذا میں عصر حاضر کے تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کی اخلاقی اقدار کے فقدان کے اسباب کو تلاش کیا جائے گا اور اخلاقی تربیت کو سمونے کے لیے نبوی اقدامات و اثرات کو واضح کیا جائے گا تاکہ سیرت طیبہ کی روشنی میں نوجوانوں میں اخلاقی تربیت کو ممکن بنایا جاسکے۔

موضوع تحقیق کی تحدید کار:

زیر بحث موضوع کے بنیادی عناصر نوجوان ،اخلاق اور تعلیم ہیں۔اس تحقیق میں عصر حاضر کے نوجوانوں کے اخلاقی رجحانات کو جانچنے اور موجودہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب جاننے کے لیے اسلام آباد کی مشہور تین یونیورسٹیاں جن میں اسلامی یونیورسٹی، نمل اور وفاقی اردو یونیورسٹی شامل ہیں کا سروے کیا گیا ہے۔ہر یونیورسٹی سے سو اسکالرز کا انتخاب کیا گیا ہے، جن کی عمر بائیس سے تیس سال کے درمیان ہے۔اس سروے میں یونیورسٹی کی سطح کے ہر شعبہ تعلیم گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ ،شعبہ اسلامیات اور شعبہ مینیجمنٹ سائنسز وغیرہ سے متعلقہ افراد کی آراء کا سوالنامے کے ذریعے جائزہ لیا گیا ہے۔ سروے کے ساتھ ساتھ سوالنامے حل کروا کر آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے نتائج نکالے گے ہیں۔نیز بنیادی ماخذ کی روشنی میں نبوی اقدامات اور ایسے عوامل تلاش کیے گے جن سے نوجوانوں میں اخلاقی تربیت ممکن بنائی جاسکے۔

اہداف مقاصدِ تحقیق:

زیر بحث موضوع پر علمی تحقیق سے مقاصدِ ذیل کا حصول مقالہ نگار کے پیش نظر ہیں:

۱۔ نوجوانوں کے کردار اور اہم اخلاقی و معاشرتی ذمہ داریوں کی وضاحت کرنا۔

۲۔ مروجہ نظام تعلیم اور اخلاقی اقدار کا جائزہ لینا۔

۳۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کی اخلاقی تنزلی کے اسباب تلاش کرنا۔

۴۔ نوجوانوں میں موجودہ نظام تعلیم کے تحت اخلاقی اقدار کے احیاء کے لئے اہم عوامل کی وضاحت کرنا۔

۵۔ عصر حاضر میں اخلاقی اقدار کو سمونے کے یے نبوی اقدامات واثرات کی توضیح کرنا۔

تحقیقی سوالات:

۱۔ اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کا کردار اور ذمہ داریاں کیا ہیں؟

۲۔ مروجہ نظام تعلیم اور اخلاقی اقدار کے مابین کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے؟

۳۔ اعلی تعلیمی اداروں کے نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب کیا ہیں؟

۴۔ کن عوامل کے ذریعے مروجہ نظام تعلیم کے تحت اخلاقی اقدار کو پیدا کیا جاسکتا ہے؟

۵۔ طلباء میں اخلاقی قدار کو سمونے کے نبوی اقدامات کون کون سے ہیں؟

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

زیر بحث موضوع موجودہ دور کے تناظر میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس موضوع پر پر ہر دور میں کسی نہ کسی طرز پر تصانیف مرتب کی گئی ہیں لیکن پھر بھی اس موضوع کے کچھ پہلو اور گوشے تشنہِ تحقیق ہیں جن کو بازیافت کئے بغیر موضوع کا کامل مطالعہ ممکن نہیں اس سلسلے میں چند قابل ذکر کتابیں اور ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱- محمد اختر، شاہ حکیم ،اصلاح الاخلاق ،کتب خانہ مظھری، گلشن اقبال کراچی، پاکستان،اس کتاب میں اخلاق کے مفہوم، اہمیت اور اعلی اخلاقی مظاہر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲- طبرانی، ابو قاسم سلیمان ابن احمد، مکارم اخلاق، مکتبہ المدینہ باب المدینہ کراچی ،یہ تصنیف نبی کریم ﷺ کے اخلاق جمیلہ کی توضیح پر مشتمل ہے نیز اخلاق حسنہ پر مشتمل احادیث کو درج کیا گیا ہے۔

۳- الطاف علی ، تعلیمی مسائل پس منظر اور پیش منظر، اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ- آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، کراچی ء۱۹۹۵۔ مختلف ادوار میں پائی جانے والی تعلیمی پالیسیاں، کانفرنسیں ،ان کے مقاصد اور اخلاق کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ نیز تعلیمی مسائل کو ذکر کیا گیا ہے۔

۴- اسرار عالم، عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹریبیوٹرز، ء۱۹۹۶۔

اسلوب اور منہج تحقیق:

مقالہ کی تحقیق کے لیے درج ذیل اسلوب اور لائحہ عمل اختیار کیا گیا ہے۔

۱۔ مقالہ کی تحقیق کے لیے بیانیہ و دستاویزی طریقہ تحقیق اور field work جس میں سروے شامل ہیں۔

۲۔ تجزیاتی انداز اپناتے ہوئے موضوعِ زیر بحث کے مختلف رخ و پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گی ہے۔

۳- چونکہ زیر بحث موضوع فیلڈ ورک کا تقاضا کرتا ہے چنانچہ ۳ مختلف جامعات کا انتخاب کیا گیا ہے اور ہر جامعہ کے ۱۰۰ طلباء سے موضوع سے متعلقہ سوالنامے حل کروا کے ان کی آراء کا جائزہ لیا جائے گا۔

۴- دوران انتخاب random sampling technique استعمال کی گئی۔

خاکہ تحقیق:

باب اول: اخلاق کا مفہوم، ضرورت اور دائرہ کار

فصل اول: اخلاق کا مفہوم

فصل دوم: اخلاق کی اہمیت واثرات

فصل سوم: اخلاق کی اقسام

فصل چہارم: اخلاق کا دائرہ کار

باب دوم: نوجوان قوم کے معمار

فصل اول: نوجوانوں کی اہمیت

فصل دوم: اخلاقی اقدار کی ترویج میں نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار

فصل سوم: اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں

باب سوم: مروجہ نظام تعلیم اور اخلاقی اقدار کا جائزہ

فصل اول: تعلیم کی اہمیت و مقاصد

فصل دوم: نظام تعلیم کے بنیادی عناصر

فصل سوم: نصاب تعلیم اور اخلاقی اقدار کا فروغ

باب چہارم: اعلیٰ تعلیمی ادارے اور نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب

فصل اول: تعلیمی اداروں کا تعارف

فصل دوم: سروے نتائج اور تجزیاتی مطالعہ

فصل سوم: نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب

فصل چہارم: مروجہ نظام تعلیم کے مسائل اور اخلاقیات

باب پنجم: نظام تعلیم میں اخلاقی اقدار کو سمونے کے نبوی اقدامات

فصل اول: آنحضرت ﷺ کا طریقہ تعلیم وتربیت

فصل دوم: تربیت اخلاق اور منہاج نبوی

فصل سوم: نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کا فروغ اسوہ سیرت کی روشنی میں

Abstract

It is evident that moral ethical values and character building of the national population through quality of education is very important for flourishing of a nation. However, It is observed that the students studying in different educational level especially at university level are badly lacking the moral ethical values and conduct due to which they are facing many social, cultural, moral and ethical challenges. Unpleasing conduct of youth not only deteriorating for the youth but the whole society of Pakistan. This results in to irresponsibilities, crimes, robbery, sexual abuses, violence, carelessness, dishonesty and misbehavior. This can be because of so many reasons, most importantly less emphasis on moral building of youth by the contemporary educational system of Pakistan ,moreover lack of parents interest in building their children positive moral attributes, teachers ignorance uplifting of their students moral values and least efforts by the Government institutions and the religious scholars in character building of youth.Therefore,there is a need to investigate the reasons behind the adverse moral attitude of the youth at the educational level and its findings and solutions. This study is aimed to investigate the causes and facts of adverse ethical conduct and moral attitude of youth studying at university in Pakistan and finding out remedial measures in the light of Sunnah Un Nabawiyyah.This study is based on a survey which will be conducted from three different universities of Islamabad to find out the reasons of the unsatisfactory behavior of the youth. On the basis of findings and recommendations solutions will be given for the improvement of the moral and ethical values of the youth in the light of Sunnah.

باب اول

اخلاق کا مفہوم، ضرورت اور دائرہ کار

فصل اول: اخلاق کا مفہوم

فصل دوم: اخلاق کی اہمیت واثرات

فصل سوم: اخلاق کی اقسام

فصل چہارم: اخلاق کا دائرہ کار

فصل اول

اخلاق کا مفہوم

فصل اول:

اخلاق کا مفہوم

معاشرے کے اندر انسانی تعلقات کو مربوط کرنے کے لیے اخلاق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اس نے اپنے ماننے والوں کو جامع واعلیٰ اخلاقی معیارات سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء نبی اکرم ﷺ اعلیٰ وپایاں اخلاق کے مالک تھے۔ آپ ﷺ نے اخلاقی تربیت پر اس قدر زور دیا کہ اگر مذہب اسلام کی تعلیم کا لب لباب ایک لفظ میں سمو دیا جائے تو وہ اخلاق ہیں۔ اخلاق کے بغیر معاشرے کی اجتماعی ترقی اور امن وسلامتی کی بقا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا مفہوم جاننے کے لیئے اس کے لغوی واصطلاحی مفاہیم کو مختلف کتب اور علماء کے اقوال میں بیان کیا جارہا ہے۔ نیز خَلق اور خُلق میں کیا فرق ہے قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

اخلاق کا لغوی معنٰی:

اخلاق، خلق کی جمع ہے۔ "**والخلق من مادة (الخلقة):الفطرة أولطبيعة التى يخلق بها الانسان**"[1]

ترجمہ: **خلق، خلقة** سے اخذ کیا گیا ہے جس سے مراد وہ فطرت اور طبع ہے جس پر انسان کو تخلیق کیا گیا ہے۔

علامہ ابنِ منظور کے نزدیک خلق سے مراد باطنی اوصاف وعادات ہیں، آپ لکھتے ہیں:

"**الخلق هوالدين والطبع والسجية** "[2]

ترجمہ: خلق سے مراد دین، طبیعت اور خصلت ہے۔

ابن عاشور کے نزدیک خلق کا اطلاق فطرتِ حمیدہ پر ہوتا ہے، جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

"**الخلق طباع النفس وأكثر اطلاقه على طباع الخير اذالم يتبع بنعت**"[3]

ترجمہ: خلق سے مراد، نفس کی وہ طبیعتیں ہیں جن کا اکثر اطلاق اچھی طبیعتوں پر ہوتا ہے اگر اس لفظ کے ساتھ کسی صفت کا اضافہ نہ ہو۔

---

(۱) معجم متن اللغہ ، احمد رضا، علامہ اللغوی، دار مکتبہ الحیاۃ، بیروت، ۱۹۵۸م، ۲/ ۳۲۵

(۲) لسان العرب، علامہ ابن منظور، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۸۸م، ۴/ ۱۹۳

(۳) المعجم فی فقہ لغۃ القرآن وسر بلاغتہ، الخراسانی، محمد واعظ زادہ، معجم البحوث الاسلامیۃ، ۱۳۹۰م، ۱۷/ ۲۸۲

المعجم الوسیط میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"الخلق هی الصفات التی تظهر من خلق الانسان خلاف ما ینطوی علیه"[1]

ترجمہ: خلق سے مراد وہ صفات ہیں جو کہ انسان کے قصد وارادے کے خلاف اس کی طبیعت سے فطرتاً ظاہر ہوتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی نے خَلق اور خُلق میں اس طرح سے فرق واضح کیا ہے:

"الخلق هو ابداع الشیء من غیر اصل ولااحتذاء وخص الخلق بالقوی والسجایاالمدرکة بالبصیرة"[2]

ترجمہ: خَلق سے مراد عدم سے وجود میں لانا جبکہ خُلق سے مراد وہ جبلی اور طبعی صفات ہیں جن کا ادراک بصیرت سے کیا جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((فَرَغَ اللهُ مِنَ الخَلقِ وَالخُلقِ وَالرِّزقِ وَالاَجَلِ))[3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ پیدائش، طبیعت، رزق اور موت کے معاملے کو مکمل کر چکا۔

علامہ ماوردی کے نزدیک، خلق سے مراد وہ ضابطہ ہے جو انسان اپنے نفس کے لیے اپناتا ہے۔

"حقیقة الخلق فی اللغة هو مایأخذ به الانسان نفسه من الآداب سمی خلقا لأنه یصیر کا لخلقة فیه فأما ما طبع علیه من الآداب فهو الخیم فیکون الخلق الطبع المتکلف والخیم هوالطبع العزیزی"[4]

ترجمہ: لغت میں خلق کا حقیقی معنیٰ یہ ہو گا کہ انسان اپنے نفس کے لیے جو ادب اپناتا ہے اسے خلق کہتے ہیں کیونکہ یہ چیز اس میں خلقت کی طرح ہوتی ہے۔ جس ادب پر اس کو پیدا کیا جاتا ہے اس کو خیم (پہاڑ کا نام) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ خلق ایسی فطرت ہے جس میں تکلف ہو اور خیم ایسی فطرت ہے جو پیدائشی ہو۔

اردو لغات میں خلق سے مراد طبیعت، مروت اور عادت ہے۔ مولوی فیروز الدین لکھتے ہیں:

---

(۱) المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفیٰ، دارالدعوۃ، استنبول، ترکی، ۱۹۸۹م، ۱-۲/ ۲۲۵

(۲) المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، ابوالقاسم الحسین بن محمد، دارالقلم، دمشق، بیروت، الطبعہ الاولیٰ، ۱۶۱۲ھ، ۱/ ۲۹۶

(۳) سنن الدارقطنی، علی بن بحر ابوالحسن، دارقطنی، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۹۶۶م، کتاب الرضاع، حدیث نمبر: ۳۶، ۴/ ۱۸۲

(۴) المعجم فی فقہ لغۃ القرآن وسر بلاغتہ، محمد واعظ زادہ، الخراسانی، ۱۷/ ۲۸۲

"خلق سے مراد خو، خوش مزاجی اور خصلت ہے" (۱)

اس سے مراد افتاد، طبیعت اور سرشت (۲) بھی لیا جاتا ہے۔

نیر مرحوم نورالحسن لکھتے ہیں کہ خلق کا اطلاق ملنساری، خوش مزاجی اور مروت پر ہوتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اخلاق ضرب المثل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظِ اخلاق بے مثل اور عمدہ صفات کے لیے مستعمل ہے۔ (۳)

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (۴)

ترجمہ: اور بلاشبہ آپ اخلاق کے بہت بڑے مرتبے پر ہیں

اس آیت کریمہ میں خلق سے مراد اسلام، دین یا آداب القرآن ہیں۔ یعنی آپ ﷺ ان اعمال و اخلاق کا نمونہ ہیں جن کی تعلیم قرآن مجید دیتا ہے، آپ ﷺ کے خلق کو عظیم کا نام دیا گیا کیونکہ آپ ﷺ میں مکارمِ اخلاق جمع ہیں۔ (۵)

انگریزی لغت میں اخلاق کے لیے Ethics کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ای-مریٹ (Dr.E.Muret) کے مطابق:

"Ethics deal with moral codes". (6)

ترجمہ: Ethics کا تعلق اخلاقی اصولوں سے ہے۔

لونگ مین ڈکشنری آف ایتھکس لینگویج میں "Ethics" کی اصطلاح کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے۔

"Ethics is a verb, a set of moral principles of conduct or morality of governing on individual or a group." (7)

---

(۱) فیروزاللغات، مولوی فیروزالدین، فیروز سنز لمٹیڈ، عبدالسلام، لاہور، ۱۹۶۴م، ص: ۵۹۵

(۲) فرہنگ تلفظ، شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان، ستارہ مارکیٹ، جی سیون مرکز، اسلام آباد، ۱۹۹۵م، ص: ۴۹۲

(۳) نوراللغات، نیر مرحوم نورالحسن، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ۱/۱۲۶۱

(۴) سورۃ القلم: ۶۸/۴

(۵) الجامع لأحکام القرآن، محمد بن احمد بن ابو بکر، قرطبی، دارالفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵م، ص: ۲۱۰

(6) New Muret- sanders Encyclopedic Dictionary, E. Muret and D.sanders Langenscheidt, U.S.A Ban Francisco, California,1969, 1/477.

(7) Longman Dictionary of the English Language, long man group limited, longman house, Burnt Mill Harlow, England, Merriam –webster. 1984,p:503

ترجمہ: لفظ "Ethics" ایک فعل ہے جو اخلاق پر مشتمل اصولوں کا ایسا مجموعہ ہے جو کسی فرد یا گروہ پر حکومت کرنے کے اخلاقیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

مذکورہ تمام تعریفات میں، لغوی اعتبار سے اخلاق کے درج ذیل معانی اخذ کیے جاتے ہیں:

۱. اخلاق خلق کی جمع ہے جس سے مراد خصلت، فطرت اور طبیعت ہے جس پر انسان کو تخلیق کیا گیا ہے۔

۲. اس سے مراد وہ عادات و صفات ہیں جو انسان اپنے نفس کے لیے اپناتا ہے اور پھر وہ اس کی خلقت کا حصہ بن جاتی ہیں۔

۳. اخلاق انسان کی ایسی طبعی طاقت کا نام ہے جس سے نہایت تھوڑے ارادہ کے بغیر اعمال صادر ہوتے ہیں۔

۴. لفظ "اخلاق" اپنے اندر اچھے اور برے دونوں پہلو سموئے ہوئے ہے لیکن اکیلے لفظ اخلاق سے "اخلاق حسنہ" ہی مراد لیے جاتے ہیں جبکہ اخلاق سیئہ کے اظہار کے لیے اخلاق کے ساتھ ایک اور لفظ برے یا "سیئہ" وغیرہ کا اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

اخلاق کا اصطلاحی مفہوم:

اصطلاحی اعتبار سے علماء نے اخلاق کی تعریف مختلف نقطہ نظر سے کی ہے جن میں سے چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے:

امام غزالی کے نزدیک:

"یعرف الخلق الحسن انه اصلاح القوی الثلاث قوة التفکروقوة الشهوة وقوة الغضب"[1]

ترجمہ: اخلاقِ حسنہ تین قوتوں کی اصلاح کا نام ہے فکر کی قوت، خواہش کی قوت اور غصے کی قوت۔

"فالخلق عبارة عن هیئة فی النفس راسخة عنها تصدر الأفعال بسهولة ویسر من غیر حاجة الی فکر وروية فان کانت الهیئة بحیث تصدر عنها الأفعال الجملية المحمودة عقلا وشرعاسمیت تلک الهیئة خلقا حسنا وإن کان الصادر عنها الأفعال القبیحة سمیت الهیئة التی هی المصدر خلقا سیئا"[2]

ترجمہ: خلق نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیئت راسخ کا نام ہے جس کی وجہ سے نہایت سہولت اور آسانی کے ساتھ اور کسی تفکر و توجہ کے بغیر نفس سے اعمال صادر ہو سکیں۔ پس اگر یہ ہیئت اور کیفیت اس

---

(۱) میزان العمل، امام غزالی، دارالمعارف بمصر، الطبعہ الاولیٰ، ۱۹۷۳ء، ص: ۲۴۸-۲۴۹

(۲) إحیاء علوم الدین، امام غزالی، دارالمعرفۃ، بیروت، ۳/۵۳

طرح قائم ہے کہ اس سے عقل و شرع کی نظر میں اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں تو اس کا نام "خلق حسن" ہے اور اگر اس سے غیر محمود اور غیر حسنہ اعمال صادر ہوتے ہیں تو اس کو "اخلاق سیئہ" اور "بداخلاقی" کہتے ہیں۔

حافظ ابن قیم کے نزدیک:

"الخلق هو مايرجع اليه المتكلف من نعمته"

ترجمہ: خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف وحالات کو جدوجہد کر کے اپنی طرف راجع کرے۔

كماقيل:"إن التخلق يأتى دونه الخلق"[1]

یعنی اولاً ایک چیز کی بہ تکلف عادت ڈالی جاتی ہے اور پھر وہی بعد میں خلق بن جاتی ہے۔

علامہ ابن منظور کے نزدیک:

"وحقيقته أنه لصورة الانسان الباطنة وهى نفسه واوصافها ومعانيها االمختصة بها بمنزلة الخلق لصورته الظاهرة وأوصافها ومعانيها-"[2]

ترجمہ: اور درحقیقت انسان کی باطنی صورت، نفس اور باطنی اوصاف اور عادات ہیں جو کہ اس کی ظاہری صورت، ظاہری اوصاف اور عادات کے برابر قدرومنزلت رکھتے ہیں۔

امام فخر الدین رازی کے نزدیک:

"الخلق ملكة نفسانية يسهل على المتصف بها الاتيان بالأعمال الصالحة"[3]

ترجمہ: خلق سے مراد ایسی باطنی خصلتیں ہیں جو اپنے متصف کے لیے خوبصورت افعال کو آسان بنادیتی ہیں۔

اصطلاحاً علم اخلاق کی تعریف اس طرح سے بھی کی جاتی ہے:

---

(۱) مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین، محمد بن ابی بکر بن سعد، ابن قیم الجوزیہ، دارالکتب العربی، بیروت ۱۹۹۶ء، ۳۰۱/۲

(۲) لسان العرب، ۱۹/۴

(۳) التفسیر الکبیر، امام فخر الدین الرازی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۹م، ۶۰۱/۳۰

"علم الاخلاق علم موضوعه احكام قيمية تتعلق بالأعمال التى توصف بالحسن أوالقبح"[1]

ترجمہ: علم اخلاق ایسا علم ہے جس کا موضوع وہ اہم احکام ہیں جو اعمال سے تعلق رکھتے ہیں جن کو ہم اچھا یا برا کہہ سکتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک علم اخلاق:

"جس علم میں انسانی کردار پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ وہ صواب و خیر یا خطا و شر اور اس طرح بحث کی جائے کہ یہ تمام احکام صواب و خطا اور خیر و شر کسی مرتب نظام کی شکل میں آجائیں تو اس علم کو علم الاخلاق کہتے ہیں۔" [2]

آر۔اے۔پی۔روجرس نے اخلاقیات کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

"اخلاقیات وہ علم ہے جو ان اصولوں کو دریافت کرتا ہے جن سے کردارِ انسانی کے اصلی غایات کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ ان اصولوں کی اگر تحقیق ہو سکے اور ان کو اسطرح سے صحیح طور پر بیان کیا جاسکے کہ ان سے ضوابطِ کردار مستنبط ہوں تو یہی اصولِ اخلاق معیاری ہوں گے۔"[3]

علم اخلاق کو فلسفے کی ایک قسم بھی کہا گیا ہے جیسا کہ:

"علم الاخلاق أحد اقسام الفلسفة وهوعلم نظرى يحدد مبادئ عمل الانسان فى العالم و غرضه تحديد العناية العليا للانسان أوهو علم بالفضائل وكيفية التحلى بها،والرذائل وكيفية تجنبها " [4]

ترجمہ: علم الاخلاق فلسفے کی ایک قسم ہے اور وہ ایسا نظریاتی علم ہے جو عالم میں انسان کے عمل کی بنیادوں کی تحدید کرتا ہے اور اس کی غرض انسان کے لیے بلند مقصد کو معین کرنا ہے یا وہ ایسے فضائل اور کیفیات کا علم ہے جن کو اپنایا جاتا ہے اور ایسے رذائل اور کیفیات جن سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں اخلاق کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے:

---

(۱) المعجم الوسیط، ۱/ ۲۵۲

(۲) اخلاقیات، جان ڈیوی، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۳۲ء، ص:۱

(۳) تاریخِ اخلاقیات، آر۔اے۔پی۔روجرس، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۳۲ء، ص:۱

(۴) معجم اللغۃ العربیۃ المعاصرۃ، عبد الحمید عمر، أحمد مختار، عالم الکتب، ۱۴۲۹ھ، ۱/ ۶۸۸

"اخلاق معاشرتی معاملات طے کرنے کا اصول یا وہ بات ہے جو بھلائی اور برائی کی تمیز پیدا کرے، جو فضائل اور رذائل کا علم بخشے، ایسا ضابطہ جس کی پابندی کے بغیر اجتماعی زندگی کا تصور محال ہے۔"(۱)

علمِ اخلاق کے لیے انگریزی زبان میں: Morals,Ethics,Morale,Ethique جیسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔(۲)

جن سے مراد ایسے رسوم ورواج یا عادات ہیں جو ایک جماعت کو دوسری جماعت سے ممتاز کرتے ہیں۔

چیمبر انگلش ڈکشنری میں "Ethics" کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے:

"Ethics is that branch of philosophy which is concerned with human character and conduct; a system of morals, rules and behaviors."(3)

ترجمہ: اخلاقیات فلسفہ کی وہ شاخ ہے جس کا تعلق انسان کے کردار ور رویے سے ہے یہ ایک ایسا نظام ہے جس کا تعلق اقدار، اصولوں اور روایات پر مبنی ہے۔

ولیم لیلائی(4) کے نزدیک:

"We may define ethics as the normative science of the conduct of human beings living in societies –a science which judges this conduct to be right or wrong, to be good or bad, or in some similar way."(5)

ترجمہ: اخلاقیات کو معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے رویات کی پرکھ کے لیے معیار بندی کی سائنس کہا جاسکتا ہے ایک ایسی سائنس جو کسی بھی رویے کو اچھائی برائی، صحیح غلط اور اسی طرح کے دوسرے معیارات کے مطابق جانچتی ہے۔

ویبسیٹر زنیو کولگیٹ ڈکشنری میں "ethics " کی وضاحت اس طرح سے کی گئی ہے:

---

(۱) اسلامی انسائیکلوپیڈیا، سید قاسم محمود، الفیصل، اردو بازار لاہور، ص:۱۶۳

(۲) موسوعۃ کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، محمد صابر الفاروقی، بن علی ابن القاضی، مکتبہ لبنان ناشرون، بیروت، ۱۹۹۶ء، ۲/ ۱۲۳۰

(3) Chambers English dictionary,Catherine Schwarz, George Davidson, Great Britain by Richard clay Ltd. Bungay Suffolk, Cambridge, U.K, 1988,p:490

(4) William Lillie, a famous astrologer of seventeenth century, born in 1602 he worked hard on modern astrology and has more than 36 publications between 1647-82

(5) An introduction to ethics, William Lillie, Methuen 8 co.ltd.London,1995,p:2

"Ethic is a discipline dealing with what is good and bad and with moral duty and obligation. It is a theory or a system conforming to accepted professional standards of conduct." (1)

ترجمہ: اخلاقیات ایک ایسا شعبہ ہے جو اچھائی برائی اور اخلاقی فریضے اور ذمہ داریوں کے بارے میں بحث کرتا ہے یہ ایک ایسا نظریہ ہے یا نظام ہے جس کا تعلق تسلیم شدہ پیشہ وارانہ رویوں کے معیارات سے ہے۔

ان تمام تعریفات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ لفظ اخلاق خلق کی جمع ہے۔ خَلق سے مراد تخلیق کیا جانا یا عدم سے وجود میں لانا ہے جبکہ خُلق سے مراد نفس انسانی کی وہ صفات ہیں جو بغیر کسی ارادے کہ اس کی طبیعت سے فطرتاً ظاہر ہوتی ہیں۔ اخلاق کا تعلق اصلاً کردارِ انسانی سے ہے۔ مگر یہ ایک ایسی باطنی کیفیت کا نام بھی ہے جو نفسِ انسان میں اس قدر برقرار اور دائمی صورت میں موجود ہوتی ہے کہ انسان کی فطرت اور طبیعت بن جاتی ہے۔ اور اس سے نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی فکر وارادے کے اعمال صادر ہوتے ہیں جو کہ خلق کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ہر انسان کے اندر طبعی طور پر (Ethical motives) محرکات اخلاق موجود ہوتے ہیں جن کی بناء پر اعمال صادر ہوتے ہیں مگر ان محرکات کی صرف موجودگی سے انسان عمدہ اخلاق کا مالک نہیں کہلایا جاسکتا جب تک کہ ایسا ضابطۂ اخلاق نہ اپنائے جو کہ معاشرے میں احسن طریقے سے طرزِ معاملات اور رویوں کے معیارات کے تحت متعین کیا گیا ہو۔ ایسے شرعی اور عقلی طور پر جائز اور قابلِ تحسین اعمال کو اخلاق حسنہ کہا جاتا ہے، البتہ اگر اعمال غیر محمودہ گردانے جاتے ہوں تو اخلاقِ سیئہ کہلاتے ہیں۔

اچھی صفات کو اپنانے کے لیے انسان کو علم الاخلاق سے آگاہی ہونی چاہیئے۔ ایسا علم جو اپنے اندر انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو ڈھالے ہوئے ہے۔ اس علم میں خیر و شر کے درمیان فرق واضح کیا جاتا ہے۔ اچھائی کو اپنانے اور برائی سے اجتناب کرنے کی غایت اور پہچان کروائی جاتی ہے۔ علم الاخلاق ہی سے انسان معتدل اخلاق اپنانے کے قابل ہوتا ہے بغیر علم کے معتدل اخلاق کی راہ نہیں اختیار کی جاسکتی مگر صرف علم الاخلاق سے آگاہی سے انسان کی اصلاح اور ضابطہ اخلاق کا پابند ہونا ممکن نہیں۔ جب تک کہ انسان کے اندر اخلاق محمودہ پر آمادہ ہونے کے لیے قوتِ ارادی نہ ہو۔ نیز روزمرہ امور میں ریاضت کے ذریعے ہی سے اخلاقِ حسنہ انسان کی طبیعت اور فطرت سلیمہ میں پیوست ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی معاشرے کی بقا اخلاقی قدروں کے برقرار رکھنے اور عمل پیرا ہونے میں ہے۔

---

(1) Webster's New Collegiate Dictionary,G.&.C. Merriam company, spinafield, Massachusetts,U.S.A,p:392

فصل دوم

اخلاق کی اہمیت واثرات

فصل دوم:

اخلاق کی اہمیت

دینِ اسلام میں اخلاق کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، عقائد وعبادات کے بعد تیسرا درجہ اخلاق کا ہے۔ اخلاق حمیدہ ہی ایسے اوصاف ہیں کہ جن کی بناء پر انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا گیا۔ نہ صرف ظاہری شکل وصورت بلکہ انسان کی باطنی خوبیاں اسے حیوانِ مطلق سے متفرق کر دیتی ہیں۔ اسلام نے اعلیٰ اخلاقی رویوں کو عام کیا، اخلاق کے ذریعے مخلوق کو خالق سے جوڑاور امعاشرے کو امن کا گہوارہ بنایا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اخلاق کی مزید اہمیت و فضیلت درج ذیل نقاط سے ظاہر ہوتی ہے۔

۱) دینِ اسلام کی بنیاد اخلاقِ حسنہ پر ہے:

انسانی زندگی میں روز مرہ معاملات میں اخلاق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے باقی مذاہب کی نسبت اس پر اتنا زور دیا کہ اخلاق کو حالت ایمان کی کسوٹی قرار دیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا))[1]

ترجمہ: مومنین میں کامل درجہ ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

نیز ایک روایت میں ہے:

((إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ))[2]

ترجمہ: مومن اپنے حسنِ خلق کی بناء پر دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر کھڑے ہو کر تہجد پڑھنے والے کے مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے۔

جو انسان اخلاقِ حمیدہ سے متصف ہے اسی کا ایمان مضبوط ہے اور اسی کی عبادات قابلِ قبول ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنے گردونواح کے افراد کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش نہیں آتا تو اس کا ایمان دل کی گہرائیوں تک نہیں اترا اور اس کی عبادت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر ومنزلت نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان، عبادت اور اخلاق میں کس قدر گہرا تعلق ہے۔ جیسا کہ سارے دین کی بنیاد ہی اخلاقِ حسنہ پر ہے۔ ایک اور مقام پر آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

---

(۱) سنن أبي داؤد، سلیمان بن الأشعث السجستانی، أبو داؤد، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، کتاب السنہ، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ، حدیث نمبر: ۴۶۸۲، ۴/ ۳۵۴

(۲) سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب فی حسن الخلق، حدیث نمبر: ۴۷۹۸، ۲ /۶۶۸

((مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلَمَةٌ لِأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لَا يَكُونَ دِينَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ وَإِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ))[1]

ترجمہ: جس بھائی نے کسی دوسرے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اس ظالم بھائی کو چاہیے کہ اسی دنیا میں اس مظلوم بھائی سے اس کو معاف کروالے، ورنہ وہاں (روز قیامت) تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم و دینار نہ ہوں گے۔ اگر اس کے پاس عملِ صالح ہو گا تو بقدر اس کے ظلم کے اس سے لے لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس کے سر ڈال دی جائیں گی۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے اخلاق کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ روزمرہ انسانی معاملات میں اگر ایک دوسرے سے اخلاقی فرائض میں کوتاہی ہو جائے تو معافی اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ہاتھ رکھی گئی ہے، جن کے حق میں کوتاہی ہوئی۔ وگرنہ روز محشر نیک اعمال اس شخص کے حق میں ڈال دیئے جائیں گے جس کی دنیا میں حق تلفی کی گئی اور اگر اعمال حسنہ میزان میں نہ پائے گئے تو دوسرے شخص کے برے اعمال اس کے میزان میں ڈال دیئے جائیں گے۔ چنانچہ روز آخرت میں کامیابی کا دارومدار بھی دنیا میں کیئے گئے نیک و بد اعمال پر منحصر ہے۔ ایمان اور اخلاق دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزم ہیں۔ کامل ایمان والا وہی شخص ہے جو بااخلاق و کردار ہے اور ایسا شخص ہی دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گا۔

۲) پیغمبرِ اسلام ﷺ مجسمہ مکارم اخلاق:

ہر زمانے میں امت کی ہدایت کے لیے نبی مبعوث ہوئے۔ ہر نبی نے اپنی امت کی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیا اور انہیں اخلاقی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ اسی طرح نبی آخر الزمان، خاتم الرسل، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کی۔ آپ ﷺ کے اخلاق کی توصیف قرآن مجید میں اسطرح سے بیان کی گئی:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾[2]

ترجمہ: اور بیشک آپ ﷺ کو اعلیٰ اخلاق پر فائز کیا گیا ہے۔

---

(۱) الجامع الصحیح، البخاری، محمد بن اسماعیل، دار بن کثیر، الیمامہ، بیروت، ۱۹۸۷م، کتاب المظالم، باب من کانت لہ مظلمۃ عند الرجل، حدیث نمبر: ۲۳۱۷، ۲/۸۶۵

(۲) سورۃ القلم: ۶۸/۴

خلق عظیم سے مراد آداب القرآن ہیں۔ وہ تمام اعمال وآداب جنہیں قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے، اللہ سبحانہ تعالی نے ان تمام اخلاق فاضلہ کو بدرجہ کمال آپ ﷺ کی ذات گرامی میں جمع فرمادیا ہے۔ اس بارے میں خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((اِنَّمَا بُعِثتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخلَاقِ))[1]

ترجمہ: میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں۔

آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل دونوں سے اخلاق فاضلہ کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے قرآن کی تعلیمات کو عملی صورت میں پیش کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے نہایت جامع الفاظ میں فرمایا:

((كَانَ خُلُقُهُ القُرآنَ))[2]

ترجمہ: آپ ﷺ کے اخلاق قرآن پاک والے اخلاق ہیں۔

آپ ﷺ میں وہ تمام عظیم الشان اخلاق پائے جاتے تھے، جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ ان تمام قرآنی صفات کا عملی نمونہ ہیں۔ اب قیامت تک تمام انسانوں کے لیئے آپ ﷺ کی سیرت باعث اتباع ہے۔ تمام بنی نوع انسان نے آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین اسلام کی تعلیمات کو عملا اپنی زندگیوں میں ڈھالنا ہے۔

۳) اخلاقِ فاضلہ انفرادی و اجتماعی خیر خواہی کا موثر ذریعہ:

اخلاق فاضلہ میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایسی زبردست خوبیاں پائی جاتی ہیں جو معاشرتی استحکام کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی خیر خواہی، محبت اور اخوت اس درجے کی ہوتی ہے جیسے کسی عمارت کی اینٹیں ایک دوسرے کا سہارا بنی ہوتی ہیں۔ اگر ان اینٹوں سے ایک دوسرے کا بوجھ سہارنے کی کیفیت کو نکال دیا جائے تو ایسی عمارت اپنی ساخت بر قرار نہیں رکھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں باہمی خیر خواہی اور محبت و شفقت کے جذبے سے معاشرہ اس درجے کا قوت و توانائی کا ذخیرہ بن جاتا ہے کہ پھر باہر سے کسی میں بھی مسلمانوں کو شکست دینے کی جرأت پیدا نہیں ہوسکتی۔ البتہ داخلی اختلافات دشمنوں کے لیے ہتھیار بن جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّكُم لَن تَسعُوَا النَّاسَ بِأموَالِكُم وَلٰكِن يَّسعهُم مِنكُم بَسطَ الوَجهِ))[3]

---

(۱) السنن الکبریٰ، أبو بکر البیهقی، احمد بن الحسین بن علی، دار لکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۴ھ، کتاب الشهادات، باب مکارم الأخلاق و معالیها التی من کان متخلق بها، حدیث نمبر: ۲۰۷۸۲، ۱۰/ ۳۲۳

(۲) مسند أحمد بن حنبل، الشیبانی، أبو عبد الله أحمد بن محمد، عالم الکتب ، بیروت، ۱۹۹۸ م، حدیث نمبر: ۲۴۶۰۱، ۶/ ۹۱

(۳) مسند أبی یعلیٰ، أحمد بن علی بن المثنی، دار المأمون للتراث، جدہ، ۱۹۸۹م، حدیث نمبر: ۶۵۵۰، ۱۱/ ۴۲۸

ترجمہ: تم لوگوں کے دلوں کو مال سے نہیں موہ سکتے البتہ اپنی خوش خلقی اور حسنِ معاملگی سے ان کے دلوں کو اپنا بنا سکتے ہو۔

اسلام نے انفرادی واجتماعی زندگی کو مضبوط کرنے کے لیے حسنِ معاملت، فیاضی، بھلائی، سچائی اور رحم دلی کا درس دیا نیز بے شمار حقوق ایک دوسرے پر عائد کیئے۔ اپنے رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کی معاونت اور دادرسی کا حکم دیا۔ ان حقوق کی ادائیگی اور اخلاقی خوبیوں سے برائیوں کو مٹانے والا اور بھلائیوں کو فروغ دینے والا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہیں عدل واحسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی، بے حیائی اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔

تاریخ گواہ ہے کہ اعلیٰ اخلاق وکردار پر مشتمل معاشرہ نے ہی فکری، سیاسی اور معاشرتی انقلاب برپا کیئے۔ نبی اکرم ﷺ نے معاشرے کے افراد میں دعوت وتبلیغ کے ذریعے اخلاقی تربیت کا فریضہ سرانجام دیا۔ ایسی دعوت جو تیزی سے تمام ممالک میں پھیل گئی اور ان خداپرستانہ اخلاق سے ہر میدان میں فتح نصیب ہوئی۔ چنانچہ آج بھی معاشرتی اصلاح کے لیے حسنِ سلوک کی تعلیم وتربیت بہت ضروری ہے۔ دنیا میں امن وسکون کا قیام تب ہی ممکن ہے جبکہ اخلاقیات کی ترویج کی جائے۔

۴) اخلاق انسانی تعلقات کو مربوط کرنے کا ذریعہ:

انسان جتنا بھی عالم وفاضل اور مال ودولت والا ہو اگر وہ مکارمِ اخلاق سے محروم ہے تو وہ کمالِ انسانی کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی مخلوق خدا میں مقام وعزت پاسکتا ہے۔ اخلاقِ حسنہ ایسے اوصاف ہیں جو کڑے سے کڑے دشمن کو بھی مخلص دوست بنا دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے درمیان باہمی محبت کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح انسانی تعلقات اور زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور معاشرہ امن کا گہوارہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو ہمیشہ یہ وعظ ونصیحت کیا کہ مخالفین پر غلبہ پانا ہے تو عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ قربت پیدا کرنے والی چیز اخلاقِ حسنہ ہے، نماز روزہ کی تاثیر اس وقت ممکن ہوتی ہے جب مخالف آپ کے قریب آجائے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۲)

---

(۱) سورۃ النحل: ۱۶/ ۹۰

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۵۹

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ﷺ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ ﷺ ترش زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ ﷺ کے پاس سے چھٹ جاتے۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ)) (۱)

ترجمہ: جس شے میں نرمی ہو وہ آراستہ ہو جاتی ہے اور جس شے سے نرمی نکال دی جائے وہ عیب دار ہو جاتی ہے۔

لہذا اسلام فرائض خداوندی کے اکرام و ادائیگی کے ساتھ ساتھ، اللہ کی مخلوق سے شفقت و محبت کا نام ہے۔ نیز جو اللہ کی مخلوق کے لیئے رحم و شفقت کے جذبات رکھے گا اللہ کی ذات اس پر رحم فرمائے گی۔ اس طرح باہمی روابط اور خیر خواہی کے گہرے جذبے سے سرشار معاشرہ تشکیل پائے گا۔ معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا خیال رکھیں گے اور اپنے ذاتی مفاد پر دوسروں کے مفادات کو ترجیح دیں گے اور معاشرہ امن کا گہوارہ بنے گا۔

۵) اخلاقِ حسنہ سے محبتِ الٰہی کا حصول:

مسلمانوں کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں، چاہے اس کا تعلق عبادات سے ہو، یا معیشت سے، معاشرت سے یا سیاست سے، آپ ﷺ کے تمام اقوال و افعال کی اتباع کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو خدا سے ملاقات کا امیدوار ہو، کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتا ہو اور عذابِ آخرت سے ڈرتا ہو۔ اسے اس بات کی فکر ہو کہ قیامت آنے والی ہے، جہاں اس کے ساتھ خیر و بھلائی کا تمام تر انحصار اس بات پر ہو گا کہ دنیاوی زندگی میں اس کے اعمال رسول اللہ ﷺ سے کس قدر قریب تر رہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿مَن كَانَ يَرجُو لِقَاءَ اللهِ فَإِنَّ اَجَلَ اللهِ لَآتٍ﴾ (۲)

ترجمہ: جو کوئی توقع رکھتا ہے اللہ کی ملاقات کی سو اللہ کا وعدہ آرہا ہے، اور وہ ہے سننے والا جاننے والا

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کو اپنانے اور اور ہر شعبۂ زندگی میں ان کی اطاعت کرنے میں ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رضا مندی ہے اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے سے روگردانی کرے گا وہ کبھی اللہ کی محبت کو حاصل نہیں کر پائے گا۔ قولہ تعالیٰ:

---

(۱) صحیح مسلم، أبو الحسین مسلم بن حجاج النیسابوری، دار الجیل، بیروت، ۱۳۳۴ھ، کتاب الآداب، باب بر الوالدین، حدیث نمبر: ۶۶۹۴، ۲۲/۸

(۲) سورۃ العنکبوت: ۵/۲۹

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾ (۱)

ترجمہ: جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسی نے اللہ کی فرمانبرداری کی اور جو منہ پھیرے تو نہیں ہم نے بھیجا آپ کو ان پر نگہبان بنا کر۔

نبی کریم ﷺ وہی کرتے جس کا اللہ کی طرف سے حکم دیا جاتا۔ آپ ﷺ اپنی طرف سے کچھ بھی نہ کرتے تھے۔ ثواب کا حق دار اور محبت الٰہی کا حصول صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت میں ہی محبتِ الٰہی ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾ (۲)

ترجمہ: بیشک اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور یہ منہ پھیر لیں تو اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔

چنانچہ اطاعتِ رسول ﷺ اللہ تعالیٰ سے محبت کی نشانی ہے مگر آج کل کے دور میں لوگوں کے نزدیک اطاعت رسول ﷺ کی اہمیت نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ مسلمان یومِ آخرت اور ذکرِ الٰہی سے غافل ہو چکے ہیں۔ جبکہ دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کا انحصار اسی بات پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا کے حصول کو ممکن بنایا جائے۔

اسلام علم و عمل کو باہم اس طرح مربوط کیئے ہوئے ہے کہ بغیر عمل کے محض صاحب ایمان ہونا اللہ کے ہاں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ حسن اخلاق و اعمال کے بغیر انسان مخلوق خدا میں عزت و مقام نہیں پا سکتا اور نہ ہی کمال انسانی کو پہنچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی اجتماعی و انفرادی اخلاقی تربیت کے لیئے آپ ﷺ کو مکارم اخلاق کا پیکر بنا کر مبعوث کیا گیا اور اتباع رسول ﷺ کو تمام مسلمانوں کے لیئے لازم قرار دیا گیا۔ اسی سے رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہے اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا دارومدار بھی اطاعت رسول ﷺ پر منحصر ہے۔

---

(۱) سورۃ النساء: ۴/ ۸۰

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۳۲

اخلاقی اقدار کے اثرات

انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے اخلاقی اقدار کا بہت گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی نظام میں اگر اخلاقی قدروں کو فروغ دیا جائے اور تربیتی عوامل کو اختیار کیا جائے تو بہت سے مثبت نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس باب میں اخلاق واقدار کے معاشی، معاشرتی، سیاسی وروحانی اثرات کا تفصیلا جائزہ لیا جائے گا۔

معاشرتی اثرات:

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے۔ اس کی معاشرتی زندگی اسلامی تعلیمات اور اخلاق واقدار کے تابع ہونی چاہیئے۔ ان اخلاقی تعلیمات کے مطابق معاشرے میں صدق وعمل، عدل وانصاف، حیاء وپاکیزگی، عفوودرگزر، ایک دوسرے کے ساتھ باہم تعاون اور صلہ رحمی کی فضاپیدا ہونی چاہیئے۔ جبکہ عصر حاضر میں دیکھا جائے تو معاشرے میں اخلاقی قدروں کو پامال کیا جارہا ہے۔ ظلم وبربریت کی شکار عوام چیختی چلاتی رہتی ہے مگر کسی کو سنائی نہیں دیتا۔ انسانیت کا قتل عام کیا جاتا ہے اور ظالم کو پکڑنے والا کوئی نہیں۔ ڈاکہ زنی، رشوت اور چوری کا بازار گرم ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتی جاتی ہے۔ جھوٹ، حسد، تعصب، بغض اور کینہ جیسے اخلاق رذیلہ افراد معاشرہ کو جکڑے ہوئے ہیں۔ انہیں صفات رذیلہ کی وجہ سے آج معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اگر اخلاق فاضلہ کی تعلیم وتربیت سے افراد معاشرہ کو آراستہ کیا جائے تو معاشرہ ان کے نتائج وثمرات سے امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ معاشرتی لحاظ سے چند اخلاقی قدروں اور ان کے اثرات کا درج ذیل ذکر کیا جاتا ہے۔

۱) معاشرے کو زندہ رکھنے کے لیئے اجتماعی عدل روح کا کردار ادا کرتا ہے۔ جس قوم ومعاشرہ میں عدل وانصاف کا خون کیا جاتا ہے اس کا مقدر تباہی وبربادی ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں عدل وانصاف پر بہت زور دیا گیا۔ قولہ تعالی:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[1]

ترجمہ: یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔

وقولہ تعالی: ﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ﴾[2]

ترجمہ: تو کہہ دے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا۔

---

(۱) سورۃ الحدید: ۵۷/ ۲۵

(۲) سورۃ الأعراف: ۷/ ۲۹

نبی اکرم ﷺ معاشرے میں اجتماعی عدل سے متعلق بہت فکر مند رہتے تھے۔ دشمن بھی آپ ﷺ کی اس صفت کا اعتراف کرتے تھے اور اپنے مقدمات کو آپ ﷺ کے پاس فیصلے کے لیئے لاتے تھے۔ ایک مرتبہ مکہ کی فاطمہ نامی عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ اس کی سفارش کے لیئے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ تشریف لائے جن سے آپ ﷺ نہایت محبت کرتے تھے۔ اس پر آپ ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا:

((وَاللَّهِ لَوْ كَانَتْ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا فَقُطِعَتْ))(۱)

ترجمہ: اللہ کی قسم اگر میری بیٹی فاطنہ بھی ایسا کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا جیسے اس کے کاٹے جائیں گے۔

آپ ﷺ کے اسی عدل وانصاف سے دشمن اس قدر متاثر ہوئے کہ دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عدل وانصاف ہی سے معاشرتی زندگی کی بقا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی حق تلفی نہ کریں، امانتوں میں خیانت نہ کریں اور ناپ تول میں کمی نہ کریں تو ہی معاشرہ امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

۲) انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد معاشرے میں سچائی وراست بازی کی ترویج واشاعت تھا۔ جس معاشرے میں صدق کا دور دورہ ہو اور جھوٹ کی آمیزش کو ختم کیا جائے۔ اس سے بہت ساری اخلاقی وروحانی بیماریوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی توصیف میں اللہ تبارک وتعالی نے صدق کا ذکر اس طرح کیا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾(۲)

ترجمہ: اور ذکر کر کتاب میں ابراھیم کا، بے شک وہ سچا نبی تھا۔

ہر نبی ورسل کے لیئے صدیق ہونا وصف لازم ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام اپنے قول وفعل میں بہت زیادہ راست باز تھے۔ یہاں تک کہ آپ رضی اللہ عنہ نے دین اسلام سچے اور برحق دین کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے باپ کی مخالفت کی اور انہیں منع کیا کہ وہ بت پرستی کرتے ہوئے شیطان کا ساتھ نہ دے مگر وہ باز نہ آیا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں سے جو خدا کو چھوڑ کر کسی اور کی پرستش کرتے ہیں کنارہ کشی اختیار کی اور سچائی پر قائم رہے۔ ان کی قربانیوں اور حق پر ڈٹے رہنے سے ہی آج اسلام پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اللہ تعالی نے صدق کو انبیاء کرام رضی اللہ عنہم کی صفت قرار دے کر اس کی اہمیت وفضیلت کو واضح کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) السنن الکبری، رقم الحدیث: ۷۳۳۷، ۷/ ۱۳

(۲) سورۃ مریم: ۱۹/ ۴۱

((إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ صِدِّيقًا وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ كَذَّابًا))[1]

ترجمہ: بلاشبہ سچ آدمی کو نیکی کی طرف بلاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ صدیق کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور بلاشبہ جھوٹ آدمی کو برائی کی طرف بلاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالی کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

سچائی انسان کے لیئے بھلائی اور نیکی کی راہیں ہموار کرتی ہے جبکہ جھوٹ برائی اور ہلاکت کی طرف لے کے جاتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے جھوٹ انسان کے ضمیر کو شک میں مبتلا کرتا ہے اور بے چین کیئے رکھتا ہے اور سچ انسان کو روحانی طور پر اطمینان دیتا ہے۔ سچائی کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں زبان، دل اور عمل کی صداقت بھی شامل ہے۔

انسان کے دل اور عمل کا صاف گو اور سچا ہونا ضروری ہے۔ دل میں کسی قسم کا نفاق اور فریب نہیں ہونا چاہیئے اور زبان سے کہی ہوئی بات کا عمل سے اظہار بھی ہونا چاہیئے۔ قول و فعل میں تضاد نہ ہو بلکہ یکسانیت پائی جائے لیکن اگر عصر حاضر کی معاشرتی صورت حال کو دیکھا جائے تو ہر طرف تضاد نظر آتا ہے۔ انسان کے دو روپ ہیں ظاہر اور باطن میں فرق ہے۔ حکومتی سطح پر بھی دیکھا جائے سیاست دان عوام الناس کو مطمئن کرنے کے لیئے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں جبکہ عملا اس کا کوئی نفاذ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح علماء کی اکثریت کے بیانات اور عملی زندگی میں بہت تضاد نظر آتا ہے۔ سچائی وراست بازی جیسی اعلی قدر زندگی کے کسی شعبے میں بھی بہت کم نظر آتی ہے، ہر طرف جھوٹ کی ملاوٹ ہے۔ جبکہ جھوٹ کا شمار کبیرہ گناہوں میں کیا جاتا ہے اور جھوٹ بولنے والے افراد بے وقعت، بے وقار اور بے اعتبار ہو جاتے ہیں۔ جب ایک دوسرے پر اعتبار ہی ختم ہو جائے تو معاشرے پر بہت منفی اثرات پڑتے ہیں۔ رواداری، باہمی محبت اور اتحاد واتفاق کی دولت معاشرے سے چھن جاتی ہے۔ خود غرضی و نفرت کی فضا قوم کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے۔

۳) حیاء ایمان کا ایک جز ہے، بغیر حیاء کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جس میں حیاء و پاکیزگی زیادہ ہو گی اسی کا ایمان زیادہ کامل اور مضبوط ہو گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ))[2]

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والآداب، بَاب قُبْحِ الْكَذِبِ وَحُسْنِ الصِّدْقِ وَفَضْلِهِ رقم الحدیث: ۴۷۱۹، ۱۳/ ۱۴

(۲) الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب الحیاء فی الایمان، رقم الحدیث: ۲۴، ۲/ ۱۷

ترجمہ: جانے دے کیونکہ حیاء ایمان میں سے ہے۔

شرم وحیاء ایمان کی شاخوں میں سے ہے، جس کا ایمان قوی اس کی حیاء بھی قوی۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جس سے انسان بھلائی کا ہر کام سرانجام دیتا اور برائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو شخص جتنا اس سے عاری ہو گا اسی قدر وہ نیک اعمال کی بجا آوری میں پیچھے رہ جائے گا اور پھر وہ برے اعمال سے باز بھی نہیں رہ سکے گا۔ اسی لیئے اسلام حیاء وپاکیزگی کے دامن کو مضبوطی سے تھامنے کے لیئے مرد اور عورت دونوں کو پردے کا حکم دیتا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾[1]

ترجمہ: اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔

اس آیت میں حیاء اور پاکباز عورتوں کے لیئے حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ گھر سے باہر نکلیں تو اپنے چہرے، بدن اور سروں کو بڑی چادروں سے ڈھانپ لیں اس سے ان کی عفت اور پاک دامنی کا اظہار ہو گا اور ان کی اس وضع سے شریر لوگ ان کو میلی نظر سے نہ دیکھیں گے۔[2] پردہ انسان کو طہارت وپاکیزگی اور اللہ کی قائم کردہ حدود کا پابند بنانے کا اہم عملی قدم ہے۔ یہ انسان کو پاکباز بناتا اور بدکرداری جیسے برے اعمال سے بچاتا ہے۔ جنسی بے راہ روی، زنا اور بدکاری جیسی غلاظتوں سے پاک رکھتی ہے۔۔ نفسانی شہوت کی حفاظت اور خواہشات پر قابو پاکر ہی انسان شرم وحیاء کے دائرے میں رہ سکتا ہے۔ اسی سے ہی انسان کو اطمینان قلب اور امن وسکون حاصل ہوتا ہے جبکہ دوسری جانب بے حیائی اور عریانی انسان کو بہت سی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی بیماریوں میں مبتلا کرتی ہے۔ موجودہ معاشرتی زندگی کو دیکھا جائے تو شرم وحیاء کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ نظام ابلاغیات اسلامی تعلیمات کے برعکس بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے۔ بے پردگی عام ہو چکی ہے۔ افراد معاشرہ افراتفری، عدم تحفظ اور بد امنی کا شکار ہیں۔ بدکرداری، فحاشی اور عریانی جیسے اعمال معاشرے کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تباہ کر دیتے ہیں۔ بدکاری کی بناء پر ایڈز کا مرض اپنی جڑیں مضبوط کیئے جارہا ہے۔ ضرورت اس مر کی ہے کہ نظام تعلیم کے ذریعے معاشرے میں خالصتا اسلامی طرز کی تہذیب وتمدن کو قائم کیا جائے تاک بے حیائی سے پرہیز کیا جائے اور شرم وحیاء کو معاشرے میں فکری وعملی لحاظ سے ڈھالا جائے۔

---

(۱) سورۃ الأحزاب: ۳۳/۵۹

(۲) روح البیان، ابو الفداء، اسماعیل حقی بن مصطفی، دار الفکر، بیروت، ۷/ ۲۴۰

معاشی اثرات:

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے۔اس کا نظام تعلیم اعلی ترین اسلامی واخلاقی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے۔ اسلامی نظام تعلیم نے علم کو ایک وحدت قرار دیا جو تمام تر نسلی، گروہی اور لسانی تعصبات سے پاک ہے اور اس میں دینی ودنیاوی علوم کی کوئی حد بندی نہیں بلکہ یہ دنیا بھر کے علوم کے دروازے مسلمانوں پر کھولتا ہے۔ یہ ایسا نظام تعلیم ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور ایسے اخلاق وآداب سکھاتا ہے جس میں دنیاوی واخروی بھلائی پائی جاتی ہے۔اس میں انسان کی دینی بلکہ دنیاوی لحاظ سے بھی ہر مسئلے کا جامع حل موجود ہے۔اسلام دین اور دنیا میں تفریق نہیں کرتا بلکہ دونوں کو یکجا کرنے میں ہی انسان کی کامل ترقی سمجھی جاتی ہے۔وہ انسان کی معاشی ومادی ضروریات کا بھی بہترین اور پاکیزہ ترین اہتمام کرتا ہے۔ ذیل میں نظام تعلیم میں اخلاقی قدروں (عدل وانصاف، اخوت، مساوات، آزادی پیشہ گری، کسب معاش اور مالی معاونت وغیرہ) کی عملیت کے اثرات کو معاشی نقطہ نظر کے حوالے سے زیر بحث لایا جاتا ہے۔

اسلام ہی ایک منفرد دین ہے جو معاش کو باقاعدہ ایک مقام دیتا ہے اور معاشی لحاظ سے ایسے اخلاق وضوابط وضع کرتا ہے جس سے معاشی توازن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بنیادی مادی وجسمانی ضروریات کو بھی پورا کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے انسان فطرتاً حریص اور بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾[1]

ترجمہ: مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لئے مزین کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان دار گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ دنیاوی چیزوں سونا، چاندی، کھیتی، مویشی وغیرہ کی طلب، جستجو اور چاہت انسان میں فطری طور پر ڈال دی گئی ہے۔انہیں آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیئے انسان دولت کا دلدادہ بنا رہتا ہے۔اسلام نے اس سرگردانی کو جائز قرار دیا ہے۔ اللہ نے آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسے انسان کے لیئے مسخر کر دیا تاکہ وہ ان سے اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کر سکے۔اسلام رہبانیت کا قائل نہیں بلکہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ اسی کے لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ مگر

---

(۱) سورۃ آل عمران:۳/۱۴

اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ دنیاداری میں اس قدر مبتلا نہیں ہونا کہ انسان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عبادت گزاری سے غافل ہو جائے اور اس کے احکامات وحدود کو فراموش کر دے۔

معاشی معاملات کو بخوبی انجام دینے کے لیئے تقسیم دولت اور حلال وحرام کے اصول وضوابط وضع کیئے گئے تا کہ انسان اعتدال کی حد سے بڑھنے نہ پائے۔ قرآن میں جہاں حلال ذرائع کو اپنانے کا حکم دیا گیا وہاں حرام کو ترک کرنے کی تلقین بھی کی گئی۔ انسان جب رزق کمانے کے حرام ذرائع کو اپناتا ہے جیسا کہ حرام چیزوں کا کاروبار کرنا، رشوت، بدکاری اور دھوکہ دہی کے ذریعے دولت حاصل کرنا وغیرہ تو معاشرے میں عدل وانصاف باقی نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ کسی کا حق چھین کر یا مار کر اپنا فائدہ حاصل کرنا یہ انصاف نہیں۔

عدل کو انسانی معاملات زندگی میں ایک اخلاقی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ کوئی بھی انسانی معاملہ عدل کے تقاضوں کو پورا کیئے بغیر درست طور پر انجام نہیں پاسکتا ہے اور معاملات زندگی میں بگاڑ معاشرتی بگاڑ کا سبب ہے۔ اگر عدل وانصاف اور حلال وحرام کی صحیح تعلیمات کی نصاب تعلیم کے ذریعے عوام الناس کو وضاحت کی جائے ت معاشرتی بگاڑ کو روکا جاسکتا ہے اور معاشرہ حرام طرق، بدیانتی اور دھوکہ دہی سے بچ سکے گا۔ اس طرح معاشرے میں عفوودرگزر، پاکیزگی، نیکی وبدی اور شرم وحیاء جیسی اقدار کا رواج ہو گا۔

معاشرے میں اعلی وادنی کی تفریق کو اسلام نے ختم کیا بلکہ سب کو مساوی حیثیت دی۔ مساوات اور برابری کا درس دیا۔ امیر ہو یا غریب ایک دوسرے کے ساتھ پیار ومحبت اور مالی معاونت کرنے کے اخلاقیات سکھائے تا کہ تقسیم دولت کے ذریعے معاشرے کا غریب وناچار طبقہ بھی اپنی ضروریات کو پورا کر سکے اور اچھی زندگی گزار سکے۔ دولت چند ہاتھوں میں محصور ہونے کی بجائے تمام لوگوں تک اس کی رسائی ممکن ہو۔ انسان بخل اور اسراف وتبذیر سے اجتناب کرے تا کہ اس کے اندر تقوی پرہیزگاری اور پاکبازی جیسی اوصاف پیدا ہوں۔ قولہ تعالی:

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾[1]

ترجمہ: اور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو

اس آیت میں اللہ کے دیئے ہوئے مال کو بے موقع اڑانے اور فضول خرچی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے وافر مقدار میں دولت دی ہے تو اسے چاہیئے کہ نہ وہ بہت بخل سے کام لے کہ کسی جائز اور مستحق پر بھی خرچ نہ کرے اور نہ ہی اپنی عیش وعشرت کے سامان اور لغویات پر بے جا اڑائے۔ مال بھی انسان کے لیئے آزمائش ہے، انسان کو صبر واستقامت سے کام لیتے ہوئے اعتدال کے ذریعے خرچ کرنا چاہیئے۔ یہی وہ اخلاقی قدر ہے جس کے معاشی اثرات یہ ہیں کہ

---

(۱) سورۃ الإسراء: ۲۶/۱۷

مال میں ڈوبا ہوا شخص اپنے نفس پر قابو پاتے ہوئے صبر سے کام لیتا ہے اور خرافات اور فسق وفجور سے بچ جاتا ہے۔لہذا صبر کا معاشی زندگی پر خاص تاثر ہے۔یہ انسان کو تکبر اور تعیش پسند زندگی سے بچاتا اور میانہ روی کے راستے پر لے کر چلتا ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو بین الاقوامیت کا سب سے بڑا علمبر دار ہے۔اسلام میں رنگ و نسل کا امتیاز نہیں بلکہ یہ انسانیت کو اخوت و بھائی چارے جیسی اخلاقی قدروں کا درس دیتا ہے۔قولہ تعالی:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾[1]

ترجمہ:تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں دین اسلام میں داخل ہونے والے صرف اہل عرب یا حجازی ہی نہیں تھے بلکہ ایرانی، حبشی اور مصری وغیرہ مل کر شیر وشکر ہوگئے اور اسلام بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسلام نے عالمگیر انسانی برادری قائم کی جو آج اتنے سالوں بعد بھی کوئی اور مذہب نہ قائم کر سکا۔آج رنگ و نسل کے امتیاز نے جدید معاشی دنیا کی ضروریات کی تکمیل میں رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں۔خوف وہراس اور بے روزگاری کا دور دورہ ہے۔معاشی تعمیر جدید میں بھائی چارے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔بردرانہ الفت کے ذریعے قوموں کے مابین خلیج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ معیشت کے لیئے راستے کھلیں اور معاشرہ کو بچایا جاسکے۔

کسب معاش کے حصول میں سب انسانوں کو برابر حقوق دیئے گئے ہیں۔ہر ایک کو مکمل آزادی دی گئی کہ وہ بلا تکلف پیشہ اختیار کرے۔اپنے ہاتھ سے کسب کر کے کھانے والوں کو عزت بخشی گئی۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الكاسب على عياله كالمجاهد في سبيل الله))[2]

ترجمہ:اپنے اہل وعیال کی خاطر رزق کمانے والے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔

اسلام نے آزادی پیشہ گری کا علم اٹھایا اور پیشہ گروں کا رتبہ بڑھا کر انہیں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ترغیب دی۔ہر انسان وہی پائے گا جس کی وہ کوشش کرے گا یعنی معاشی زندگی میں اس کا حصہ اور نصیب اس کی محنت وجاں فشانی پر ہی مبنی ہے۔معاشی سہولتوں کے حصول کے لیئے قرآن میں متعدد طرق کا ذکر کیا گیا مثلا باغبانی، زراعت، تجارت، شکار، مزدوری، سنگ تراشی اور صنعت وحرفت وغیرہ۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی امور سے قریب تر رہنے کا حکم دیتا ہے۔

---

(۱) سورۃ الحجرات:۴۹/۱۰

(۲) سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابن ماجہ، دار احیاء الکتب العربیہ، کتاب الزھد، باب فضل الفقراء، رقم الحدیث:۴۱۲۱، ۲/۱۳۸۰

فکری اور روحانی اثرات:

دین اسلام کی مستقل اخلاقی اقدار افراد معاشرہ کی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں اور تربیت کے لیئے تعلیم کا ساتھ لازم وملزم ہے۔ تعلیم میں ان اخلاقی قدروں کو کو کماحقہ سمو دینے سے طلباء کی اخلاقی وروحانی تربیت کی جاسکتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے انسان کی سوچ وفکر کو جلابخشی جاتی ہے اور یہی سوچ انسان کو اخلاقی تربیت کے عملی سانچے میں ڈھالتی ہے۔ اگر محض علم بہم پہنچادیا جائے مگر تربیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو تعلیم پر کتنا ہی خرچ کیوں نہ کیا جائے ایک مطلوب دینی واخلاقی اقدار سے متصف شخصیت کی تعمیر نہیں کی جاسکتی ہے۔

آج معاشرہ بے انتہا اخلاقی وروحانی بیماریوں کا شکار ہے۔اس لیے کہ علم کو تو انسان تک منتقل کیا جارہا ہے مگر فکری وروحانی تربیت کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان بے شمار خرافات اور بد اخلاقیوں میں مبتلا ہے۔ جیسا کہ ہر انسان چاہے وہ دنیا کہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو یہ جانتا ہے کہ رشوت اور سود مال حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي))[1]

ترجمہ: اللہ کے رسول ﷺ نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت کی۔

کسی عہدیدار یا صاحب اقتدار کو مال دے کر کام نکلوانا یا کسی شخص کو دوسرے کے ساتھ زیادتی یا ظلم کرنے کے لیئے مال دینا سب حرام ہے ایسے کرنے والے پر جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے لعنت کیئے جانے کی نص واضح طور موجود ہے تو پھر ایسے کام میں بھلائی کا عنصر کیسے پایا جاسکتا ہے۔اسی طرح سود کی بھی سختی سے ممانعت کی گئی۔ قولہ تعالی:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِنْدَ اللَّهِ﴾[2]

ترجمہ: اور جو تم دیتے ہو سود (پر قرض) تاکہ وہ بڑھتا رہے لوگوں کے مالوں میں تو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے ہاں ۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ سود پر قرض دینے سے اس کا مال بڑھتا رہے گا تو یہ اس کی غلط فہمی ہے کیوں کہ سود کا لین دین بہت بڑا ظلم ہے۔ ایسا کرنے سے مال کبھی بڑھتا نہیں بلکہ گھٹتا ہی ہے۔ سود کا لین دین کرنے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ کرتا ہے۔ یہ ایسی برائیاں ہے جس سے انسان بیشتر روحانی، اخلاقی اور فکری بیماریوں مین مبتلا ہوتا ہے۔ انسان کا دل سخت ہوتا ہے۔ خود غرضی، تنگ دلی اور بخل جیسے اخلاق رذیلہ انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو انسان کو تنزلی کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ رشوت ہو یا سود، انسان جب ناجائز ذرائع سے حرام مال حاصل کرتا ہے تو اس کی خوراک حرام کمائی کی، پہننا اوڑھنا اور رہنا

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأقضیہ، باب فی کراھیۃ الرشوہ، رقم الحدیث: ۳۵۸۰، ۳/ ۳۰۰

(۲) سورۃ الروم: ۳۰/ ۳۹

سہناسب حرام مال کا ہو گا تو کیسے ممکن ہے کہ وہ روحانی واخلاقی پاکیزگی حاصل کرے۔ اس کی سوچ کا دائرہ منفی ہو گا اور وہ حرام مال کو حرام جگہ ہی خرچ کرے گا جیسا کہ شراب نوشی ،جوا اور زناکاری وغیرہ اس طرح وہ خود اپنی ذات ،اہل وعیال اور معاشرے کے لیئے فساد کا موجب بنے گا۔ اس طرح سے فسق وفجو کا زور معاشرے میں زیادہ ہو گا، جھوٹ، منافقت اور ظلم وستم کا بازار گرم ہو گا۔ ایسے معاشروں کا مقدر فکری، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے تباہ وبربادی ہوتا ہے۔

یہاں ان تمام اخلاقی وروحانی بیماریوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو آج معاشرے میں اسلامی واخلاقی اقدار کو انداز کرنے کی وجہ سے عام ہیں۔ ان روحانی بیماریوں سے بچنے کے لیئے ضروری ہے کہ اخلاقی قدروں صدق وکذب، نیکی وبدی اور عدل وظلم وغیرہ کو تعلیم کے ذریعے عملی تربیت کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے معاشرے میں فکری وعملی لحاظ سے مثبت نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوششوں سے زیادہ Quality of education کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے اور بہترین تعلیمی معیار اسلامی واخلاقی اقدار کو نصاب تعلیم میں باقاعدہ جگہ دینے سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ نظام تعلیم میں ان اقدار کی عملیت سے ہی اخلاقی وروحانی تربیت ممکن ہے۔ جن کے اثرات سے ہماری فکری اصلاح ہو سکتی ہے اور ہمارے اخلاق سنور سکتے ہیں۔ جیسا کہ اگر انسان کو تعلیم کے ذریعے حلال وحرام کی تمیز سکھادی جائے تو انسان خود بخود حلال اور پاکیزہ رزق کے حصول کے لیئے تگ ودو کرے گا اور حرام طریقوں سے پرہیز کرے گا۔ حکم خداوندی کی فرمانبرداری اور پاکیزہ رزق کی برکات سے انسان خود بخود حیاء، صدق، پاکبازی اور نیکی کی عادات کو اپناتا چلا جاتا ہے جو اسے مومن کے درجے تک لے جاتی ہیں۔ اس طرح سے اس کی فکری واخلاقی تربیت ہوتی ہے اور ایک صالح فرد کی حیثیت سے معاشرے کی اصلاح میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ نظام تعلیم کے ذریعے جب افراد معاشرہ کے اذہان میں اسلامی واخلاقی اقدار (حلال وحرام، نیکی وبدی، عدل وانصاف اور حیاء وپاکبازی وغیرہ) کو سمو دیا جائے گا تو فکری وذہنی انقلاب رونما ہو گا۔ انسان اخلاق حسنہ کو اپنانے کی تگ ودو کرے گا اور اخلاق رذیلہ سے اجتناب کرے گا اور ایک صالح معاشرے کا انعقاد ہو گا۔

سیاسی اثرات:

اسلام ایک عالمگیر شریعت ہے۔ اس کا مقصد ہر دور کے انسانوں کی اصلاح وفلاح ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کی ہدایت کے لیئے صراط مستقیم کی شمع روشن ہوتی رہی ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان تکرار سے لے کر بین الاقوامی سطح تک اور محراب ومنبر سے لے کر اقتدار وحکومت تک اسلام مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی سیاسی نظام کی عمارت ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے، اس میں امور سیاسیات کو باحسن وخوبی چلانے کے لیئے انسان کو اعلی اخلاقی قدروں کا پابند کیا جاتا ہے۔ اسلامی سیاسی

نظام کے اساسی اصولوں کو دیکھا جائے تو سب سے پہلا قدم اقتدار اعلی کا تصور ہے۔اس کے تحت اقتدار اعلی کا مالک صرف ذات الٰہی ہے۔ قولہ تعالی:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾[1]

ترجمہ: حکم کسی کا نہیں سوا اللہ کہ۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات ہی حاکم مطلق ہے۔ انسان دنیا میں اللہ کا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ جس کے ذمے اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کی پیروی کرنا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اللہ کے بتائی ہوئی تعلیمات کی تفسیر کی۔ آپ ﷺ نے کبھی کوئی فیصلہ اللہ رب العزت کی رضا کے برعکس نہیں کیا۔ اسلامی سیاسی نظام میں قرآن پاک کے بعد قانون وہدایت کا دوسرا بڑا سرچشمہ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔ قولہ تعالی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾[2]

ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اصحاب اقتدار کی (جو) تم میں سے ہوں۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا واضح حکم دیا گیا ہے اور اسکے ساتھ ہی سربراہ ریاست کی پیروی کو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ امور ریاست چلانے کے لیئے ریاست کے حکمران کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے بشرطیکہ یہ کہ وہ ریاست کے معاملات قرآن وسنت کے تابع چلائے اور اگر وہ قرآن وسنت کی مخالفت کرے تو اس کی پیروی سے انکار کر دیا جائے۔

اسلام ایک ایسی معاشرتی تنظیم کا علمبردار ہے، جس کے اساسی اوصاف واقدار میں مجلس شوری، حاکم اور محکوم کے حقوق وفرائض کی بجاآوری، معاہدات کی پابندی، عدل وانصاف کا قیام اور شخصی آزادی وغیرہ شامل ہیں۔ عدل وانصاف کے قیام سے ہی معاشرے میں تناسب وتوازن پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص کے حقوق چاہے وہ معاشرتی ہوں یا معاشی، سیاسی ہوں یا اقتصادی ادا کیئے جائیں گے۔ پھر احسان کا معاملہ کہ اپنا حق چھوڑ کر دوسرے کا حق پہلے دینا، ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں رواداری، کشادہ دلی اور فیاضی سے کام لینا۔ انہیں اعلی قدروں سے معاشرے میں شیرینی، خوشگواری اور ایثار وقربانی جیسی صفات پیدا ہوں گی۔

---

(۱) سورۃ الأنعام:۶/۵۷

(۲) سورۃ النساء:۴/۵۹

اسلامی ریاست کے امور کو بہتر اسلامی واخلاقی نہج پر چلانے کے لیئے ضروری ہے کہ حکمران طبقہ اسلامی تعلیمات سے متعلقہ علوم پر وسیع تر دسترس رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ علم سیاسیات پر بھی مکمل عبور حاصل ہو۔

"کاروبار حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لیئے سیاست کا علم سیکھنا ضروری ہے اور وہ لوگ جو لوگوں کا نمائندہ بننا چاہیں یا بادشاہ، صدر، وزیر اعظم اعلی حکومتی عہدیدار یا سفارت کار بننا چاہیں ان کے لیئے سیاست کی تعلیم حاصل کرنا لازمی شرط ہونی چاہیئے۔ جس کے بغیر حکومتی فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دینا انتہائی دشوار ہے"[1]۔

حکومتی فرائض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے لیئے سیاست کا علم حاصل کرنا لازمی شرط ہے۔ ایسی تعلیم جو امور سلطنت کو اسلام کے سیاسی اصول وضوابط کے مطابق چلانے کے طریقے سکھائے۔ آج اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اسلام کے نفاذ کی کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہیں ہو رہی۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ تعلیمی نظام کی تنظیم نو کی جائے اور سیاسی امور میں حصہ لینے والے افراد کی اسلامی اصول واقدار کے تابع تربیت کی جائے۔ ملک میں قوانین بنانے والے سیاسی اداروں میں سینٹ اور قومی وصوبائی اسمبلیاں شامل ہیں اور یہی ادارے ملک کے صدر اور وزیر اعلی کا انتخاب کرتے ہیں۔ قومی اسمبلی ریاست کے وزیر اعظم کا انتخاب کرتی ہے اور پھر صوبائی سطح پر صوبائی اسمبلیاں اپنے اپنے صوبوں میں وزیر اعلی کا انتخاب کرتی ہیں۔ سینٹ اور قومی اسمبلی قوانین بناتی ہیں اور بل کی منظوری کے لیئے صدر سے دستخط لیئے جاتے ہیں اور پھر وہ بل قانوں کی شکل لے کر پورے ملک میں نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر سیاسی لحاظ سے اتنے بڑے فرائض انجام دینے والے افراد اسلامی واخلاقی اقدار سے عاری ہوں تو ملک کا ملک کا کیا المیہ ہو گا۔ اس کے برعکس اگر سیاسی حکمران اسلامی واخلاقی تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوں گے تو معاشرے میں اس کے درج ذیل اثرات رونما ہوں گے۔

۱) سربراہان مملکت جو امور ریاست چلانے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ وطن عزیز سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی سطح پر اپنے ہی ملک میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ اسلامی نظام تعلیم کے تحت پروان چڑھیں گے اور اخلاقی تربیت سے بہرہ ور ہوں گے تو صدر اور وزیر اعظم کے عہدے پر متمکن ہونے کے بعد اخلاقی قدروں کا لحاظ رکھیں گے، ملک کی پالیسیاں مرتب کرتے وقت اسلامی تعلیمات کو مد نظر رکھا جائے گا اور اسلام کے خلاف کسی بھی امر کی منظوری نہیں دیں گے۔

۲) ایسا سیاسی نظام تشکیل پائے گا جو خدا اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کو اپنا مطمع نظر بنائے گا او تعمیری، مثبت اور عوامی امنگوں کا بھی پاس رکھے گا۔

۳) خود غرضی اور انفرادی مفادات کا خاتمہ ہو گا، اجتماعی اور قومی فلاح وبہبود کو ترجیح دی جائے گی۔

۴) عدل وانصاف کا قیام ہو گا، ظلم وستم، زیادتی، فرقہ واریت اور شدت پسندی کا خاتمہ ہو گا۔

---

(۱) قرآنی نظریات علم وتعلیم، ۲/۲۲۸

۵) ہر شخص کو برابری کی سطح پر مساویانہ عدالتی، سیاسی، اخلاقی اور قانونی حقوق حاصل ہوں گے۔

۶) پاکستان ایک اسلامی فلاحی مملکت کے طور پر منظر عام پر آئے گا اور بین الاقوامی سطح پر عزت و وقار میں اضافہ ہو گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قوم کو اخلاقی قدروں سے روشناس کرانے اور عملا ان کی زندگیوں میں ڈھالنے کے لیئے پہلے فکری و ذہنی تیاری اور پھر عملی تربیت کی ضرورت ہے۔ جس کے لیئے ضروری ہے کہ اخلاقی قدروں کو نظام تعلیم میں ڈھالا جائے۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو اخلاقی قدروں کو نوجوانوں تک منتقل کر سکتی ہے۔ جبکہ موجودہ دور میں تعلیمی ڈھانچے کے اندر اخلاقی قدروں کا نفاذ بہت کم نظر آتا ہے اسی لیئے معاشرے میں اس کے اثرات بھی بہت کم دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب تعلیم کے ذریعے اخلاقی قدروں پر زور دیا جائے گا تو معاشرہ تمام اخلاق رذیلہ سے اجتناب کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اسلامی نظریاتی معاشرے کا عکاس ہو جائے گا۔

فصل سوم

اخلاق کی اقسام

فصل سوم:

اخلاق کی اقسام

اسلامی نقطہ سے انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی خوشنودی کا حصول ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ احکام الٰہی پر عمل کیا جائے ان تمام اوصاف کو اپنانے کی کوشش کی جائے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں ایسے اوصاف فضائل اخلاق یا محاسن اخلاق کہلاتے ہیں اور ان اوصاف سے بچا جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں جنہیں رذائل اخلاق کہا جاتا ہے۔

محاسن اخلاق / فضائل اخلاق:

لفظ محاسن حسن کی جمع ہے جس کا مادہ **حسن یحسن حسنا و المحسن** سے ہے[1] یعنی خوبصورتی جمال، خوش نمائی، اچھائی، عمدگی، یا نیکی کو کہا جاتا ہے حسن اخلاق سے مراد نیک سیرتی، نیک طبعی، تواضع اور خوش خلقی ہے۔[2]

جیسا کہ قولہ تعالیٰ:

﴿ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ﴾[3]

ترجمہ: جو لوگ احسان کی روش اختیار کریں گے ان کے لیے حسنی (بھلائی) ہے اور مزید بھی

حسن البصری کے نزدیک حسن اخلاق کی وضاحت اس طرح سے کی گئی ہے:

" هو طلا قة الوجه وبخل والمعروف و كف الا ذى"[4]

ترجمہ: حسن اخلاق نام ہے خوش روئی کا، مال وزر خرچ کرنے کا اور کسی کو تکلیف نہ دینے کا۔

---

(۱) المحیط فی اللغۃ، احمد بن ادریس الطالقانی، الکافی الکفاۃ، عالم الکتب بیروت، لبنان، ۱۹۹۴م، ۲/۴۸۷

(۲) قاموس مترادفات، ص: ۵۴۰

(۳) سورۃ یونس: ۱۰/۲۶

(۴) جمع الوسائل فی شرح الشمائل، نور الیدن املا، علی بن (سلطان) محمد، المطبعہ الشرفیہ، مصر، ۲/۱۵۳

ارسطو[1] کے نزدیک:

"محاسن دانستہ اختیار افعال کے ملکہ نفسانی کی پیداوار ہیں" یعنی صاحب اخلاق حسنہ ایسا شخص ہے جس نے اپنے اندر درست راہ کے اختیار کرنے کا ملکہ پیدا کر لیا اور راہ صائب ہمیشہ افراط و تفریط کے وسط میں ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسن خلق اصلا معاملات و اوصاف میں اختیار توسط کا نام ہے جس کا اندازہ ذاتی حالات و ماحول کے مطابق لگایا جاسکتا ہے نہ کہ قطعا اس کی تحدید کی جاسکتی ہے۔ مثلا سخاوت ایسی حسن اخلاقی ہے جو اسراف و بخل کے درمیان واقع ہے اس کے لیے خرچ کی جانے والی رقم کی قطعیت کے ساتھ تحدید نہیں کی جاسکتی بلکہ اوسط حالات کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔

۱. کسی بھی انسان میں مکارم اخلاق اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتے جب تک کہ وہ کامل ایمان اور عقائد والا نہ ہو اور اس کا عمل نبی پاک ﷺ کی لائی ہوئی سیرت کے مطابق نہ ہو۔ آپ ﷺ کی سیرت میں پائی جانے والی اعلی صفات ہی کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محاسن اخلاق کی تربیت کے لیے انسان کا کسی جماعت سے وابستہ ہونا بہت ضروری ہے۔ انسان کی قوتوں اور خداداد صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اجتماعی روابط کو بہت اہمیت حاصل ہے جب تک انسان ہیئت اجتماعی کا رکن ہونے کی حیثیت سے متحد ہو کر زندگی بسر نہیں کرتا وہ کسی بھی حسن خلق کو اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا۔ وگرنہ اس کی زندگی اپنی ذات تک محدود ہو جاتی ہے اور تمام تر ذہنی و جسمانی صلاحیتیں ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

۲. قوم کے اجتماعی رسم و رواج، تمدن، عادات اور معاشرت ایک بری حد تک محاسن اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جیسا کہ انفرادی حالات زندگی اجتماعی حالات سے وابستہ ہیں تو جس طرح اجتماعیت میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اسی لحاظ سے ذاتی حالات میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ البتہ حالات کی تبدیلی سے محاسن اخلاق کی جو اصل فطرت ہے وہ کبھی نہیں بدلنی چاہیے اطلاقی حیثیت سے محاسن میں کتنا ہی اختلاف واقع ہو۔ مثلا سخاوت حسن خلقی کا نام ہے وہ جس شکل میں بھی ظاہر ہو سخاوت ہی کہلائے گی چاہے ضرورت مند پر خرچ کرنے والی رقم ۱۰ روپے ہیں یا ۱۰،۰۰۰/- روپے دونوں صورتوں میں خرچ کرنے والا سخی کہلائے گا۔ قوم کے رسم و رواج کو اخلاقی معیار نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس سے

---

(۱) ارسطو یونانی فلسفی اور بابائے سائنس ۳۸۴ قبل مسیح یونان میں پیدا ہوا۔ ۱۷ سال کی عمر میں ایتھنز کے شہر میں افلاطون کا شاگرد رہا۔ جہاں اس نے "مکتب مشائین" کے نام سے ایسا مدرسہ جہاں استاد اور شاگرد لمبے راستے پر ٹہل کر تعلیم حاصل کرتے اور دیتے تھے قائم کیا۔ ارسطو نے انسان کے علاوہ جانوروں پر بھی کام کیا اور سائنس کے وہ علوم دریافت کیے جو آج بھی جانے جاتے ہیں اسکی مشہور تصانیف طبعیات، اخلاقیات، حیوانات وغیرہ ہیں۔ اس کا انتقال ۳۲۲ قبل مسیح میں ہوا۔ (عالمی شخصیات (انسائیکلوپیڈیا)، عبد الوحید، مشتاق بک کارنر، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۲۵۸)

جمود طاری ہو جاتا ہے اور اخلاقی ترقی ممکن نہیں۔ اخلاقی ترقی کے لیے گرد و نواح کے حالات سے بلند تر سطح پر جانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔[1]

۳۔ اسلامی نظام اخلاق ایک ایسا دین ہے جس میں جلال و جمال دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں ان دونوں کے مناسب امتزاج اور اعتدال سے فضائل اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ فضائل اخلاق اس قدر وسیع ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے حکمائے اخلاق نے ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ بنیادی فضائل اخلاق

۲۔ فروع فضائل اخلاق

علماء کی یہ تقسیم محض علمی و نظری حیثیت رکھتی ہے جبکہ اسلام کا اصل مقصد بنی نوع انسان کو محض اخلاقیات کا علم بخشنا نہیں بلکہ عملی جامہ پہنانا ہے اچھے اخلاق کو اپنانا اور برے سے بچانا ہے۔ ان اقسام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

فضائل اخلاق

بنیادی فضائل اخلاق سے مراد ایسے اخلاق ہیں جو دوسرے تمام اخلاق کا اصل اور مرجع ہیں ان میں اعتدال سے فضائل اخلاق پیدا ہوتے ہیں افلاطون نے محاسن اخلاق کو سرفہرست کرتے ہوئے جزئیات سے ہٹ کر اصل کو مد نظر رکھا اور تمام تر محاسن اخلاق کو چار بنیادوں پر قائم کیا۔ تمام تر فضائل اخلاق ان چار بنیادوں کے ماتحت ہیں۔[2] اس لیے انہیں امہات فضائل اخلاق کہا جاتا ہے جس شخص میں یہ اوصاف پائے جائیں گے وہ ایک کامل انسان کہلائے گا۔ یہ جوہری ارکان اخلاق درج ذیل ہیں۔

شجاعت:

شجاعت سے مراد نصب العین میں حائل خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، خوف والم کا دفاع کرنا اور مستقل ہمت بڑھاتے ہوئے اپنے مقصد میں سرگرم عمل رہنے کے ہیں۔ شجاعت انسان کے اندر پائی جانے والی قوت غضب کے اعتدال کا نام ہے قوت غضب نفس انسانی میں پائی جانے والی ایسی قوت جو ابھارتی ہے دلیری اور خوفناک چیزوں پر اقدام و تسلط کے لیے اس معنی کے اعتبار سے لفظ شجاعت بہت سے محاسن اخلاق کا احاطہ کیے ہوئے ہے مثلاً صبر، عزیمت، بہادری، استقلال، وقار، کرم اور کبر نفس وغیرہ۔

---

(۱) اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ، ص: ۵۰-۴۸

(۲) سیرۃ النبی، سید سلیمان ندوی، دینی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۵ء، ۶/۳۰۹

عفت:

عفت کے معنی حیاء اور پاکبازی کے ہیں۔ یہ قوت شہوت میں اعتدال کا نام ہے ایسی قوت جو شہوت پرستی، حرص وغیرہ کو انسان کے اندار پیدا کرتی ہے۔[۱] عفت اپنے وسیع معنوں میں بہت سارے محاسن اخلاق پر حاوی ہے جیسا کہ بے حیائی حیائی سے احتراز کرنا، چشم پوشی، قلت طمع، وساوس شیطانی پر قابو پانا، ذلیل کاموں سے پرہیز کرنا اور سخاوت وغیرہ۔ قولہ تعالیٰ:

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾[۲]

ترجمہ: اور وہ عورتیں جو کسی اور کے نکاح میں ہوں سوائے اس کے جو تمہاری ملک عین بن جائیں۔

اس آیت میں **محصنۃ** بمعنی **کل امراۃ عفیفۃ ھی محصنۃ** یعنی ہر وہ عورت جو عفت و پاکبازی سے متزوجہ ہے اس کے لیے قرآن میں **محصنۃ** کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔[۳]

عدالت:

بنی نوع انسان کے ساتھ حسن معاملات و تعلقات کے لیے لفظ بہت اہمیت رکھتا ہے عام اصطلاح میں اس لفظ کو قانونی احکام کی فیصلہ گاہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس کے معنی دیانت داری اور راست بازی کے ہیں تمام بنی نوع انسان کے ساتھ اس لحاظ سے یہ اپنے اندر انصاف، صداقت، خوش معاملگی اور دیانت جیسی تمام صفات کو اپنے اندر شامل کیے ہوئے ہے۔ عادل وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ حقوق کی بجا آوری میں سیاسی، معاشی، معاشرتی اور قانونی ہر لحاظ سے تناسب و توازن رکھے اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے اس رو سے عدالت وہ ہے جس میں ایسا نظام ہو جو ہر شخص کے لیے حق بجانب ہو کسی پر ظلم نہ ہو، غیر جانبدارانہ اور ہر ایک کے مفاد کا لحاظ رکھا جائے۔[۴]

حکمت:

تمام امہات فضائل اخلاق کی روح ایک فضیلت میں پائی جاتی ہے اور وہ ہے حکمت، حکمت ایک ایسی قوت علم ہے جس سے انسان نیک و بد، حق و باطل اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے کے قابل ہوتا ہے۔[۵]

---

(۱) مکارم الاخلاق، محمد ذکاء اللہ دہلوی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، ص:۹۳-۹۱

(۲) سورۃ النساء:۴/۲۴

(۳) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، محمد دین عبد اللہ، شہاب الدین، دار الکتب العمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، ص:۳/۴

(۴) لطائف الاشارات تفسیر القشیری، عبد الکریم بن ھوازن، القشیری، الھیئۃ المصریہ، مصر، ص:۲/۳۱۴

(۵) جامع البیان فی تاویل القرآن، أبو جعفر الطبری، محمد بن جریر، مؤسسۃ الرسالہ، ۲۰۰۰م، ۵/۵۷۶

تمام امہات فضائل شجاعت، عفت اور عدالت کی اصل بنیاد حکمت ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾[1]

ترجمہ: وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔

حکمت خدا کی عطا کردہ بہت بڑی فضیلت ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے باقی تمام فضائل اس کے مطیع ہیں شجاعت، عفت اور عدالت میں سے کوئی ایک بھی اگر حکمت کے ساتھ پائی جائے تو وہ انسان عام سطح سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ علم و عقل کے صحیح استعمال سے انسان امہات فضائل اخلاق میں اعتدال کی راہ اختیار کر سکتا ہے وگرنہ افراط و تفریط کے باعث صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا۔

یہ تمام بنیادی فضائل اخلاق نفس انسانی کے اوصاف ہیں اگر یہ تمام کسی انسان میں جمع ہو جائیں تو وہ ایک کامل اور کامیاب انسان ہے۔ معاشرے میں بہت کم افراد کو قدرت نے یہ فیاضی بخشی ہے۔ البتہ جس کسی میں بھی حکمت کے ساتھ کوئی ایک فضیلت بھی پائی جائے ان کا رتبہ بلند ہے۔

فضائل اخلاق جن پر تمام محاسن کی بنیاد ہے ذکر کرنے کے بعد علمائے اخلاق نے جزئی محاسن کو بھی سر فہرست کرنے کی کوشش کی ہے مگر تمدن جدید کی وسعت کو دیکھتے ہوئے تمام تر فروع فضائل اخلاق کو جمع کرنا بہت مشکل ہے اس لیے یہاں ان میں سے چند ایک کا تفصیلی ذکر کیا جاتا ہے۔

الاحسان:

لفظ احسان حسن سے ماخوذ کیا گیا ہے یعنی ہر کام کو خوبصورتی سے انجام دینا۔[2] **حسنت الشئی تحسینا** یعنی میں نے اس چیز کو خوبصورت اور حسین بنا دیا واحسنت الیہ کا معنی میں نے اس سے احسان کیا۔ احسان فعل احسن کا مصدر ہے۔ الاحسان ضد الإساءۃ یعنی احسان برائی کا مقابل ہے۔[3]

احسان سے مراد فیاضانہ معاملہ، خوش خلقی، اچھائی جو اپنے ساتھ کی جائے یا دوسروں کے ساتھ کیا جانے والا ہر وہ کام جس سے اسے نفع پہنچے اور کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینا اور خود کم پر راضی ہونا بھی احسان کہلاتا ہے۔[4]

---

(۱) سورۃ البقرۃ:۲/۲۶۹

(۲) کتاب التعریفات، علی بن محمد بن علی، الجرجانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۳ء، ۱/۱۲

(۳) الجامع الاحکام القرآن، القرطبی، أبو عبد اللہ محمد بن احمد، شمس الدین، دار الکتب المصریہ، القاھرہ، ۱۹۶۴ء، ۱۰/۱۶۶

(۴) التفسیر الکبیر، ۲۹/۳۷۷

قولہ تعالیٰ:

﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾[1]

ترجمہ: بھلا نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے والے کا اجر و ثواب بھی اللہ نے زیادہ رکھا یعنی جو دنیا میں بھلائی کی روش اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے احسان کا بدلہ آخرت میں بھی دے گا۔ قرآن مجید میں بار بار احسان اور حسن سلوک کرنے کا حکم دیا قولہ تعالیٰ:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى﴾[2]

ترجمہ: بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت والے کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

عدل تو یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دیا جائے مگر احسان اس سے بڑھ کر ہے کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینا احسان ہے اس میں معاشرے کا کمال اور جمال ہے۔ لفظ احسان کی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً کسی کو مصیبت سے نجات دلانا، کسی کی مالی مدد کرنا، غلطی کرنے والے کو معاف کر دینا اور عزیز و اقارب سے ناراضگی رکھنے کی بجائے معافی کا معاملہ اختیار کرنا بھی احسان ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب احسان کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الْإِحْسَانِ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))[3]

ترجمہ: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسی بندگی کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث میں احسان کو اپنے عمل میں خوبصورتی پیدا کرنے کے معنی میں لایا گیا یعنی جو اطاعت الہیٰ کے دوران یہ تصور کرتا ہے کہ اللہ اس پر نگران ہے تو اس کا عمل اچھا ہوتا ہے۔ احسان کے مختلف معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن میں اس کے مختلف الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً فضل، معروف اور بر وغیرہ۔[4]

گویا کہ احسان خدا اور اس کی مخلوق دونوں کے ساتھ اچھائی سے معاملہ کرنے کا نام ہے، اللہ کی عبادت کو احسن طریقے سے ادا کرنا احسان ہے۔ مخلوق کے ساتھ معاملات میں ان کے حقوق و واجبات کے علاوہ تمام اچھے اقوال و افعال احسان میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کا معاملہ اختیار کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ جانور کو ذبح کرتے ہوئے بھی اچھے

---

(۱) سورۃ الرحمن: ۵۵/ ۶۰

(۲) سورۃ النحل: ۱۶/ ۹۰

(۳) الجامع الصحیح، کتاب التفسیر، باب سورۃ الم غلبت الروم، حدیث نمبر: ۴۴۹۹، ۴/ ۱۷۹۳

(۴) سیرۃ النبی، ۶/ ۲۲۲-۲۲۳

طریقے سے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ معاشرے کی اجتماعی خیر خواہی، ایثار، محبت اور شکر گزاری جیسی اعلی صفات کی نشو ونما کے لیے احسان بہت ضروری ہے۔ احسان ہر مسلمان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے سے متعلقہ ہر عمل کو بہتر انداز میں انجام دے اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس طریقے سے بہترین اعمال ہی میں معاشرہ کی بلندی اور قوم کی ترقی ہے۔

الصدق:

الصدق مصدر ہے صدق کا اس کا مادہ صدق یصدق صد قا و صد قا سے ہے۔ **فی الحدیث أونحوہ: أوردہ علی حقیقۃ بلا کذب** یعنی کلام یا گفتگو کو اس کی حقیقت پر بیان کرنا بغیر جھوٹ کے۔[1] یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی سچائی، اخلاص اور راست بازی کے ہیں[2]۔ اسلام نے صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے صدق کو بہت اہمیت دی ہے اور اس کے برعکس کذب کو بدترین گناہ قرار دی۔

انسان کے قول وعدل کی درستگی، اس کے دل وزبان میں ہم آہنگی پر منحصر ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے اگر انسان سچا ہے تو ہی اس کے لیے ہر نیکی کا راستہ آسان ہو جاتا ہے اور بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ اس ایک اخلاقی فضیلت کے نیچے بہت سے اخلاقی خوبیاں آجاتی ہیں مثلا سچا انسان ہی وعدہ کو پورا کرے گا، راست باز، ایماندار، دلیر، بھروسے کے اہل اور اس کے دل میں نفاق نہ ہو گا۔ صدق صفات الٰہی میں سے ایک بہت بڑی صفت ہے۔ خدا جو اپنے ہر وعدہ میں سچا ہے اس کی بھیجی ہوئی تمام شریعتیں برحق اور سچی ہیں۔

قولہ تعالیٰ:

﴿ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴾[3]

ترجمہ: اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قول میں اللہ سے بڑھ کر کون سچا ہے۔

روز قیامت، اعمال صالح کے بدلے جنت اور برے اعمال کے نتیجے میں دوزخ سے متعلق کیے گے وعدے سچے ہیں، اللہ سے بڑھ کر بھی کوئی اپنے قول میں سچا ہو سکتا۔ مومنین کی نشانی یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کی باتوں کو سچا مانتے ہیں، اپنے قول اور عمل سے سچائی کا ساتھ دیتے ہیں۔ قولہ تعالی:

---

(۱) الرائد، جبران مسود، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۴، ص:۹۱۶

(۲) اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص:۱۰۷۷

(۳) سورۃ النساء، ۴/ ۱۲۲

﴿وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (۱)

ترجمہ: راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں ، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اپنے دامن عفت کو آلودگی سے پاک رکھنے والے مرد اور پاک دامن عورتیں، اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

جتنے بھی پیغمبر مبعوث ہوئے وہ حق کے دعویدار تھے، ان کی باتیں اور دلیلیں اگر ذرا بھی سچائی سے خالی ہوتیں تو نبوت کی عمارت کبھی قائم نہ ہو سکتی۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ نے سچائی اختیار کرنے اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کرنے کی ہمیشہ ترغیب دی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ صِدِّيقًا)) (۲)

ترجمہ: بلاشبہ سچ آدمی کو نیکی کی طرف بلاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ صدیق کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔

سچائی کے معنی بہت وسیع ہیں یہ اپنے اندر قول کی سچائی کے ساتھ ساتھ دل اور عمل کی سچائی بھی رکھتی ہے۔ زبان سے سچ اور حق بات بولنا ایمان کی نشانی ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ کلام میں جھوٹ کو ہر طرح سے چھوڑ دے یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی صداقت کے سوا کچھ نہ کہے۔ اسی سے ایمان مکمل ہو گا وگرنہ منافق کہلائے گا۔ سچائی کا زبان سے اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ دل سے اقرار بھی بہت ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دور میں بہت سے لوگ زبان سے تو آپ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے مگر دل سے نہیں مانتے تھے اسی لیے اللہ نے انہیں منافق کیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی قول و عمل کی درستگی زبان کے ساتھ ساتھ دل کی ترجمانی پر بھی منحصر ہے۔ نیز اگر کوئی عمل ظاہرا تو صحیح نظر آتا ہو مگر دل میں اخلاص اور نیت خدا کی خوشنودی نہیں بلکہ کوئی اور دنیاوی اغراض ق مقاصد ہوں تو ان کا اللہ کے ہاں کوئی معاوضہ

---

(۱) سورۃ الاحزاب: ۳۵/۳۳

(۲) الجامع الصحیح، کتاب الأدب، باب قول اللہ تعالی: (یا أیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ)، حدیث نمبر: ۵۷۴۳، ۲۲۶۱/۵

نہیں۔ لہذا اعمال کی صداقت کے لیے بھی ضروری ہے کہ ظاہرہ عمل باطنی اوصاف سے مطابقت رکھتا ہو۔ احکام الٰہی کی حقیقی پابندی بھی وہی مومنین کر سکتے ہیں جو زبان سے اقرار، دل سے مضبوط ارادہ، عزم اور اعمل سے اظہار کی آزمائش میں متزلزل ہونے کی بجائے امتحان میں پورے اترتے ہیں چنانچہ صحیح معنوں میں صدیق کہلانے کا حق دار وہی ہے جو زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی تینوں میں ہر طرح سے پورا اترتا اور قائم رہتا ہے۔ صدیق کہلانا انسانیت کا سب سے بڑا مرتبہ کمال ہے۔

صلہ رحمی:

صلہ رحمی رشتہ داروں کے ساتھ حسن معاملات اور احسان کی ایک خاص صورت ہے اس سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ قرابت داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے یا ان کی خوشی و غمی میں شریک ہوں بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ ہر خاندان کا صاحب استطاعت شخص غریب عزیز و اقارب کی مالی امداد کرے۔ شریعت معاشرے میں خاندان کو ایک خاص عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے۔ اسکی نظر میں خاندان کے خوشحال فرد کے مال پر صرف اس کی اپنی ذات اور بال بچوں کا حق نہیں بلکہ قرابت داروں کے حقوق بھی عائد ہوتے ہیں جن میں سب سے پہلے والدین اور بہن بھائی کے حقوق بھی عائد ہوتے ہیں اور پھر وہ جو ان کے قریب تر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ﴾[1]

ترجمہ: اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ایک بڑی نیکی ہے اور ان کے ساتھ تعلقات کو توڑنا گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کا اللہ سے محبت کا امتحان، اس کے بندوں کے ساتھ باہم تعلقات میں لیا جاتا ہے وہی شخص اللہ سے ڈرتا اور محبت رکھتا ہے جو اس کے بندوں کے حقوق کو ادا کرے اور باہمی خیر خواہی اور محبت سے معاملات کرے۔ جو رشتہ داروں کے ساتھ تعلق کو جوڑتا ہے اللہ اس سے جڑتا ہے اور جو توڑتا ہے اللہ اس سے کٹتا ہے۔ احادیث میں بھی اس کی وعید متعدد بار آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((الرَّحِمُ شِجْنَةٌ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ ، وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهُ))[2]

ترجمہ: رحم شاخ ہے جو شخص اس سے ملے میں اس سے ملتا ہوں اور جو اس سے قطع تعلق کرے میں اس سے قطع تعلق کرتا ہوں۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) سورۃ النساء: ۴/۱

(۲) الجامع الصحیح، کتاب بدء الوحی، باب من وصلہ اللہ، حدیث نمبر: ۵۹۸۹، ۸/۶

((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ رِزْقُهُ ، أَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ)) [1]

ترجمہ: جسے پسند ہے کہ اس کی روزی میں فراخی ہو اور اس کی عمر دراز کی جائے تو چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کیا کرے۔

اسلام نے معاشرے کے افراد میں خوشگوار تعلقات بڑھانے کے لیے ہر انسان کو دوسرے کا ہمدرد اور خیر خواہ بنایا اور کثرت سے احکامات دیئے۔ اسلام کی نظر میں ایک معاشرے کی اس سے زیادہ بدتر حالت کیا ہو گی کی معاشرے کا ایک فرد تو عیش و عشرت میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے اور اسی کا بھائی روٹی کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ جس معاشرے کے افراد میں صلہ رحمی کی صفت پائی جاتی ہے وہیں غریبوں کی پرورش، باہمی تعاون اور محبت و یکجہتی نظر آتی ہے معاشرے کے صاحب استطاعت اگر اسی طرح مالی امداد کا فریضہ سر انجام دینے لگیں تو غریبوں کی معاشی خوشحالی اور اخلاقی و معاشرتی استحکام پیدا ہوتا ہے۔ غربت و افلاس کا ازالہ ہوتا ہے۔

عفو و درگزر:

عفو و درگزر فضائل اخلاق میں سے ایک بہت بڑی صفت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کا جرم ثابت ہونے پر اس سے بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کر دینا۔ اس سے دلوں میں کدورت پیدا نہیں ہوتی۔ معاملات سدھرتے ہیں اور برائی کے مزید پھیلنے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

عفو و درگزر خدا کی عظیم صفت ہے، جس کی بنا پر دنیا آباد ہے وگرنہ گناہوں سے بھری یہ کائنات کب کی ہلاک ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پر اپنے آپ کو غفار، غافر، عفو اور غفور کہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَوْ تَعْفُوا عَن سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا﴾ [2]

ترجمہ: یا کسی برائی کو معاف کرو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

یہ صفت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے اور انہیں قصور واروں کو معاف کر دینے کی ترغیب دیتا ہے، تم دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے گا غیظ و غضب کی حالت ہو، حالت سکون ہو یا مذہبی اختلافات ناگواریوں کو برداشت کرنے اور برائی کے بدلے بھلائی کرنے میں ہی اخلاقی برتری ہے۔ یہ اخلاقی فضیلت انتہائی کشادہ دلی سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا صلہ بھی انتہائی درجے کی وسعت رکھتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح سے کیا گیا ہے، قولہ تعالیٰ:

---

(۱) الجامع الصحیح، کتاب البیوع، باب من أحب البسط فی الرزق، حدیث نمبر: ۱۹۶۱، ۲/۷۲۸

(۲) سورۃ النساء: ۴/۱۴۹

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ oالَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾(۱)

ترجمہ: اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑ کر چلو جس کا عرض آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے وہ ان خدا ترس لوگوں کے لی تیار کی گئی ہے جو خوشحالی اور تنگ دستی میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں ایسے ہی نیک لوگوں سے اللہ محبت رکھتا ہے۔

یعنی متقی کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور معاف کر دینے کا معاوضہ جنت اور خدائی مغرفت ہے۔ اسلام عفوو درگزر جیسے اخلاقی کمال کی نہایت مقتدل تعلیم دیتا ہے جس کے ساتھ خود داری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔ جماعتی قانون کی رو سے برائی کا بدلہ برائی ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص انفرادی سطح پر معاف کر دیتا ہے تو یہ بہت بڑے حوصلے، خود داری اور بلند اخلاق کی مثال ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی اپنی ذات کی خاطر قدرت رکھنے کے باوجود انتقام نہ لیا۔ سوائے اس کے جب کوئی اللہ کے احکام کو توڑتا یا مذاق اڑاتا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ))(۲)

ترجمہ: صدقہ سے مال میں ہرگز کمی نہیں ہوتی جو بندہ درگزر کرتا ہے اللہ عزوجل اس کی عزت بڑھا دیتا ہے اور جو اللہ عزوجل کے لیے عاجزی کرتا ہے اللہ اس بلندی عطا فرماتا ہے۔

عفوو درگزر سے لوگوں کے اندر پائدار شریفانہ وقار پیدا ہوتا ہے جبکہ انتقام لینے سے وقتی جذبے کی تسکین تو ہو جاتی ہے اور دھاک بیٹھ جاتی ہے مگر عزت نہیں پیدا ہوتی اور محبت الٰہی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس معاف کر دینے والوں کا معاوضہ اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے اور یہ متقین کی صفات میں سے عظیم الشان صفت ہے۔

مساوات:

اسلام کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں کسی انسان کو دوسرے پر نسلی یا قومی برتری حاصل نہیں۔ اسلامی معاشرہ میں ہر ایک کو برابر حقوق حاصل ہیں۔ اسلام کا یہ پہلو عملی لحاظ سے بھی تمام عبادات و معاملات میں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ نماز میں امیر ہو یا غریب سب ایک ہی صف میں برابر خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں اسی طرح ماہ رمضان میں سب برابری کی سطح پر

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۳۳-۱۳۴

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، حدیث نمبر: ۴۶۸۹، ۱۲/ ۴۷۴

بھوکے رہتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں حج کے موقع پر دیکھا جائے تو ایک ہی لباس میں ملبوس شاہ و گدا مناسک حج ادا کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں مساوات کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاءً﴾[1]

ترجمہ: اے لوگو اپنے پرودگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے اسی کا جوڑ پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

نبی کریم ﷺ سے وحدت نسل انسانی کے بارے میں فرمایا:

((إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَأَبَاكُمْ وَاحِدٌ، وَلَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى))[2]

ترجمہ: لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔

لہذا اسلام انسانوں کے درمیان تفریق کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ اسلام نسل انسان کی وحدت کا داعی ہے یہ تمام انسانوں کا مل جل کر ایک گھرانے کے افراد کی طرح عدل و انصاف اور رحم دلی کے ساتھ رہنے کا حکم دیتا ہے اسی سے ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس کی عمارت امن و سکون پر قائم ہوتی ہے۔

مودت:

اسلامی معاشرے کے اساس محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں اسلام نے ہمیشہ ایک دوسرے سے باہمی روابط کو محبت سے فروغ دینے کا درس دیا۔ اس کی عملا مثال ہمیں میاں بیوی کے درمیان محبت کے جذبات سے ملتی ہے کہ کس طرح خالق کائنات نے دو اجنبیوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے اضطراب کی کیفیت رکھ دی کہ مل کر رہنے ہی سے دونوں کو سکون میسر آتا ہے اور ایک گھر تشکیل پاتا ہے، پھر خاندان اور قبیلے منظر عام پر آئے اور اس طرح سے انسان کی تمدنی زندگی پروان چڑھی۔ نیز ازدواجی زندگی میں خدا کی ذات نے ایسا الفت سے بھرپور روحانی تعلق ودیعت کیا کہ جس کی بدولت جیون ساتھی بڑھاپے تک ایک دوسرے کے لیے رحیم و شفیق ثابت ہوتے ہیں۔ اگر یہ محبت و الفت کے جذبات نہ ہوتے تو آج معاشرہ کیسے

---

(۱) سورۃ النساء: ۴/۱

(۲) المعجم الاوسط، سلیمان بن احمد بن ایوب، الطبرانی، دار الحرمین، القاھرہ، حدیث نمبر: ۴۷۴۹، ۵/۸۶

تشکیل پاتا اور تہذیب و تمدن نشو و نما پاتا۔ تعلیمات اسلامی کے تحت خود غرضی اور نفرت و عداوت کی ممانعت کی گئی بلکہ باہمی احترام اور ایک دوسرے کی مدد امداد کرتے ہوئے مل جل کر زندگی گزارنے پر زور دیا۔ رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّمَامَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَالْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ شَيْئًا تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ))[1]

ترجمہ: تمام مسلمان باہمی محبت، آپ کے تعلقات اور ہمدردی میں ایک جسم کی طرح ہیں جب ایک حصہ تکلیف محسوس کرتا ہے تو پورا جسم اس کی مدد کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کسی طبقاتی تفاوت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا۔ اس معاشرے میں تمام انسانوں سے برابری کے برتاؤ کا درس دیا جاتا ہے۔ البتہ اہل ثروت معاشرے کے محتاج و مساکین پر اپنا مال خرچ کر کے اس خلاء کو پر کر سکتے ہیں جو معاشرے میں غربت کے باعث ہوتی ہے اس طرح ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس کی بنیاد ایک دوسرے کے ساتھ قربت، احساس، ہمدردی اور موانست پر ہوتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

دین اسلام زندگی گزارنے کا ایک مکمل ضابطہ اخلاق دیتا ہے اور ہر ایک پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اسے عملی طور پر معاملات زندگی میں ڈھالے نہ صرف خود عمل کرنا بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کو قائم کرنے اور بدی سے روکنے کا حکم دیتا ہے یہی وہ صفت ہے جس کی وجہ سے مسلمان امت کو خیر الامت کا لقب دیا گیا۔ قولہ تعالیٰ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[2]

ترجمہ: تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہو تم اچھے کاموں کا حکم دیتے اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

نیکی کو فروغ دینے اور برائی کو روکنے سے معاشرے سے فساد و انتشار کو جڑ سے اکھاڑا جاسکتا ہے منکر سے مراد شرک، بری رسومات، بدعات اور ہر قسم کی بد اخلاقیوں سے روکنا ہے۔ غرض یہ کہ ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہے۔ اگر یہ صفت حضور اکرم ﷺ کی امت میں باقاعدہ اہتمام سے پائی جائے تو ایک منظم معاشرہ تشکیل پائے۔

---

(۱) مسند الشہاب، أبو عبد اللہ القضاعی، محمد بن سلامہ، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۸۶م، حدیث نمبر: ۱۳۶۷، ۲/۲۸۳

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/۱۱۰

رذائل اخلاق:

۱. ہر فرد کے اندر جہاں محاسن اخلاق کو اپنانے کی تمنا رہتی ہے وہاں فطرتا اس میں ایسے جذبات بھی پائے جاتے ہیں جو اسے معصیت کی طرف لے جاتے ہیں اسے ایسے اوصاف جو گناہ کی طرف لے جائیں اور خدا کو ناپسند ہوں رذائل اخلاق کہلاتے ہیں انسان فطری طور پر حریص پیدا کیا گیا ہے وہ دنیا سے زیادہ سے زیادہ منافع کو اپنے لیے مخصوص کر لینے کی کوشش میں رہتا ہے اس طرح معاشرے کے افراد میں باہم تصادم پیدا ہوتا ہے انسان اپنی غیر معمولی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے جو اسے برے اعمال پر آمادہ کرتے ہیں کچھ وقت تک انسان کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے مگر پھر اس کی حریص فطرت اسے اصلاح اعمال سے روکے رکھتی ہے اس طرح مضرت بخش ذرائع کا استعمال عام ہو جاتا ہے یہاں تک کہ انسان مردہ ہو جاتا ہے اور اسے برائی بھی بھلائی لگنے لگتی ہے حصول مقصد کے لیے وہ برائی ہی کو ذریعہ بنالیتا ہے انسان کی زندگی کا مقصد محض ذاتی اغراض کو ترجیح دینا ہے جب معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں کی پائی جائے تو اخلاق کے محاسن پیدا کرنے کے لیے پہلے مصائب کا مقابلہ کرنا لازم ہو جاتا ہے یہ رذائل اخلاق معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لے جاتے ہیں اور انسان کی روحانیت وانسانیت کو کچل کر مفاد پرستی کی طرف لے جاتے ہیں چنانچہ معاشرے کے افراد میں خدا اور یوم الآخرۃ سے بے خوفی اور انسان کی جبلی اور طبعی خود غرضی اخلاق رذیلہ کے اسباب ہیں۔[۱]

۲. اخلاق رذیلہ ہی کسی بھی جرم کا پیش خیمہ ہوتے ہیں یعنی کوئی بھی جرم سرزد ہونے سے پہلے برا ارادہ اور بری نیت ضرور پائی جاتی ہے اسی لیے علم الاخلاق میں جرائم کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ باطنی اصلاح کی جائے جبکہ حکومت یا قانون صرف ظاہری اصلاح تک محدود ہیں۔ باطنی اصلاح کے لیے تزکیہ نفس بہت ضروری ہے جو مذہب کر سکتا ہے[۲] مذہب ہی انسان کو یہ خوف دلاتا ہے کہ ایسی طاقت بھی موجود ہے جو انسان کی ہر بری وارادہ کو جانتا ہے۔ برا خیال یا ارادہ ہی برائی پر ابھارتا ہے البتہ خیالی برائی اور عمل کی برائی میں بہت فرق ہے اگر کسی شخص کے برے ارادہ سے واقف ہو جائیں تو اس کے ساتھ وہ طرز عمل نہیں کرنا چاہیے جو برے فعل پر کیا جاتا ہے کیونکہ ہر برا ارادہ برے فعل کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے شخص کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنے برے خیال کو اچھائی میں بدل دے صرف برا خیال رکھنے والا شخص اخلاق سزا کا حق دار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اسے عملی جامہ نہ پہنادے۔

---

(۱) رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب، ص:۳۲۱-۳۱۹

(۲) پیغمبر اسلام اور خلق عظیم، ص:۶۳-۶۴

۳. دوسری طرف دیکھا جائے تو برے عمل والا برے خیال سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ برا عمل ظاہر ہو جاتا ہے اس کی سزا اخلاقی یا قانونی سطح پر بروقت مل جاتی ہے البتہ برا خیال پوشیدہ رہتا ہے معاشرہ عرصے تک دھوکے میں رہتا ہے اس لیے برے خیال کو بالکل فنا تو نہی کیا جاسکتا لیکن اسے اچھے خیال واردہ سے بدلا جاسکتا ہے۔ یہ تبدیلی ہی محاسن اخلاق کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

۴. اخلاق ذمیمہ ایسی بری خصلتیں ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا گیا اور جن کو کرنے والے گناہ گار ٹھہرتے ہیں قرآن پاک میں ان اوصاف کے متعدد نام ذکر کیے گئے ہیں جیسا کہ فحشا (بے حیائی)، مکروہ (ناپسندیدہ)، سوٓء (برائی)، خطا (ناصواب اور منکر (ناشناسا) وغیرہ۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ رذائل کا اختیار کرنا شرعا اور عقلا دونوں کی نظر میں کتنا بد نما ہے ان اوصاف میں سب سے زیادہ فحشاء، منکر اور بغی کا ذکر آیا ہے جو ہر طرح کے رذائل کو محیط ہیں۔ کوئی بھی بد اخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہو سکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾[1]

ترجمہ: اور فحشاء اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

فحشاء :کا لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز میں اگر کوئی حد مقرر کی ہے تو اس سے آگے بڑھ جانا قبح یا برائی ہے اور برائی میں حد سے آگے نکل جانا فحشاء ہے مثلا اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لیے جو حدیں مقرر کی ہیں اگر انسان ان سے آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ فاحشہ کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ جیسا کہ زنا اور بد کاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔[2] یہ وہ برائی ہے جو کسی بھی فرد کی ذات تک محدود ہوتی ہے۔

منکر: منکر کا مادہ نکر ینکر منکر سے ہے اس کی جمع انکار ہے یعنی ناشناسا یا غیر معروف، منکر کی ضد معرفہ ہے۔[3] اس سے مراد ایسا کام ہے جو لوگوں میں زیادہ ناپسند کیا جاتا ہو اور اس کے کرنے والا اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جو کہ ہر شخص بغیر کسی دلیل کے فطرتا ناپسند کرتا ہے۔ اور ان برے افعال کے کرنے سے بد نمائی بداہتہ چہرے پر چھا جاتی ہے مثلا ظلم و ستم اور سنگ دلی وغیرہ ان برائیوں سے معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔[4]

---

(۱) سورۃ النحل:۱۶/ ۹۰

(۲) تھذیب اللغۃ، ۴/ ۱۱۱

(۳) الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ، أبو نصر اسماعیل بن حماد، الجوھری، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۷م، ۴/ ۸۳۶

(۴) سیرۃ النبی ﷺ، ۷/ ۵۱۹

البغی :التعدِی، وبغی الرجل علی الرجل: استطال، ظلم، و کل مجاوزة فی الحد و إفراط علی المقدار الذی هو حد الشئ فهو بغی یعنی بغی کے معنی تعدی، دست درازی، ایک آدمی کا دوسرے پر زیادتی کرنا، ظلم اور کسی چیز کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کرنا بغی کہلاتا ہے۔[1] یہ ایسے برے اعمال ہیں جن سے جان، عزت اور مال سلامت نہیں رہتی، لوگوں کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جاتی ہے پورا ملک وملت اس سے متاثر ہوتا ہے مثلاً قتل، ڈاکہ اور چوری وغیرہ۔

۵. جس طرح محاسن اخلاق کو اصل اور فرع کی بنیاد پر دو طرح سے تقسیم کیا گیا ہے اسی طرح رذائل اخلاق کی بھی دو اقسام ہیں، جن کو تفصیلا درج ذیل ذکر کیا جاتا ہے:

بنیادی رذائل اخلاق

فروع رذائل اخلاق

رذائل اخلاق:

جس طرح تمام تر محاسن اخلاق چار بنیادی ارکان پر مشتمل ہیں اسی طرح محاسن کے عین مقابلہ میں چار بنیادیں رذائل اخلاق کی بھی ہیں جو کہ تمام تر عیوب اخلاق کا مرجع ہیں یہ چار بنیادی ارکان درج ذیل ہیں۔

جبن:

جبُن یَجبُن و جبُناً بمعنی ضعف قلبه أونکص یعنی دل کا کمزور ہونا یا ضعیف ہونا کوئی بھی انسان جب اپنے اخلاقی نصب العین کے راستے میں حائل مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے میں کمزوری برتے یا اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے وقت ہچکچائے تو ایس تمام کمزوریاں جبن کے تحت آجاتی ہیں۔[2] خلق شجاعت کی کمی سے انسان کے اندر چین، خوف، پست حوصلگی اور ذلت جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔

حرص:

حرص یحرِص حرصاً فهو حریص علیک أی علی نفعک و الشقَ والجشع [3] یعنی حرص کے معنی کسی چیز کا لالچ کرنا، کسی کو نفع پہنچانے کی کوشش کرنا یا کسی چیز کا انتہائی خواہش مند ہونا، مشتاق ہونے کے ہیں۔

---

(۱) الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ، ۶/۲۲۸۱

(۲) کتاب الأفعال، ابن القطاع الصقلی، علی بن جعفر بن علی السعدی، عالم الکتب، ۱۹۸۳م، ۱/۱۵۴، ۱۶۴، ۲۳۸، ۳۲۴

(۳) کتاب العین، أبو عبد الرحمن الخلیل بن تمیم، الفراہیدی، دار ومکتبہ الھلال، ۳/۱۱۶

حرص یالذت کی غلامی سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہی جو کہ قوت شہوت کے عدم اعتدال کا نتیجہ ہوتی ہیں اور انسان ووساوس شیطانی کے ماتحت ہو جاتا ہے اس سے بے حیائی، خبث، فحش، حسد، اسراف، لغو اور بے حرمتی جیسی صفات رونما ہوتی ہیں۔

ظلم:

الظلم مصدر ظلمُة أظلمه ظلماً یعنی کسی پر ذیادتی کرنا، غلط روش اختیار کرنا یا حق تلفی کرنا وغیرہ۔ **وأصل الُظلم و ضعک الشئ فی غیر موضعه** اور اصلا ظلم سے مراد کسی چیز کا غلط جگہ استعمال کرنا یا بے موقع استعمال کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں دوسروں کے ساتھ غیر منصفانہ روش، کسی کا حق مارنا، چھیننا یا اس میں کمی کرنا، بد سلوکی، حد سے تجاوز کرنا اور حق تلفی و زیادتی جیسے تمام معائب اخلاق پر ظلم حاوی ہے۔[1] یہ رذائل اخلاق میں سے ایسی بد اخلاقی ہے جس سے اجتماعی روابط میں بد عدلی عدلی پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے لوگ ایک دوسرے کے حقوق غصب کرتے ہیں اور بے حسی کی فضا پھیل جاتی ہے۔

جہل:

جَهل يَجهَل جهلاً و جها لة أن تفعل فعلابغير علم أو نقيض العلم یعنی کسی کام کا بغیر علم کے کرنا، ناواقفیت ہونا، نادانی بے خبری اور بے وقوفی کو جہل کہا جاتا ہے۔[2] قولہ تعالیٰ:

﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾[3]

ترجمہ: اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔

جہالت و گمراہی وہ حالت ہے جس پر عرب قبل الاسلام قائم تھے۔ لاعلمی کی بنا پر حقیقی ایمان کی بجائے غلط اعتقادات کا شکار تھے۔ اسی ناواقفیت کی وجہ سے ہر انسان راہ صائب کو اختیار کرنے میں غلطیاں کرتا ہے۔ قوت امتیاز میں کمی کی بناء پر حق کو نہیں پہچان سکتا۔ نتیجتاً صحیح راستے سے گمراہ ہو کر بھٹکتا رہتا ہے اور طرح طرح کے مصائب اخلاق کا ارتکاب کر گزرتا ہے جبکہ علم ہی انسان کو صحیح راستہ دکھاتا ہے اور اخلاقی اقدار کو اپناتے ہوئے بہترین معاشرتی زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے۔

---

(۱) جمهرة اللغة، الأزدي، أبو بكر محمد بن الحسن بن دريد، دار العلم للملايين، بيروت، الطبعه الأولى، ۱۹۸۷م، ۲/ ۲۴

(۲) الصحاح (تاج اللغة وصحاح العربية)، ۵/ ۳۴۹

(۳) سورة البقرة: ۲/ ۶۷

چار بنیادی رذائل اخلاق جن پر تمام تر معائب اخلاق کا انحصار ہے کو ذکر کرنے کے بعد اب چند ایسے رذائل اخلاق کو بھی توضیح کی جائے گی جو کہ جزئی حیثیت رکھتے ہیں۔ معاشرے میں ایسے بے شمار معائب افراد کے اندر پائے جاتے ہیں جو کہ روحانی اور مادی دونوں لحاظ سے نقصانات پہنچاتے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

حسد:

حسد کا مادہ حَسد یحسُدُ حَسداً سے ہے بمعنی إذ اتمنى أن تتحوَل إليه نعمته و فضيلته أو يُسلبَهُما هو [1] یعنی کسی کسی شخص کا دوسرے کی نعمت اور فضیلت کو دیکھ کر جلنا، اس کا زوال چاہنا، سلب کرنے کی تمنا کرنا، یا یہ خواہش کرنا کہ یہ نعمت اور خوش حالی دونوں دور ہو کر اسے مل جائیں حسد کہلاتا ہے۔ البتہ اگر کسی دوسرے شخص کے پاس نعمتوں کو دیکھ کر صرف انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرنا بغیر اس تمنا کہ وہ نعمتیں اس سے چھین جائیں رشک کہلاتا ہے جو کہ دینی امور میں مستحسن ہے اسی کو مسابقت بھی کہا جاتا ہے۔ [2] حسد کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ [3]

ترجمہ: یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی اس پر جلے مرتے ہیں۔

عہد نبوی میں مسلمانوں پر جو خاص انعام قرآن و ایمان کی دولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا تھا یہود اس پر حسد کرتے تھے۔ یہود نبی اکرم ﷺ کو حاصل نبوت، بادشاہت اور قائدانہ اقتدار کی بناء پر شرف و منزلت سے حسد کرتے کہ یہ جاہ و جلال بنی اسماعیل کی اولاد کو کیوں حاصل ہے وہ اس شان و شوکت کو مسلمانوں سے چھین کر آل اسرائیل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ [4]

لوگوں کے اندر حسد پیدا ہونے کی مختلف وجوہات ہیں جیسا کہ بغض و عداوت، ذاتی تفاخر، دوسرے کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش اور جاہ و منزلت کے حصول میں کسی کا شریک ہونا سخت گراں گزرتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((لاَ حَسَدَ إِلاَّ فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالاً فَسُلِّطَ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهْوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) [5]

---

(۱) لسان العرب، ۳/۱۴۸

(۲) سیرۃ النبی ﷺ، ص:۳۴۵

(۳) سورۃ النساء، ۴/۵۴

(۴) مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)، ۱۰/۱۰۴

(۵) الجامع الصحیح، کتاب التوحید، باب قول النبی ﷺ (رجل آتاہ اللہ القرآن فھو یقوم بہ۔۔۔)، حدیث نمبر: ۷۰۹۱، ۶/ ۲۷۳۶

ترجمہ: حسد دو شخصوں کے علاوہ کسی پر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن دیا اور وہ اس کو رات و دن تلاوت کرے اور دوسرا وہ جس کو اللہ نے مال دیا ہو وہ رات و دن اسے اس کے حق میں خرچ کرتا ہو۔

ان دو مذکورہ نعمتوں کے علاوہ تمام تر باتوں میں حسد کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا کیونکہ یہ ایسی خطرناک بد اخلاقی ہے جس سے بہت سارے محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک دوسرے کی غم خواری، محبت، اعانت، رحم و شفقت اور خیر خواہی وغیرہ، ایک حاسد کبھی دوسرے کے لیے بھلائی نہیں سوچ سکتا جس کی وجہ سے اخلاقی و معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس سے بچنے کی ہدایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إياكم والحسد فإن الحسد يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب)) [1]

ترجمہ: تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

غیبت:

غیبت کا مادہ **غَاب يغيبُ غيبًا و غيبة** ً سے ہے **أى بعُد، ابتعد مؤقتا و اختفى الشئى فى الشئى** [2] یعنی غائب ہونا، دور ہونا اور ایک چیز کو دوسری چیز میں چھپانا اصطلاحاً اس کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے کہ **أن تذكر أخاك بما يكرهه فإن كان فيه فقد اغتبته وإن لم يكن فيه فقد بهته أى قلت عليه مالم يفعله** [3] یعنی اپنے بھائی کا ذکر اس طرح سے کرنا جسے وہ ناپسند کرے اور وہ بات اس میں فی الواقع پائی جائے تو یہ غیبت ہے اور اگر وہ اس میں نہ پائی جائے تو یہ بہتان ہے یعنی تم نے اس کے بارے میں وہ کہا جو وہ نہیں کرتا۔ شریعت کا مقصد مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانا اور ان کی عزت و اکبر کو محفوظ رکھنا ہے اس لیے ہر اس چیز سے منع کیا گیا جس سے باہمی روابط میں بگاڑ پیدا ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ﴾ [4]

---

(۱) سنن أبي داوٗد، کتاب الأدب، باب فی الحسد، حدیث نمبر: ۴۹۰۳، ۴/ ۲۷۶

(۲) المحکم والمحیط الأعظم، أبو الحسن علی بن اسماعیل، المرسی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۰م، ۶/ ۲۶

(۳) التعریفات، ۱/ ۲۱۰

(۴) سورۃ الحجرات: ۴۹/ ۱۲

ترجمہ: اور نہ ہی تم میں سے کوئی کسی دسرے کی غیبت کرے کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تم تو خود اس کام کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرتے ہو اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں غیبت کو مردار کا گوشت کھانے سے اس لیئے تشبیہ دی ہے کیونکہ جب کسی مردہ بھائی کا گوشت کھایا جارہا ہو تو اس مردار کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا گوشت کھایا جارہا ہے اسی طرح جس شخص کی غیبت کی جارہی ہوتی ہے اسے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ پس پشت اس کی عیب جوئی کی جارہی ہے نیز غیبت کو مردار کے گوشت کھانے کے مترادف قرار دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کس قدر گھناؤنا فعل ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا تو غیبت کس طرح کر سکتا ہے۔[1] غیبت سے لوگوں کے سامنے دوسرے شخص کی عزت و آبرو کو مجروح کیا جارہا ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں پر ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت حرام ہے غیبت کرنے والے کا انجام آخرت میں کیا ہو گا اس بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لما عرج بي مررت بقوم لهم أظفار من نحاس يخمشون وجوههم وصدورهم فقلت من هؤلاء يا جبريل ؟ قال هؤلاء الذين يأكلون لحوم الناس ويقعون في أعراضهم)) [2]

ترجمہ: جب مجھے معراج عطا کی گئی تو اس رات میں ایک قوم پر گزرا ان کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان ناخنوں سے اپنے چہرے اور سینے کھرچ رہے تھے تو میں نے کہا یہ کون لوگ ہیں اے جبریل؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت و آبرو کے درپے رہتے تھے۔

کسی کی عیب جوئی کر کے انسان دوسروں کو اس سے متنفر کرتا ہے جو کہ سخت ناپسندیدہ ہے البتہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں کسی کے احوال بیان کرنے کا مقصد دوسروں کو اس کے شر و فساد سے محفوظ رکھنا اور خیر خواہی ہو تو ایسی صورت میں جائز ہے۔ اسی طرح مظلوم بھی عدل و انصاف کے حصول کے لیئے اپنے ظلم کی داستان سنا سکتا ہے۔ اسلام معاشرے میں محبت و الفت اور آپس کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیئے غیبت، بد گمانی اور مذاق اڑانے جیسی تمام بد اخلاقیوں کی ممانعت کرتا ہے۔

---

(۱) التفسیر المظہری، محمد ثناء اللہ، مکتبہ الرشدیہ، الباکستان، ۱۴۱۲ھ، ۹/۵۴-۵۵

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبۃ، رقم الحدیث:۶۸۷۸، ۴/۲۶۹

جھوٹ:

جھوٹ کے معنی ہیں واقع کے خلاف، دھوکہ، دروغ گوئی کرنا، مکر و فریب اور غلط بات کہنا،[1] اس کے لیے عربی میں کذب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ **الكذب خلاف الصدق و هو الخبر عدم مطابقته للواقع** [2] یعنی ایسی خبر جو اصل واقع سے عدم مطابقت رکھتی ہو یا حقیت کے خلاف ہو جھوٹ کہلاتی ہے۔ جھوٹ کا عکس سچائی ہے۔

جھوٹ اخلاقی ذمیمہ میں سب سے بری عادت ہے جو کہ ہر برائی قولی و عملی کی جڑ ہے جبکہ سچ بولنا تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی صفت رہی ہے، جھوٹ ان کی سنت کے خلاف ہے۔ نبوت کی پہلی صفت ہی سچائی ہے۔ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ کی طرف۔ جھوٹے پر کبھی خدا کی رحمت کا سایہ نہیں ہوتا بلکہ لعنت کی جاتی ہے جو کہ اس قدر سخت ترین لفظ ہے کہ قرآن شیطان کو اس کا مستحق بتاتا ہے اسکے بعد کافر اور پھر منافق لیکن مومن پر کسی فعل کی بنا پر لعنت نہیں کی جاتی سوائے جھوٹ بولنے کی صورت میں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾[3]

ترجمہ: پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

جھوٹ بولنا منافقین کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ اپنے اندر بہت سی برائیوں کو لیئے ہوئے ہے مثلا وعدہ خلافی، امانت میں خیانت، حق جان کر اظہار نہ کرنا اور ریاکاری وغیرہ۔ یہ سب جھوٹ کی قولی و فعلی صورتیں ہیں۔ جھوٹا انسان برائی میں دھنسا ہوا ہوتا ہے اور بے باکی سے برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر چھپالیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاَثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))[4]

ترجمہ: منافق کی علامتیں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔

اسلام ہر طرح کے جھوٹ کی ممانعت کرتا ہے چاہے وہ بچوں کو بہلانے کے لیے بولا جائے کیونکہ اس سے ان کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑتا ہے، یا مذاق میں دوسروں کو ہنسانے کے لیے بولا جائے جیسا کہ لوگ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں مانتے جبکہ

---

(۱) نور اللغات، ۲/۴۷۱

(۲) مجمل اللغۃ، أحمد بن فارس بن زکریا، أبو الحسین، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۸۶م، ۱/۷۸۱

(۳) سورۃ آل عمران: ۳/۶۱

(۴) الجامع الصحیح، کتاب الشھادت، باب من امر بإنجاز الوعد، حدیث نمبر: ۲۵۳۶، ۲/۹۵۲

ایسے شخص کے لیے ہلاکت ہے جو خوش گپی کے وقت لطف اندوز ہونے کے لیے جھوٹ بولے۔ لہٰذا جھوٹ چاہے نقصان دے یا نہ دے ہر طرح سے جھوٹ جھوٹ ہی رہے گا جس کی اسلام میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ بلا تحقیق دوسرے تک بات پہنچانا بھی جھوٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ اسلام کا مقصد ایک باوقار اور پر اعتماد شخصیت کی تعمیر ہے معاشرے میں باعزت و پر وقار مقام حاصل کرنے کے لیے اسلام جھوٹ اور اس جیسی دسری بد اخلاقیوں سے منع کرتا ہے۔ سچ بولنے سے انسان قابل اعتماد جانا جاتا ہے اور لوگوں کے درمیان عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

بغض و کینہ:

البغض ضد الحب بغضَ بُغضًا أی صار بغیضاً و عدواً [1] یعنی بغض محبت کا الٹ ہے اس کے معنی نفرت کرنا، ناپسند کرنا، بغض اور انتہائی دشمنی کے ہیں۔

اسلام کا منشاء ہمیشہ مسلمانوں میں محبت و الفت، اخوت اور بھائی چارے کے جذبات پیدا کرنا ہے تاکہ وہ دنیا میں رہ کر جنت کی سی زندگی بسر کریں بغیر ایک دوسرے کے لیئے بغض و کینہ رکھتے ہوئے۔ بغض ایک ایسا جذبہ ہے جو دیرپا دلوں میں دشمنی و عداوت ڈالی رکھتا ہے جبکہ جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے ان کے دلوں میں بغض و کینہ نہ ہوگا بلکہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ﴾ [2]

ترجمہ: اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے دلوں میں ہوگا (ایک دوسرے کی طرف سے) کوئی میل اور ان کے بالاخانوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

اہل ایمان بھی انسان ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں باہمی معاملات میں ایک دوسرے کے لیے شکوے ہو سکتے ہیں۔ ان کے درمیان کسی بات میں ملال یا رنجش پیدا ہونا فطری چیز ہے۔ مگر ایسی صورت میں تعلیمات نبوی کے مطابق ایک مسلمان بھائی کو دوسرے بھائی سے تین دن سے زیادہ عداوت و بغض نہیں رکھنا چاہیے۔ تین دن اگر گزر جائیں تو آپس میں ملنا چاہیے اور سلام میں پہل کرنا چاہیے کیونکہ اللہ بھی کینہ رکھنے والے دو آدمیوں کے اعمال کو لوٹا دیتا ہے اور اس وقت تک ان کے گناہوں کی بخشش نہیں دیتا جب تک کہ وہ آپس میں میل نہ کر لیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ، ۳/۱۰۶۶

(۲) سورۃ الأعراف: ۷/۴۳

((لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُهَاجِرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ)) [1]

ترجمہ: اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور نہ پیٹھ پھیرو بلکہ ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے۔

اسلام نے مسلمانوں پر ایک دوسرے کے حقوق عائد کیے ہیں جب تک دو آدمیوں میں کینہ رہے گا وہ کبھی ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکتے جبکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ہی میں جنت کی کنجی ہے۔

غرض یہ کہ اخلاق رذیلہ کردار کے ایسے حیوانی مظاہر ہیں جو انسان کو مفاد پرستی اور پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو معاشرہ تعیش پسند اور بد کرداری کا شکار ہو جاتا ہے، جس سے ایک غیر مہذب معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اسلام ایک ایسا انقلابی مذہب ہے جس نے نہ صرف اخلاق رذیلہ کی روک تھام کی بلکہ اخلاق فاضلہ کی پرورش کا بھی اہتمام کیا۔ اسلام نے ہر انسان کے اندر خدا پرستی اور یوم آخرت میں جوابدہی کا احساس جگایا اور یہی احساس ہر فرد کے ضمیر کو برائی کے ارتکاب سے روکی رکھتا ہے اور سیدھے راستے پر گامزن رکھتا ہے۔ اسلام نے مسلمانوں پر ایک دوسرے کے لیے حقوق و فرائض عائد کیے تاکہ وہ باہم تعاون و محبت سے ایک مضبوط عمارت کی طرح اجتماعی زندگی بسر کریں۔ نیکی وبدی میں ایک دوسرے کی خبر گیری رکھیں۔ اچھائی کو ابھارنے اور برائی کو روکنے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں تاکہ ایسا انقلابی معاشرہ قائم ہو جس میں اخلاقی قدروں کو فروغ دیا جائے اور معروفات و منکرات کا اہتمام کیا جائے۔

---

(۱) موطأ، امام مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المھاجرہ، حدیث نمبر: ۱۴۱۱، ۵/۳۹۵

فصل چہارم

اخلاق کا دائرہ کار

فصل چہارم:

اخلاق کا دائرہ کار

موجودہ دور میں اخلاق کے مقابلے میں تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل کو ترجیح دی جارہی ہے، جس کے نتیجہ میں ان مسائل کا الجھاؤ مزید بڑھتا جارہا ہے اور دنیا میں بدامنی اور فتنہ و فساد کا ماحول برپا ہو رہا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے لوگوں کو اصل مسئلے کی نوعیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ تمام مسائل کسی ایک بنیادی مسئلہ کی شاخیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے کلی اور بنیادی مسئلہ جس کا تعلق اخلاقی اقدار سے ہے، اس پر روشنی ڈالی جائے اور پھر اس کی شاخوں تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل کو مد نظر رکھا جائے۔ تبھی گردوپیش کے مسائل کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور امن وسکون کی فضا ہموار ہو سکتی ہے۔ اخلاق کا دائرہ کار انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ چنانچہ اس فصل میں سب سے پہلے علم اخلاق کا مختصر اتعارف اور پھر اس کا دوسرے علوم وشعبہ جات سے تعلق واضح کیا جائے گا۔

علم اخلاق سے متعلقہ اہم نکات:

علمِ اخلاق کا تعلق انسان کے کردار کی حقیقی غایتوں سے ہے۔ غایت سے مراد وہ مقصد یا خواہش ہوتی ہے جس کی خاطر فعل کیا جاتا ہے۔ اخلاقیات ایسے اصولوں کو دریافت کرتی ہے جس سے انسان کے کردار کی ایسی غایتوں کا تعین کیا جاسکے جن سے خیر حاصل ہو۔ گویا علمِ اخلاق کا انحصار جہاں کردار و عمل پر ہے وہاں عمل کے پیچھے اغراض و مقاصد کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کرنا بھی ضروری ہے۔ اخلاقیات کا موضوع خیر و شر میں امتیاز واضح کرنا اور ایسی غایتوں کی تلاش کرنا ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے مفید ہوں۔

ا۔ علمِ اخلاق کا موضوع جماعت ہے، اجتماعی زندگی ہی میں فرد کا تحقق ممکن ہے۔ جس طرح حیوانی جسم کے اعضاء باہم ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں، اسی طرح معاشرے کے افراد بھی ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور محتاج ہوتے ہیں۔ ایک فرد کی زندگی جماعت کے ایک جز کی حیثیت سے منسوب ہے۔

کسی بھی انسان کا نصب العین صرف بنی نوع انسان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اجتماعی زندگی کا بھی پابند ہے۔ اسی لیے اخلاقیات کا مقصد جماعت کی فلاح و اصلاح ہے کیونکہ اسی میں افراد کے مفاد و مصالح مضمر ہیں۔

۲۔ کسی بھی قوم کا نظامِ اخلاق، اس قوم کی جائے وقوع، آب وہوا اور دوسری قوموں سے تعلقات پر منحصر ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کی فطرت پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ جماعت کے اندر رائج رسوم و رواج، عقائد، قوانین اور عادات کی مجموعی کیفیت کو نظامِ اخلاق کہا جاتا ہے۔[۱]

۳۔ علمِ اخلاق اچھائی اور برائی میں امتیاز کو واضح کرتا ہے۔ کسی بھی عمل کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار اس سے حاصل شدہ نتائج پر ہوتا ہے۔ نیز وہ غایتیں جن کا حصول کسی فعل کو عمداً کرنے کے لیے مقصود ہوتا ہے، خیر وشر کے معیارات کو متعین کرتی ہیں۔ راہِ راست پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خیر کا علم ہو کیونکہ خیر کا علم ہی صحیح عمل کا محرک ہوتا ہے۔ مگر صرف علم وہ ذہنی وجسمانی قوت مہیا نہیں کر سکتا جو کسی عمل کو نتیجہ تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان میں پہلے سے ضبطِ نفس کی عادت ہو اور نیک ہو۔ مزید برآں تجربہ ایسی چیز ہے کہ جو نیکی میں لطف اور برائی سے تکلیف دے سکتا ہے۔[۲] لہٰذا کردار کو منضبط کرنے کے لیے کسی پابندی یا جبر کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ خیر کا علم اور تجربہ ومشق دونوں انسانی کردار میں نیکی کی عادت ڈال دیتے ہیں۔

۴۔ اخلاقی قدروں کو تسلیم کرنے اور عملاً اپنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے جذبات وخواہشات پر قابو پائے اور اپنے نفس کی تربیت و تنظیم کرے کیونکہ نظریہ اسلام کے تحت نیکی کا علم ہونے کے باوجود، انسان کا خواہشات پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے وہ برائی پر گامزن ہوتا ہے اور خواہشات کا غلام انسان ترکِ عبادات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾[۳]

ترجمہ: ان کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشات پر چلنے لگے، پس انہیں عنقریب گمراہی کی سزا ملے گی۔

چنانچہ نیکی پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ انسان جذبات وخواہشات کی تربیت اور ضبطِ نفس پر قادر ہو، تبھی وہ آزادئ رائے سے بغیر کسی بیرونی دباؤ کے نیکی کی راہ اختیار کرے گا جو کہ طویل مدت تک کار آمد رہیں گے۔

---

(۱) اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ، ابوالاعلیٰ مودودی، الاخوان پبلیکیشنز کراچی، اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۹۸۰ء، ص: ۳۱-۳۲

(۲) تاریخ اخلاقیات، ص: ۱۲-۱۴

(۳) سورۃ مریم: ۱۹/ ۵۹

علمِ اخلاق جس کو فلسفہ [۱] کی ایک شاخ کہا جاتا ہے، اس کی تعریف بیان کرنے کے بعد، علمِ اخلاق کا دوسرے علوم سے تعلق کیا کیا ہے اس کی وضاحت کی جائے گی۔

علمِ اخلاق اور علم النفس کا تعلق:

علم النفس کی تعریف: لغوی اعتبار سے نفس کا معنیٰ روح، جان، حقیقتِ شے، ذات، جاندار اور انسان کے ہیں۔ [۲]
اصطلاحاً علم النفس کو "انسان کے تحت الشعور اور لاشعور کی تحقیق کا علم" کہا جاتا ہے۔ [۳] اس کی تعریف اس طرح سے بھی کی گئی ہے کہ "یہ وہ علم جو انسان اور جانداروں کے نفس، من یا وجودِ ذہنی سے تعلق رکھتا ہے۔" [۴]

علم النفس اور اخلاقیات:

۱. علم النفس کا تعلق ان ذہنی کیفیات سے ہے جن کے ملاپ سے انسانی رویہ جنم لیتا ہے۔ اس طرح علم الاخلاق، علم النفس کو اپنے اندر سمو کر انسانی رویے کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کا نام ہے۔ علمِ اخلاق کو طبعی، سائنس کا نام بھی دیا جاتا ہے کیونکہ یہ انسانی رویے کے لیے اعلیٰ اخلاقی قدروں کے معیارات کا تعین کرتا ہے۔ اس کے برعکس علم النفس کو اس لحاظ سے فرق نہیں پڑتا کہ موضوع تحقیق کردار کے لحاظ سے صوفی اور ولی ہے یا جرائم پیشہ آدمی۔ جبکہ اخلاقیات میں صوفی یا ولی ہونے کا اعزاز اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی قدروں کا مظاہرہ کرتا ہے [۵]۔

۲. اخلاقی اقدار کو تسلیم کرنے اور عملی ڈھانچہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ تربیتِ نفس کی جائے اور اپنے جذبات و خواہشات پر قابو پایا جائے۔ نفس کی غلامی کرنے والا انسان کسی اخلاقی نصب العین کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اسے خواہشات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں گمراہی کا بنیادی سبب نفس کی غلامی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اخلاقی منازل کو عملاً طے کرنے کے لیے تربیتِ نفس اوّلین شرط ہے اور عبادت نفس پر قابو پانے کا موثر ذریعہ ہے۔

---

(۱) فلسفہ کا موضوع بحث خدا، فطرت اور انسان ہے، اس لیئے اس کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے الٰہیات، طبعیات اور انسانیات۔ انسانیات کی مزید قسم فلسفۂ اخلاق ہے، جس میں انسانی اعمال و افعال کے اصولوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔

(۲) مہذب اللغات، مہذب لکھنوی، انجمن محافظ اردو بک ڈپو، نیا محل، منصور نگر لکھنؤ، ص:۲۶۸

(۳) فیروز اللغات، ص:۱۲۲۰

(۴) فرہنگِ تلفظ، ص:۹۳۹

(۵) قرآن مجید کا نظریۂ اخلاق، بشیر احمد ڈار،، اسلامک بک سروس، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۱۵-۱۶

۳. اخلاقیات اور نفسیات کے نقطہ نظر سے کسی بھی انسان کا اجتماعی زندگی کے بغیر خالص انفرادی زندگی میں تحقق ممکن نہیں ہے۔ جماعت سے الگ ہو کر افراد کی مستقل بالذات کوئی ہستی نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی کے نصب العین کا حصول بغیر اجتماعی اعانت کے ممکن نہیں۔ چنانچہ علمِ اخلاق اور علم النفس دونوں کا بنیادی موضوعِ بحث جماعت سے متعلق ہے اور افراد کی حیثیت جماعت کے اجزاء ہونے کے اعتبار سے ہے۔

دورِ حاضر میں علم النفس کی ایک اور شاخ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جو کہ نظمِ اجتماعی پر گزرے ادوار اور اقوام کے رسوم وعادات سے بحث کرتی ہے اور ذہن وافکار میں علم النفس کے اجتماعی رخ کی ترغیب دیتی ہے۔ علم النفس کی اس قسم کو علم النفس الاجتماعی کہا جاتا ہے۔ یہ علم، علمِ اخلاق پر علم النفس شخصی کی نسبت زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔[۱]

ان تمام مذکورہ نکات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم النفس اور اخلاقیات میں گہرا ربط و تعلق ہے۔ علم النفس کا موضوع بحث آزادیٔ ارادہ، شعور، فکر وخیال، قوت ادراک، احساس اور لذت والم ہے اور علمِ اخلاق بھی ان تمام موضوعات سے مستغنی نہیں۔ علمِ اخلاق کا بنیادی تعلق انسانی کردار اور رویہ سے ہے اور اخلاقی قدروں کو عملاً انسانی کردار میں ڈھالنے کے لیے اوّلین شرط تربیتِ نفس ہے۔ خواہشات وجذبات پر قابو پائے بغیر اخلاقی قدروں کو تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ نیز علم النفس اور اخلاقیات دونوں علوم انسان کو جماعت کے ایک عضو کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر سے جماعت کے بغیر انسان کی مستقل بالذات کوئی ہستی نہیں۔ انسان اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جماعت کا محتاج ہے۔ چنانچہ علم النفس اور علمِ اخلاق ایک دوسرے پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔

علمِ اخلاق اور علمِ قانون کا تعلق:

قانون کے معنیٰ:

لغوی طور پر قانون کے معنیٰ بنیاد، آئین، رسم و رواج، دستور اور طریقہ و ڈھنگ کے ہیں۔ قانون کی جمع قوانین ہے۔[۲] اصطلاحاً قانون احکام و نواہی کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔[۳] یہ ایسے قواعد کا ایک عام مجموعہ ہے جو کہ کسی جماعتِ انتظامی کے حکام، اس سوسائٹی کے ارکان کے لیے جاری کرتے ہیں اور جن احکام کی عموماً متابعت کی جاتی ہے۔ اس سے مراد فقط وہ قانون ہوتا ہے جس کو کوئی حاکم کسی جماعت انتظامی کے لیے وضع کرتا ہے۔[۴]

---

(۱) اخلاق اور فلسفۂ اخلاق، حفظ الرحمان سیوہاروی، مکتبہ رحمانیہ، خالد مقبول پبلیشرز، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۶ء، ص:۱۱

(۲) فیروز اللغات، ص:۸۸۱

(۳) فرہنگ تلفظ، ص:۳۹۷

(۴) اسلام کا نظامِ قانون، معین الدین احمد، لاء پبلیکیشنز سیریز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۴ء، ص:۲۳

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قانون اقوام عالم میں رائج عقائد، عادات و رسومات اور اعمال کا مخلوط مجموعہ ہے۔ کسی بھی مقنّن کے لیے قانون بناتے وقت ملک میں رائج احکام اور رسم و رواج پر نظر ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ ترمیم و اصلاح کے مرحلے سے گزرتے ہوئے موجودہ تقاضوں کے مطابق قوانین کی مزید نشوونما کی جاسکے۔ علمِ اخلاق کا دار مدار بھی انسان کے معاملاتِ زندگی اور اعمال سے ہے۔ قانون انہی اوامر و نواہی کا نفاذ کرتا ہے جن کا انسانی زندگی میں اخلاقی اعتبار سے تقاضا کیا جاتا ہے۔

اسلامی نظامِ قانون کا تعارف:

دنیا کے تمام نظامِ قوانین میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب قانون اسلامی نظام قانون کو مانا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے ابتداء ہی سے نبیوں کے ذریعے شرائع کے نزول کا سلسلہ جاری رکھا تاکہ انسانوں کی دینی، مدنی، اجتماعی اور زندگی کے ہر پہلو پر رہنمائی ہوتی رہے اور وہ فلاح و بہبود کی راہ پر گامزن رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ قانون کو مکمل ضابطہ حیات کہا جاتا ہے۔

اسلامی نظامِ قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ اصولوں پر مبنی ہے جو کہ قرآن مجید کی صورت میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (۱)

ترجمہ: فرمانروائی کا اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔

قرآن مجید میں مذکور اصول و احکام کی تشریح نبی کریم ﷺ نے کی۔ آپ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے بہترین عملی نمونہ ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى﴾ (۲)

ترجمہ: اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں

اسلام ایسا عالمگیر مذہب ہے کہ جو ہر دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور حدیث نبوی سے متعلقہ احکام محدود ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اور مسائل تو غیر متناہی ہیں۔ چنانچہ فقہاء کے نزدیک اگر کسی مسئلے میں نص موجود نہ ہو تو شارع کی منشاء کے مطابق، بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کے ذریعے قانون بنایا جاسکتا ہے۔

---

(۱) سورۃ یوسف: ۱۲/۴۰

(۲) سورۃ النجم: ۵۳/۳

اسلام ایک ایسا دین ہے جو کہ بدلتے حالات کے تقاضوں کے لیے اپنے اندر بہت وسعت اور لچک رکھتا ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ احکام بھی بدل جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ جدید تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے، غیر منصوص مسائل میں اجتہاد، استنباط اور قیاس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ البتہ اجتہاد بھی دو حقیقی ماخذ قرآن و سنت اور ائمہ کے بنائے ہوئے ضوابط و طریقہ کار کے مطابق کیا جائے گا۔ نیز اجتہاد سے اخذ کردہ احکام کا نفاذ جب حکومتی سطح پر کیا جائے گا تو وہ قانون کہلائے گا۔

اسلامی قانون سازی کی یہ خصوصیات ہیں کہ معاشرے میں احکام کے نفاذ میں ہمیشہ آسانی اور سہولت کو ملحوظِ خاطر رکھا، تنگی و دشواری سے ہٹ کر قلتِ تکلیف کو ترجیح دی گئی۔[1]

انسانی فطرت اور معاشرے کی تربیت کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے، بتدریج احکام کا نفاذ کیا گیا تاکہ وہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہوں اور معاشرے کی اصلاح ہو سکے۔ اسلامی نظام قانون اپنے اندر لچک و وسعت کی بناء پر ہر دور کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ گزرے ادوار میں حالات کے مطابق بعض احکام کو منسوخ اور بعض کو نافذ کیا جاتا رہا۔ موجودہ دور میں حکومتی سطح پر قانون سازی کے وقت اگر ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شرعی قوانین کا اطلاق زندگی کے ہر گوشے میں کیا جا سکتا ہے۔

علم اخلاق اور علمِ قانون:

قانون اور اخلاق دونوں کا مقصد اجتماعی فائدہ کو پیشِ نظر رکھنا ہے، جس کے لیے معاشرے میں بسنے والے افراد کے حقوق و فرائض کی تنظیم اور تربیت کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ قانون کی مدد سے معاشرے میں حکومتی سطح پر حقوق و فرائض کی تعیین کی جاتی ہے۔ ہر حق کا حصول اپنے ساتھ ایک فرض کو عائد کرتا ہے۔ مگر قانون جن حقوق کو معین کرتا ہے لوگ صرف انہی کو اپنا اخلاقی فریضہ تصور کر لیتے ہیں اور بہت سے ایسے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں جو قانون کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔

چنانچہ اخلاق کا دائرہ کار قانون سے وسیع تر ہے علمِ اخلاق کو یہ دسترس حاصل ہے کہ وہ ہر نفع بخش چیز کا حکم دے اور ہر مضر شے سے روکے جبکہ قانون صرف ان اوامر و نواہی کا نفاذ کرتا ہے جن کے بجانہ لانے پر وہ سزا دے سکے۔ لہٰذا قتل اور چوری کے مرتکب قانونی لحاظ سے سزا کے مستحق ٹھہرائے جائیں گے مگر جھوٹ، کفرانِ نعمت، حسد اور خیانت کرنے والے پر قانون مداخلت نہیں کر سکتا بلکہ اخلاقی سطح پر اس کی ممانعت کی جائے گی۔

---

(۱) الاشباہ والنظائر، جلال الدین سیوطی، عبد الرحمان بن ابی بکر، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۰م، ۱/۷۶

علمِ اخلاق اور قانون میں ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ قانون کا تعلق صرف اعمالِ خارجیہ سے ہے جبکہ علم اخلاق خارجی اعمال کے ساتھ ساتھ باطنی سوچ و ارادہ پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ مثلاً زمین کی ملکیت کا حق قانون ذریعے دیا جائے گا مگر اس ملکیت کو دوسروں کے مصالح و بھلائی کے لیے استعمال کرنے کی سوچ و فکر صرف علم اخلاق کی حد میں داخل ہے۔[1]

دنیا میں فتنہ و فساد کے خاتمے اور امن و سکون کی بحالی کے لیے قانون اور اخلاق دونوں اپنی جگہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں کا ایک ہی مقصد ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ قانون کے ذریعے عدل وانصاف کا قیام اور برائی کا انسداد تو کیا جاسکتا ہے لیکن برائی سے دل میں نفرت کی وہ باطنی کیفیت نہیں پیدا کی جاسکتی۔ اسی طرح اخلاقی اقدار کو عملاً اپنانے کے لیے کسی شخص کو زبردستی مجبور نہیں کیا جاسکتا جس کی وجہ سے برائیوں کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام مکمل طور پر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے۔ شریعتِ محمدی ﷺ ایک ایسی شریعت ہے جس نے اخلاق اور قانون دونوں کو اس خوبی سے اکٹھا کیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ الگ حیثیت دی۔ وہ برائیاں جو اجتماعی اثرات رکھتی ہیں ان کو قانون کے دائرہ میں رکھتے ہوئے حکومتی سطح پر سزائیں مقرر کیں مثلاً تہمت لگانا، زنا، چوری وغیرہ۔ اور جن باتوں کا تعلق انفرادی طور پر انسان کے نفس سے ہے انہیں اخلاق کے دائرے میں رکھا۔ مثلاً سچ بولنا، محتاجوں کی مدد کرنا، احسان، امانتوں کا خیال رکھنا وغیرہ۔

باقی شریعتوں کو دیکھا جائے تو تورات جس نے اخلاق کو بھی قانون میں ڈھالتے ہوئے عادلانہ انتقام پر زور دیا اور انجیل جس نے قانون کو اخلاق کی شکل دیتے ہوئے عفو و درگزر پر زور دیا۔ جبکہ حضور نبی مکرم ﷺ ایسی کامل شریعت لائے جو کہ قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔ اسلام قانوناً تورات کے حکم کے مطابق مظلوم کو بدلہ لینے کا اختیار بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقاً انجیل کے حکم کے مطابق معاف کر دینے کا حق بھی رکھا گیا ہے۔[2] یعنی یہ ایسا دین ہے جو انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے قانون ور اخلاق، تورات اور انجیل، انتقام اور عفو و درگزر دونوں کو یکجا کرتا ہے۔ اسی سے عادلانہ نظام حکومت اور اخلاقی روحانیت کی تکمیل ممکن ہے۔

علمِ اخلاق اور عمرانیات:

عمرانیات سے مراد انسانی معاشرہ، اجتماع اور آبادی ہے۔ انسان فطرتاً معاشرتی زندگی کا عادی ہے۔ انسان کو اپنے دفاع اور بچاؤ کے لیے ہمیشہ معاشرے کی ضرورت رہی ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد معاشرے کے بغیر ممکن نہیں۔ مذہب، تعلیم اور تربیت، غرض زندگی کے ہر پہلو میں انسان دوسرے کا محتاج ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں بھی عمرانی زندگی کو

---

(۱) اخلاق اور فلسفۂ اخلاق، ص: ۱۲-۱۳

(۲) سیرۃ النبی ﷺ، سید سلیمان ندوی، دینی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۵ء، ۶/ ۹۵-۹۶

بہت اہمیت دی گئی، بہتر معاشرت کے لیے ایک ضابطہ حیات دیا گیا اور انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا۔ لہذا عمرانیات کا تعلق معاشرے سے ہے نہ کہ فرد سے اور اجتماعی زندگی ہی میں انسان کی بقاء ہے۔

عمرانیات کی لغوی واصطلاحی تعریف اس طرح سے کی جاتی ہے:

عمرانیات کی تعریف:

عَمِرَ، یَعمُرُویَعمِرُوعمره الله البقاء: عموراوعمارةوعمرانا[۱] بمغی المدن والقری ومایلحق بهامن[۲]

ترجمہ: عمر یعمر بمعنیٰ آبادی کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عمرہ اللہ البقاہ یعنی اللہ نے اسے بقاء دی۔ اسی طرح عمارت اور عمران بھی آبادی، مجتمع، مدن یا معاشرہ کے معنیٰ میں ہے۔

لفظِ عمرانی کا تعلق انسانی آبادی اور سوسائٹی سے ہے اور عمرانیات لوگوں کے رہن سہن کے اصولوں کے علم کو کہا جاتا ہے۔[۳]

لہذا عمرانیات، معاشرت، رہن سہن کے طور طریقے، معاشرتی اداروں کے باہمی روابط کا علم ہے۔ اس لیے اصطلاحاً معاشرے کی تعریف مختلف ماہرینِ عمرانیات نے اپنے اپنے الفاظ میں کی ہے جن میں سے **ایف۔ ایچ گڈنگز F.H.GIODINS**[۴] کے نزدیک:

"معاشرہ یا سماج ایک جیسے خیالات رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے۔ جو ہم خیالی کو پسند کریں اور اس بناء پر مشترکہ مفادات کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں"۔[۵]

---

(۱) المخصص، ابوالحسن علی بن اسماعیل، ابن سیدہ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۷م، ۱/۱۸۰

(۲) معجم لغۃ الفقہاء، حامد صادق، محمد رواس قلعجی، دار النفائس، ۱۹۸۸م، ۱/۳۲۱

(۳) فیروز اللغات، ص: ۹۰۴

(4) Franklin Henry Giddings was an American sociologist and theorist, born in 1855. He transformed American sociology from philosophical idea to a research science. He believed that emotion has played a vital role in development of society and give idea of "consciousness of kind"(www.asanet.org).

(۵) اسلام کا عمرانی نظام، غلام رسول، علم عرفان پبلیشرز، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۴۴

رالف لنٹن [1] معاشرہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"معاشرہ لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو کافی عرصے تک اکٹھا رہا ہو اور زندگی گزارتا ہو۔ اس حد تک کہ اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظم کر لیا ہو۔"[2]

ان تعریفات کے پیشِ نظر معاشرہ میں مختلف لوگ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کے ساتھ لمبے عرصے تک رہتے ہیں۔ ایک معاشرے کے لوگوں میں مشترک ثقافت پائی جاتی ہے اور مشترکہ مفادات کے لیے وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان میں وحدت اور یکجہتی کی فضا نظر آتی ہے۔

انسان مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، یہ خصوصاً مادی ضروریات، لباس اور خوراک وغیرہ کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ ہر انسان اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے، اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے باہمی تعاون سے متحد ہو کر معاشرے میں نشوونما پاتا ہے۔ اس طرح انسانوں میں ایک دوسرے کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جس پر دینِ اسلام نے بہت زور دیا اور اس سے معاشرے میں امن وسکون کی فضا قائم ہوتی ہے۔

عمرانیات کا تاریخی ارتقاء:

عمرانی علم یا معاشرتی زندگی پر گزشتہ صدیوں میں، مذہبی وغیر مذہبی تہذیبوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ مگر اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے معاشرتی زندگی کے استحکام وزوال کے متعلق الہامی آراء کا اظہار کیا۔ لیکن پھر بھی علم المعاشرت ایک باقاعدہ علم کے طور پر مسلمانوں کے ہاں مرتب نہیں ہو سکا۔

مسلم مؤرخین و فلاسفہ نے علم المعاشرت سے متعلق بحثیں کی ہیں، جن میں سب سے پہلے مفکر ابن خلدون ہیں۔ سترہویں صدی کی یہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے علم العمران کی اصطلاح استعمال کی۔ جس کو بعد میں sociology کے نام سے متعارف کروایا گیا۔ ابن خلدون نے اپنی مشہور کتاب 'کتاب العبر' کے مقدمہ میں معاشرتی ارتقاء، تنظیم، دیہی و شہری معاشروں کے تعلقات اور عصبیت سے متعلق بحثیں کیں۔ ان کے نظریات کو عمرانی علم میں اولین حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ سوشیالوجی کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی۔

---

(1) Ralph Linton an American anthropologist, born in 1893,U.S.A. He gives very influential theories in anthropology and sociology. He is particularly known for his texts "The study of man" and "The Tree of culture". He developed new conception of human behavior which can be utilized to analyze the cultural changes(www.britannica.com).

(۲) اسلام کا عمرانی نظام، ص:۲۲

دوسری اہم شخصیت شاہ ولی اللہ ہیں جنہوں نے معاشرتی ادارت اور سیاسی و عمرانی طور پر بحثیں کیں۔ مسلمانوں کی ان کوششوں کے باوجود عمرانیات بطورِ علم مرتب نہ ہو سکا۔ یہ علم اٹھارویں صدی کے پیش آمدہ معاشرتی حالات کے تحت متعارف ہوا۔ اور انیسویں صدی میں باقاعدہ علم المعاشرت نے نشو نما و ارتقاء کی منازل طے کیں جس کے نتیجہ میں مغربی علم المعاشرت ایک منظم علم کے طور پر آج پایا جاتا ہے۔ اس علم کو پروان چڑھانے میں کارل مارکس (۱) اگست کومٹے (۲)

---

(۱) کارل مارکس: ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کی کتاب (DAS KAPITAL) ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی جس میں اس نے دولت کی منصفانہ تقسیم پر زور دیا۔ کارل ماکس سرمایہ دار نظام کے سخت خلاف تھا۔ اس کی نظر میں دولت محنت کا نتیجہ ہے اور محنت مزدور طبقہ کرتا ہے جبکہ انہیں اجرت صرف گزراوقات کے لیے ملتی ہے اور باقی ساری دولت امیروں کے پاس چلی جاتی ہے۔ اس طرح دونوں طبقے ایک وہ جو محنت کر کے دولت پیدا کرتا ہے پرولتاری طبقہ اور دوسرا جس کے ہاتھوں میں دولت مرکوز رہتی ہے بوژرواطبقہ باہمی جنگ میں مبتلا رہتے ہیں، کارل مارکس کے نظریات کے نتیجے میں سرمایہ داری کا خاتمہ اور اشتراکی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کے مطابق ملک کے تمام وسائل پر سب کا مشترکہ حق ہونا چاہیے۔ اشتراکیت کے اصول کے مطابق افراد معاشرے کے مشترکہ مفاد کے لیے جس قدر خدمات انجام دیں گے انہیں اتنا ہی معاوضہ ملے گا۔ کارل مارکس کا مظاہرہ انقلابِ روس کی صورت میں رونما ہوا۔ کارل مارکس نے ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ (معاشیات اسلام، ص: ۲۰-۲۱)

(2) August comte was born on 1798, a French philosopher, founder of positivism, a philosophical movement. In modern era he can be called as the first philosopher of science. He takes study of sociology to the scientific dimensions other than the philosophical approaches. His aim is to apply scientific method for understanding a human society. He was died in 1857.(Sociology,John.J. Macionis, Neelab printers, Gawalmandi Rawalpindi, 2nd edition P:12)

(آگسٹ کامٹے ایک فرانسیسی فلسفی ۱۷۹۸ میں پیدا ہوا۔ اس کو سائنس کا پہلا فلسفی بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہی ہے جس نے علم معاشرت کو فلسفے سے ہٹ کر سائنسی حدود پر لایا۔ اس کا مقصد انسانی معاشرتی زندگی کو سمجھنے کے لیئے سائنسی طریقہ کار کو استعمال میں لانا ہے۔ ۱۸۵۷ میں آگسٹ کامٹے وفات پا گیا)۔

میکس ویبر [1] اور درخائیم [2] کی کاوشیں کارفرما ہیں۔ مگر ان تمام مغربی مفکّرین کی کاوشین مسلم علمی روایت کے مرہون منت ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہین مغربی مفکرین نے مسلمانوں کے علمی ورثے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو نظر انداز کیا۔ جدید مغربی معاشرت کے نظریات خدا سے بیزاری، مادہ پرستانہ اور مفادات واغراض پر منحصر ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ

---

(1) Max weber was born in 1864 in Germany, has an outstanding work in sociology, rationality and determining religion legitimation. According to Max weber, human actions are not just phenomenal objects that one can apply research methods used in natural sciences but are feeding, thinking and purposive beings, which are rational and predictable. He believes that religious action is a particular type of social action. A man motivated towards religion for a hope of good life in world.(The interpretation of social reality, J.E.T.ELDRIDGE, Max weber. Thomas Nelson and sons ltd, Park street London,1971,p:4-5)

(میکس ویبر ۱۸۶۴ میں جرمنی میں پیدا ہوا، اس نے علم معاشرت، مذہب کی قانونی حیثیت اور عقلیت سے متعلقہ موضوعات میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کے نزدیک انسان کے اعمال وحرکات غیر معمولی اشیاء کی سی حیثیت نہیں رکھتے کہ جن پر سائنسی وتحقیقی طریقہ کار کا اطلاق کیا جائے بلکہ یہ اپنے پہلو میں خاص مقاصد اور احساسات رکھے ہوئے ہیں۔ میکس اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مذہبی احکام کو انسان کی معاشرتی زندگی میں لاگو کیا جاسکتا ہے اور دنیا میں اچھی زندگی گزارنے کے لیئے انسان مذہب کی جانب محرک رہتا ہے)۔

(2) Emile Durkheim was born in france at 1858. His great works are " The Division of Labor in Society", "The Rules of sociological method and suicide" and "The Elementary forms of the Religious life". Durkheim viewed society as an integrated unity which is bound by the ties of ideas and social unity. He believes that the nature of society is unchanged although it undergoes through fundamental structural changes from primitive to modern society. According to the social change world and religious representations can adjust. Durkheim sees religion a presupposition for society. He was died in 1971.(An introduction to the sociology of religion,lnger Furseth, A shgate publishing company, cherry street, Burlington, USA,p:32-34)

(درخائیم ۱۸۵۸ میں فرانس میں پیدا ہوا۔ اس کے نزدیک معاشرے کی اصل فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی اگرچہ یہ زمانے کے قدیم وجدید ادوار کے مختلف مراحل سے گزر رہا ہو۔ درخائیم معاشرے کے لیئے مذہب کو ایک مفروضہ اول کے طور پر دیکھتا ہے، اس کے اہم کام مذہبی زندگی کی ابتدائی شکلیں، معاشرے میں مزدوری ومشقت کی تقسیم اور معاشرتی طریقوں کے قوانین اور خودکشی ہیں۔ ۱۹۷۱ میں درخائیم دنیافانی سے کوچ کرگیا)۔

مسلسل بحران کا شکار ہے۔ البتہ قرآنی اصطلاح میں معاشرہ صرف ایک اصول اخلاق(Moral sociology)پر قائم ہے۔ مسلمان علماء نے معاشرتی مطالعہ میں اخلاقی اصولوں کو ہمیشہ قابلِ ذکر رکھا۔[1]

اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیات

اسلامی معاشرہ ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں پائی جاتیں۔ اسلامی معاشرے میں ایمان کے ساتھ ساتھ اخلاق پر بھی زور دیا گیا۔ ایسا ایمان جو اخلاقی اقدار سے خالی ہو وہ ناقص ہے اس لیے کہ اخلاق ایمان کا لازمی جز ہے۔ چونکہ اجتماعیت پسندی کو انسان میں فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہے لہذا اجتماعی زندگی کے مختلف اجزاء کو مربوط کرنے کے لیے اسلام نے احکامات دیئے مثلاً صلہ رحمی، حسن سلوک، اطاعت رسول، ایثار اور سادہ طرز معاشرت

انسانی تعلقات کا سنگ بنیاد مرد و عورت کا تعلق ہے۔ اسی رشتے سے نسل انسانی کو برقرار رکھا گیا اور معاشرے تشکیل پاتے رہے۔ خاندان، قبائل اور قومیں، غرض یہ کہ انسانی تعلقات منقسم اور وسیع ہوتے چلے گئے۔ لوگ مختلف ممالک میں بسنے کی وجہ سے بے شمار گروہوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ دین اسلام نے ان تمام لوگوں کو متحد کرنے لیے عقیدہ کو مضبوط ترین اساس قرار دیا۔ اسلام کے تحت تعلق کی اصل بنیاد عقیدہ ہے اگر تمام تر انسانی تعلقات سے عقیدہ مجروح ہو تو ان تعلقات کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ اولیت و فوقیت عقیدہ کو حاصل ہے۔ ایک شخص اپنے باپ، اولاد یا بیوی سے بھی ناطہ توڑ دیتا ہے اگر عقیدہ سے تصادم ہو یا عقیدہ متاثر ہوتا ہو چنانچہ اشتراک کی اصل بنیاد ایمان ہے۔ خونی، نسلی یا قومیت پر مبنی کسی بھی رشتے پر ایمان کو فوقیت حاصل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَاءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾[2]

ترجمہ: اے ایمان والو اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھیں تم میں سے جو بھی ان سے محبت رکھے گا وہ پورا گناہ گار ظالم ہے۔

چنانچہ وحدت ایمان و فکر کے نتیجہ میں ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس میں تحفظ تعلقات کی بنیاد صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے۔ دین اسلام کو اپنا کر ہی انسان ان تمام حقوق و فرائض کا حامل ہو سکتا ہے جس سے باقی مسلمان فیض یاب ہیں۔

---

(۱) اسلام کا معاشرتی نظام، محمد بن علوی، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۱۵-۱۶

(۲) سورۃ التوبۃ:۹/۲۳

علم اخلاق اور علم عمرانی کا تعلق:

۱. علم اخلاق ایسا علم ہے جو انسان کے طرز معاشرت سے وابستہ ہے۔ یہ پوری انسانی زندگی پر محیط ہے یہ علم اجتماعی زندگی میں انسانوں کے باہم معاملات کو احسن طریقے سے طے کرنے کے لیے ایک ضابطہ دیتا ہے، معاشرتی زندگی کے اصول وضوابط مہیا کرتا ہے۔ اسلامی ضابطہ اخلاق کی بنیاد تقویٰ پر ہے یعنی ایسی روحانی کیفیت جس میں اللہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنے کے لیے ایسے اعمال اختیار کرنا کہ محبت انہی کا حصول ممکن ہو۔ ترک دنیا سے نہیں بلکہ معاشرتی زندگی میں لوگوں کے ساتھ باہم معاملات میں اخلاقی اقدار کو اپنانے سے تقویٰ کی منازل کو طے کیا جاسکتا ہے اور اسی سے رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہے۔

۲. علم اخلاق اور علم عمرانی کا بہت گہرا تعلق ہے۔ ہر انسان کا تعلق جماعتی زندگی سے ہے۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اس کا وجود ممکن نہیں انسان کے ارادی افعال جو کہ علم اخلاق کا موضوع ہیں، معاشرتی زندگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ علم عمرانی کا تعلق طرز معاشرت سے ہے، یہ علم خاندان، قبائل، قوم وجمیعت سے بحث کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ قانون، حکومت اور قوم کس طرح وجود میں آئی اور ترقی کی یہ تمام بحثیں اخلاقی اقدار کے معیارات کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ انسان کے ارادی افعال میں صحیح وغلط اور اچھائی وبرائی سے متعلق حکم لگانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔[۱] چنانچہ کسی بھی جماعت اور اس میں پائے جانے والے اوصاف سے قطع نظر ہو کر اخلاقی فضائل کا تعین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان اوصاف کا جاننا ضروری ہے جن سے اخلاقی فضائل کو پروان چڑھانے میں مدد ملتی ہے یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

۳. معاشرہ کسی خاص حلقے کے اندر افراد کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ انسانوں کے درمیان روابط کا عمرانی ڈھانچہ ہے۔ جس میں ایک فرد کی روش سے دوسرے افراد بھی متاثر ہوتے ہیں اس لیے اخلاقی اصول وضوابط کو معین کرنے کے لیے عمرانی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے اور ایسے معیارات کا تعین کیا جائے جو صرف ایک فرد کے لیے اچھے نہ ہوں بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے بھی فائدہ مند ہوں یا کم از کم ضرر رساں نہ ہوں جو اس فرد کی روش سے متاثر ہوں گے۔[۲]

۴. اخلاق اور عمرانیات کو یکجا کرنے میں زندگی کے نصب العین کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کا مقصد ذاتی مفاد پر مبنی ہے تو اس کے اخلاقی افعال میں پرستش ذات کا رنگ نظر آئے گا اور معاملات زندگی میں بھی ایسا

---

(۱) اخلاق اور فلسفہ اخلاق، ص:۱۷

(۲) اخلاقی نقطۂ نظر (اخلاقیات کی عقلی بنیاد)، کرٹ بائیر، مترجم (غلام رسول مہر)، ادبی مارکیٹ، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص:۲۶۷

شخص اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ اس کے مفار کو پورا کرنے میں دوسرا شخص کس حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے دوسری جانب نصب العین کا تعلق اگر اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود سے ہو تو دوسروں کے ساتھ معاملات میں معاشرتی اقدار وغایات کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے اور دوسرے افراد کو ایک آلہ کار کی بجائے صاحب مقصد ذات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے غرض یہ کہ ذاتی مفاد پرستی انسان کو اجتماعی اقدار و روایات سے بے پرواہ کر دیتی ہے البتہ معاشرتی اغراض وغایات کو مد نظر رکھنے والے دوسرے انسانون کو بھی ایک مستقل ہستی تسلیم کرتے ہیں اور اجتماعی مفاد کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں لہذا ذاتی یا اجتماعی نصب العین معاشرتی معاملات میں اخلاقی فضائل کو ڈھالنے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ (۱)

۵. اجتماعی زندگی ہی کی بدولت انسان کے اندر اخلاقی تفکر اور ضمیر کی بیداری ممکن ہے لوگوں کے ساتھ باہم معاملات سے انسان کی مخفی صلاحیتوں اور استعدادات کا اظہار ہوتا ہے۔ معاشرتی واسطہ سے انسان خود شناسی کے مرتبے کو حاصل کرتا ہے۔ جماعتی زندگی اور انسانوں کے ساتھ تعلقات سے انسان کو نیک وبد کی تمیز غور و فکر کرتے ہوئے فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور ذاتی رائے کے تحت چیزوں میں انتخاب کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور جماعتی نظام کے نتائج ہیں۔

غرض یہ کہ انسان فطری طور پر معاشرت پسند پیدا کیا گیا ہے انسان کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہے اور اسی سے اس کا وجود ممکن ہے مل جل کر زندگی بسر کرنے ہی سے انسان کی پرورش، تعلیم اور تربیت ہوتی ہے۔ معاشرتی زندگی کا بہتر بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ضابطہ حیات انبیاء اور کتابوں کے ذریعہ فراہم کیا۔ اسلام جماعتی زندگی پر زور دیتا ہے معاشرہ کی تنظیم میں اخلاق کو بہت اہمیت حاسل ہے علم اخلاق ایک ایسا ضابطہ دیتا ہے جس سے طرز معاشرت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے اوصاف کے تحت اخلاقی اقدار کے معیارات کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اخلاقی قدروں کو عملاً ڈھالنے کے لیے معاشرے کا ہونا ضروری ہے اور معاشرتی تنظیم و ترقی کے لیے اخلاقیات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

علم اخلاق اور معاشیات:

معاشیات انسانی طرز عمل کے مطالعہ کا نام ہے ہر اس کوشش کا مطالعہ جو انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کرتا ہے انسان اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے کسب معاش کی تلاش میں مبتلار ہتا ہے انسان کو فطری طور پر حرص و

---

(۱) اسلام کا نظریۂ اخلاق، ص:۴۳،۳۸

ہوس کا پتلا پیدا کیا گیا اسے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی بھی خواہش رہتی ہے جو اسے سرگرم عمل رکھتی ہے مگر تعلیمات اسلام اسے حدود کے اندر رہتے ہوئے جائزہ طریقوں سے نفع حاصل کرنے پر زور دیتا ہے معاشیات کی لغوی و اصطلاحی تعریف درج ذیل کی جاسکتی ہے۔

معاشیات کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

لغوی: لغوی اعتبار سے معاشیات کا مادہ عاش یعیش عیشاً و معاشاً[(۱)] سے ہے **والعیش: المطعم والمشرب و ما یکون به الحیاة** [(۲)] یعنی عیش سے مراد ہر وہ چیز جس سے زندہ رہا جاسکے کھانا اور پینا وغیرہ۔**والمعیشة: اسم ما یعاش به** [(۳)] اور معیشہ سے مراد ہر وہ چیز جو زندگی کے لیے ضروری ہے۔اس کی جمع معایش ہے۔

معاش کا تعلق روزی، خوراک، زمین جاگیر[(۴)] اور ہر اس شے سے ہے جس سے بسر اوقات کی جائے۔

اصطلاحاً: اصطلاحی اعتبار سے مسلم اور مغربی مفکرین نے معاشیات کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے۔

مسلم مفرین میں ابن خلدون کے نزدیک:

" ان المعاش هو عبارة عن ابتغا الرق والتعائش فی تحصیله" [(۵)]

ترجمہ: معاش رق ڈھونڈنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا نام ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے معیشت کی تعریف اس انداز میں کی ہے:

" هو الحکمة الباحثة عن کیفیة اقامة المعادلاة والمعاوناة والا کساب عن الارتفاق الثانی"۔ [(۶)]

ارتفاق ثانی کے باب میں افراد معاشرہ کا اشیاء کے باہمی تبادلے، ایک دوسرے سے معاشی تعاون اور ذرائع معیشت و آمدن کی حکمت سے بحث کرنے کا نام علم معاشیات ہے۔

---

(۱) لسان العرب، ۶/ ۳۲۱

(۲) تھذیب اللغۃ، أبو منصور، محمد بن أحمد الھروی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۳/ ۳۹

(۳) القاموس المحیط، المجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب، فیروز آبادی، مؤسسۃ الرسالہ للطباعۃ والنشر، بیروت، لبنان، ۲۰۰۵م، ۱/ ۵۹۹

(۴) مہذب اللغات، ص: ۳۲۸

(۵) مقدمہ ابن خلدون، عبد الرحمن بن خلدون، مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت، لبنان، المکتبہ التجاریہ، مکۃ المکرمہ، ۱۹۹۴ء، ۱/ ۲۱۵

(۶) حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ ابن عبد الرحیم (احمد)، دار الکتب، الحیثیہ، مکتبہ المثنی، القاھرہ، بغداد، ۱/ ۹۰

مولوی فیروز الدین کے نزدیک:

"اقتصادیات کا وہ علم جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم سے بحث کی جاتی ہے علم معاشیات کہلاتا ہے"۔[1]

مغربی مفکرین کے نزدیک جدید علم معاشیات کی بنیاد باضابطہ علم کے طور پر اٹھارویں صدی کے آخر میں رکھی گئی۔ جب آدم اسمتھ[2] کی کتاب ۱۷۷۱ء میں "دولت اقوام" کے نام سے شائع ہوئی۔ جدید علم معاشیات کا بانی آدم اسمتھ کو تصور کیا جاتا ہے اس نے علم معاشیات کی تعریف اس انداز میں کی ہے:

" Econimics is an inquiry into the nature and causes of wealth of nation"

ترجمہ: علم معاشیات ایک ایسا علم ہے جو اقوام کی دولت کی نوعیت اور اس کے اسباب کی تحقیق کرتا ہے۔

الفریڈ مارشل[3] نے علم معاشیات کی تعریف ان الفاظ میں وضع کی:

" Economics is a study of man's action in the ordinary business of life. It inquires how he gets income and how he use it... economics is on one side a study of wealth and on the other and more important side a part of the study of man." (4)

ان تعریفات کی رو سے علم معاشیات کا تعلق انسان کے ہر اس طرز عمل سے جسے وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کرتا ہے انسان کی خواہشات لا محدود ہیں جبکہ وسائل محدود ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کی احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے محدود ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے سرگرم عمل رہنا پڑتا ہے۔ انہیں مسائل و ذرائع پر انسان کی معاش کا انحصار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو

---

(۱) فیروز اللغات، ص:۱۱۳۱

(۲) آدم سمتھ کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ہے علم معاشیات سے متعلقہ اس کے نظریات کو جدید علم معاشیات میں اولین حیثیت حاصل ہے اس نے اپنی کتاب "دولت اقوام" میں معاشیات سے وابستہ متفرق مکاتیب و افکار کو یکجا کیا اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا۔ اس لیے اس کو علم معاشیات کا بانی کہا جاتا ہے اس کی وفات ۱۷۹۰ء میں ہوئی۔

(۳) الفریڈ مارشل ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوا۔ ماہر معاشیات مارشل نے علم معاشیات میں گراں قدر اضافہ کیا کہ اس کے نظریات کی بنیاد پر نیو کلاسیکی مکتب فکر کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی نظر میں علم معاشیات نہ صرف دولت کے مطالعہ کا نام ہے بلکہ دولت کس طرح حاصل کی جاتی ہے اور کہاں خرچ کی جاتی ہے اسکا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مارشل کا نظریہ معاشیات ان لوگوں تک محدود ہے جو مادی لوازمات کو پورا کرنے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں اس کی نظر میں معاشرے کی خوشحالی کے لیے مادی لوازمات کی تکمیل بہت ضروری ہے۔ الفریڈ مارشل کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔

(۴) معاشیات اسلام، مظفر حسین ملاٹھوی، مکتبہ برہان، غضنفر اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص:۱۵-۱۴

پیدا کیا اور اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے تمام تر وسائل کو باعث انتفاع پیدا کیا نیز انسان کو فطری طور پر اشیاء کا طلب گار اور لالچی پیدا کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ اشیاء کا طلب گار اور دولت کی فراوانی کی تگ و دو میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ خدا کی مقرر کردہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر انسان طیب طریقے سے اپنی معاشی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اسی میں معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی کا انحصار ہے۔ لہذا علم معاشیات کا تعلق احتیاجات زندگی پوری کرنے کے لیے کسب معاش یا دولت کا حصول، اسباب دولت کی جستجو اور دولت کی مساویانہ تقسیم سے ہے۔

اسلامی نظم معیشت کے بنیادی اصول:

موجودہ دور میں اقوام عالم اخلاقی اقدار کے فقدان اور طرز معیشت کی بد نظامی کے سبب بد امنی کا شکار ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد ہر جائز و ناجائز طریقے سے وسائل معیشت کی تلاش اور دولت کی فراوانی ہے اس معاشی بے راہ روی نے انسان کو شرعی اور اخلاقی ضابطہ حیات سے بے نیاز کر دیا ہے جبکہ اسلامی نظام حیات حقوق انسانی کے تحفظ، حلال و حرام کی تمیز اور اخلاقی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسلامی نظریہ معاشیات انسانی وحدت پر زور دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر قومیت میں کسی طبقہ و گروہ کی رعایت اور عصبیاتی جذبات و احساسات کو دخل نہیں بلکہ یہ تمام انسانوں کے لیے یکساں افادیت، حریت اجتماع اور معاشی مساوات کا قائل ہے اسلامی نظام معیشت کی درج ذیل امتیازی خصوصیات بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

لارھبانیہ فی الاسلام:

اسلام ترک دنیا نہیں بلکہ دین و دنیا دونوں کو جمع کرنے کا قائل ہے بے شک انسان کے اندر فطری طور احتیاجات زندگی کو پورا کرنے کے لیے دنیاوی اشیاء کی خواہشات اور آرزوئیں رکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ان خواہشات کی تکمیل کے لیے مال و دولت کا دلدادہ بنا ہوا ہے۔ مگر بہت زیادہ دولت کی حرص و ہوس اور مال و خوشحالی پر فخر و غرور انسان کی تباہی کا سبب ہیں۔ اسلام اعتدال اور پابندی حدود پر زور دیتا ہے۔ دنیاوی لذتوں میں اس قدر مبتلا ہونا کہ عبادت گزاری و اطاعت الہیٰ سے غفلت ہو جائے اسلام اس سے منع کرتا ہے یا اس قدر عبادت گزاری کہ دنیا سے قطع تعلقی اختیار کر لی جائے بھی ممنوع ہے[1]

---

(۱) اسلام کے معاشی نظریے، محمد یوسف الدین، الائیڈ بک کمپنی، جامعہ کراچی، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۲۸

قولہ تعالیٰ:

﴿ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ﴾[1]

ترجمہ: ترک دنیا کو انھوں نے تراش لیا ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا صرف خدا کی رضامندی کی طلب کی تھی انہوں نے اس کی رعایت محفوظ نہ رکھی۔

اسلام رہبانیت کو پسند نہیں کرتا اس کی دلیل قرآن میں بار بار کھول کر بیان کی گئی ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ اس سے نفع حاصل کرے نہ کہ اس سے اجتناب کر کے رہبانیت اختیار کرے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾[2]

ترجمہ: وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے۔

قرآن میں مختلف مقامات پر کسب معاش کے حصول کے طریقوں کی طرف اشارہ کیا گیا مثلاً زراعت، باغبانی، شکار، صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ، قرآن اللہ کی نعمتوں سے استفادہ کی طرف انسانی فطرت کو ابھارتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے بلکہ بنی آدم کی طرف جو شریعت بھی آئی اس میں رہبانیت کی گنجائش نہیں۔

اکتناز اور احتکار کی ممانعت:

اکتناز سے مراد یہ ہے کہ جائز طریقے سے جو دولت کمائی جائے اسکو جمع کیے رکھنا بغیر حقوق خداوندی اور حقوق ملت ادا کیے۔ اس کی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے۔[3] قولہ تعالیٰ:

﴿ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾[4]

ترجمہ: وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں اپنے پاس سونا اور چاندی اور خرچ نہیں کرتے اس کو اللہ کی راہ میں تو ان کو بشارت دے دیجئے دردناک عذاب کی۔

---

(۱) سورۃ الحدید: ۵۷/ ۲۷

(۲) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۲۹

(۳) اسلام کا معاشیاتی نظام، حیدر زماں صدیقی، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص: ۴۴

(۴) سورۃ التوبہ: ۹/ ۳۴

جائز طریقے سے جمع کیے گئے مال کو خدا کے بندوں پر خرچ نہ کرنے اور روکے رکھنے کی اسلام نے مذمت کی ہے اسلام خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ خرچ کرنے سے انسان مفلس نہیں ہوتا بلکہ مال میں برکت ہوتی ہے اور بہتر فوائد کے ساتھ پلٹ کر آتا ہے۔ جبکہ دولت کو جمع کیئے رکھنے سے دولت کی گردش رک جاتی ہے اور انسان اخلاقی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دولت کو سمیٹ سمیٹ کر بچانے اور مزید دولت بڑھانے میں لگانا سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ سرمایہ دار کے تحت خرچ کرنے سے دولت گھٹ جائے گی اور جمع کیے رکھنے یا سود پر چلانے سے دولت میں اضافہ ہو گا۔[1] جبکہ اسلام اس کے برعکس نیک کاموں میں دولت خرچ کر کے دولت بڑھنے کا نظریہ دیتا ہے۔ عملی زندگی میں بھی دیکھا جائے تو اسی سے معاشرے کے افراد میں معاشی توازن برقرار رہتا ہے اور دولت معاشرے کے چند افراد میں مرکوز ہونے کی بجائے تمام غرباء و مساکین میں گردش کرتی ہے۔ جس سے معاشرے میں خوشحالی اور امن و سکون قائم ہوتا ہے۔

اسی طرح احتکار سے مراد ہے کہ اشیاء خوردونوش کو زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے نرخ کی گرانی کے انتظار میں روکے رکھنا۔ یا دولت کو اس مقصد کے لیے روکے رکھنا کہ اس سے بہت زیادہ مقدار میں غلہ خرید کر وسائل معیشت پر تسلط حاصل کیا جائے اور پھر غلہ کو گراں نرخ پر فروخت کیا جائے۔[2] موطا امام مالک کی روایت ہے:

((لاَ حُكْرَةَ فِي سُوقِنَا، لاَ يَعْمِدُ رِجَالٌ بِأَيْدِيهِمْ فُضُولٌ مِنْ أَذْهَابٍ إِلَى رِزْقٍ مِنْ رِزْقِ اللهِ نَزَلَ بِسَاحَتِنَا، فَيَحْتَكِرونَهُ عَلَيْنَا))[3]

ترجمہ: ہمارے بازار میں کوئی احتکار نہ کرے جن لوگوں کے قبضہ میں ضرورت سے زائد روپیہ ہے وہ کسی غلہ کو جو ہمارے ملک میں آئے خرید کر اسے روک نہ دے یعنی احتکار نہ کریں۔

اکتناز اور احتکار دونوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ دولت کو خرچ کرنے کی بجائے روکی رکھنا اور مزید دولت بڑھانے میں لگانا۔ یہ دونوں نظریات سرمایہ داری (capitalism) کی بنیاد ہیں جبکہ اسلام معاشی مساوات پر زور دیتا ہے اور دولت کو چند ہاتھوں میں مقید ہونے کی بجائے، حقوق انسانی ادا کرتے ہوئے عام انسانوں میں گردش کرتے رہنا چاہیے۔

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی نظریات، ابوالاعلی مودودی، اسلامک پبلیکشنز لمیٹیڈ، ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، ص: ۱۰۵، ۱۰۳، ۹۹

(۲) اسلام کا معاشیاتی نظام، ص: ۴۴، ۴۶

(۳) الموطا، مالک بن انس، تحقیق (محمد فوائد عبد الباقی)، دار احیاء، التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۸۵ء کتاب البیوع، باب: الحکرۃ و التربص، حدیث نمبر: ۵۶، ۲/ ۶۵۱

کسب معاش میں حلال و حرام کا امتیاز:

انسان کے لیے کسب معاش کے تمام ذرائع و وسائل اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کیے ہوئے ہیں ان کو ایسے قوانین فطرت پر بنایا کہ وہ انسان کے لیے باعث انتفاع ہوں مگر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ان ذرائع کے استعمال میں حرام و حلال کی حدود وضع کیں انسان پر یہ پابندی عائد کی کہ وہ احتیاجات زندگی کو پورا کرنے کے لیے دولت جائز طریقوں سے حاصل کرے اور حرام طریقوں سے اجتناب کرے۔ مثلا دوسرے کا مال بغیر اس کی رضا یا بلا عوض کے لینا، رشوت، خیانت، چوری، جوا، فحش پھیلانے والے ذرائع سے کاروبار اور سود وغیرہ کو حرام قرار دیا۔ قولہ تعالیٰ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا﴾[1]

ترجمہ: اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری آپس کی رضا مندی سے اور اپنے آپ کو (یا ایک دوسرے کو) ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے اوپر رحیم ہے۔

اشیاء کو حلال و حرام ٹھہرانے کا حق صرف خدا کی ذات کو حاصل ہے۔ انسان نہ ہی اپنی مرضی سے کسی چیز یا ذریعہ کو حلال یا حرام قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی بغیر حلال و حرام امتیاز کے اپنی خواہش سے ہر جائز طریقے سے دولت کما سکتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ہر وہ طریقہ حلال اور جائز ہے جس میں فوائد کا تبادلہ منصفانہ طور پر تمام متعلقہ اشخاص کے درمیان ہو اور ہر وہ طریقہ ناجائز ہے جس میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے کے نقصان پر منحصر ہو۔[2] اسلام کا یہ کلی قاعدہ تمام ذرائع معاش کو احاطہ کیئے ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ان تمام اسباب کا سدباب کرتا ہے جس سے معاشی زندگی میں خرابیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

کسب معاش میں درجاتی تفاوت:

اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو رزق مہیا کیا اور وہی معاشی زندگی کا کفیل ہے۔ ہر انسان اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ہر ایک کے لیے فائدہ حاصل کرنے کا حق برابر ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کے حق معیشت میں دخل انداز ہو۔ البتہ سب کو ایک ہی جیسا رزق حاصل ہو یہ ضروری نہیں۔ ذریعہ رزق

---

(۱) سورۃ النساء: ۴/۲۹

(۲) اسلام اور جدید معاشی نظریات، ص: ۹۸-۹۷

توسب کے لیے موجود ہے اور حق معیشت میں تمام برابر ہیں مگر درجات میں مساوی نہیں سب کو یکساں طور دولت یا معیشت میسر نہیں۔ فطری طور پر ایک درجاتی تفاوت پایا جاتا ہے جسے اسلام میں بہت اہمیت ہے۔ یہ درجاتی تفاوت خدا کی حکمت پر مبنی ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ اِنَّه كَانَ بِعِبَادِه خَبِيْرًا بَصِيْرًا﴾[1]

ترجمہ: در حقیقت تیرا رب جس کے لیے چاہتا رزق کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نظر رکھتا ہے۔

لوگوں کو چاہیے کہ اس عدم مساوات کو کھلے دل سے قبول کریں۔ خدا نے اگر کسی کو فضیلت دی ہے تو اس پر حسد نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی کا رزق کشادہ کرتا ہے تو اس کو یہ بھی حکم دیتا ہے کہ وہ اس سے حقوق ملت ادا کرے یہ اللہ کی آزمائش ہوتی ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس فراوانی کے باوجود گویا وہ راہ خدا پر قائم رہے گا یا نہیں اور دوسرے مستحقین کو بھی شریک کرے گا یا نہیں اگر وہ انفاق فی سبیل اللہ کرتا ہے تو اس سے اجتماعی خوشحالی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ انفرادی خوشحالی، اجتماعی خوشحالی کا سبب بنتی ہے۔[2] نیز اس سے معاشی بدحالی کا خاتمہ ہوتا ہے اور توازن برقرار رہتا ہے۔ تمام بنی نوع انسان بغیر کسی رنگ و نسل کے امتیازات کے خوشحال زندگی بسر کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ گردش دولت سے معاشرے میں غربت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ:

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾[3]

ترجمہ: انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ جس کے لیے اس نے سعی کی۔

ہر انسان اپنی تگ و دو اور جدوجہد سے دنیا کی پیداوار سے اپنا حصہ لینے میں آزاد ہے اس میں کوئی طبقاتی یا نسلی تفریق نہیں پائی جاتی جبکہ اسلام مساوات کا درس دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لیے حصول رزق کے ذرائع پیدا کیے ہیں۔ اسلام ہر فرد کو معاشی تحفظ فراہم کرتا ہے انسان اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے جدوجہد سے زیادہ سے زیادہ وسائل رزق حاصل کرنے میں آزاد ہے اور اس کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

---

(۱) سورۃ الاسراء:۱۷/۳۰

(۲) معاشیات اسلام، ص:۵۹

(۳) سورۃ النجم:۵۳/۳۹

علم اخلاق اور معاشیات کا تعلق:

علم اخلاق اور معاشیات کا بہت گہرا تعلق ہے اسلامی نقطہ نظر سے معیشت کی عمارت خدا پرستانہ تصور کائنات اور فلسفہ اخلاق پر مبنی ہے اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے کے لیے آزاد معیشت کا تصور پایا جاتا ہے۔ جس میں افراد وسائل دولت سے نفع حاصل کرنے کا مساوی طور پر حق رکھتے ہیں اور آزادنہ تصرف کے اختیارات بھی رکھتے ہیں وہ اپنی رضا سے خدا کے دیئے ہوئے مال میں سے دوسروں کی اعانت کرتے ہیں رشتہ داروں اور مساکین کا حق ادا کرتے ہیں اس طرح ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جہاں اخلاقی اقدار نشوونما پاتے ہیں لوگوں کے اندر احساس ذمہ داری، رحم وشفقت، ہمدردی، حق شناسی اور ادائے حقوق کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور جن لوگوں کی اعانت کی جاتی ہے ان کے اندر بھلائی کرنے والوں کے لیے محبت، احسان اور شکر گزاری جیسے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جہاں معاشی توازن کے ساتھ ساتھ اخلاقی فروغ بھی پایا جائے۔ معاشرے کے افراد کسی خارجی قوت جابرہ کی مداخلت کے بغیر اپنی دلی رضامندی اور پاکیزگی نفس سے اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے حقوق ملت ادا کریں نہ کہ ایسا معاشرہ جس میں شخصی آزادی سلب کرلی جاتی ہے۔ افراد اتنی ہی معاش حاصل کرسکتے ہیں جو حکومت کی طرف سے قانونی سطح پر مقرر کی جاتی ہے اور بیرونی جبر وقوت سے لوگوں کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنایا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاشی نظام سے افراد کے اندر انفرادی سطح پر دوسروں کے حقوق کی ذمہ داری کا احساس ختم ہو جاتا ہے معاشی و ملکیتی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور اخلاقی آزمائش کا کوئی دائرہ باقی نہیں رہتا۔[1] اس کے برعکس اسلام نے جو نظام معیشت قائم کیا وہ اخلاقی ارتقاء کے لیے نہایت مناسب ہے جس میں اسٹیٹ کو کمزوروں، معذوروں اور یتیموں وغیرہ کی مالی اعانت کا ذمہ دار ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ افراد ملت کو آزادانہ اختیار دیا کہ وہ معاشرتی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے مفلوک الحال اشخاص کی مدد کریں۔

اسلامی نظام معیشت میں رضائے الٰہی اور پابندی احکام الٰہی بہت ضروری ہے اسلامی معیشت کا مقصد ہر جائز ناجائز طریقے سے صرف دولت کمانا نہیں بلکہ طیب و حلال طریقے سے دولت حاصل کر کے اخلاقی قدروں کو مد نظر رکھتے ہوئے اخوت، بھائی چارہ، امانت، انفاق فی سبیل اللہ، مساوات اور عدل وانصاف جیسے اوصاف کو بھی اپنانا ہے۔ اسلامی معیشت آزادی کا داعی ہے مگر وہ اس کے ساتھ ہی افراد کو اخلاقی ضابطے میں جکڑے ہوئے ہے تاکہ فاسد نظام معیشت سے بچا جاسکے اور معاشرتی تباہی کے دروازے بند ہوں۔ موجودہ دور میں معاشی بے راہ روی کی اصل وجہ شریعت کی پابندیوں اور اخلاقی ضابطوں

---

(۱) اسلام کا نظریہ اخلاق، ص:۱۸-۱۷

کی عدم پاسداری ہے۔لوگ حرص وہوس میں بغیر حلال کی تمیز رکھتے ہوئے اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں جس نے انہیں تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے لہذا انفرادی و اجتماعی معیشت میں جب تک شرعی و اخلاقی حدود کو مد نظر نہیں رکھا جائے گا دنیاوی و اخروی کامیابی کی راہیں محدود رہیں گی۔

باب دوم: نوجوان قوم کے معمار

فصل اول: نوجوانوں کی اہمیت

فصل دوم: اخلاقی اقدار کی ترویج میں نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار

فصل سوم: اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں

فصل اول

نوجوانوں کی اہمیت

فصل اول

نوجوانوں کی اہمیت

کسی بھی قوم کی اصلاح کا دارومدار نوجوان نسل پر منحصر ہوتا ہے۔ نوجوانوں کا طبقہ ہی معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر نوجوانوں کے اندر اخلاقی اقدار کا اہتمام، تزکیۂ نفس اور عمدہ خصائل پائے جائیں تو وہ ہر طرح کے مسائل کا مقابلہ کرتے ہوئے تعمیری راستوں پر گامزن ہوسکتے ہیں۔ اگر نسل نو اپنے وجود کو خرافات سے پاک کرلے تو معاشرہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

اسلام نے معاشرے کی اصلاح میں نسل نو کے کردار کو بہت اہمیت دی اور ان کی تعلیم وتربیت پر زور دیا۔ دین اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے نسل نو میں تعمیری و ذمہ دارانہ سوچ وفکر مہیا کی۔ اسلام دنیاوی زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کے لیئے افراد کے عقائد و نظریات کی درستگی کا حکم دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے ہی دنیاوی اور اخروی کامیابی ہے۔ اگر ان تعلیمات پر نسل نو کی تربیت کی جائے تو ایک صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ ۔ اسلامی نقطہ نظر سے نوجوانوں کی اہمیت کو اسطرح سے اجاگر کیا گیا ہے۔

قرآن کی روشنی میں:

نوجوانی کی عمر عطیہ خداوندی ہوتی ہے اس عمر میں عقل وشعور اور اعضاء و جوارح اپنے کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ نوجوانی کی عمر بہت اہمیت کی حامل ہے اس عمر میں ایسے ایسے کام بروئے کار لائے جاسکتے ہیں جو عمر کے کسی اور حصے میں ممکن نہیں۔ جسمانی لحاظ سے انسان دور شباب میں توانا اور پختہ ہوتا ہے، ہر طرح کے مصائب کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام اور اصحاب کہف کے جوانی کے کارناموں کا ذکر بطور تشجیع کیا گیا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا﴾ (۱)

ترجمہ: ہم آپ کو ان کا بالکل سچا واقعہ بتاتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں مزید رہنمائی بخشی۔ اور ہم نے ان کے دلوں کو اس وقت مضبوط کردیا جب

---

(۱) سورۃ الکہف:۱۸/۱۳-۱۴

انہوں نے کھڑا ہو کر اعلان کیا کہ : ہمارا رب تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور الٰہ کو نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ ایک بعید از عقل بات ہو گی۔

اصحاب کہف چند نوجوان تھے جن کے دلوں میں اللہ تعالی نے ایمان کو مضبوط کر دیا اور وہ اس ایمان پر اپنے بڑوں کی سخت مخالفت کے باوجود قائم رہے کیونکہ کفر و شرک پر ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہ تھی جبکہ ان چند نوجوانوں نے دلیل و برہان کو اہمیت دی اور نہایت پر خطر حالات میں اعلان توحید کیا اور اپنے وقت کے ظالم بادشاہ کے خلاف بغیر کسی خوف و خطر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ نے ان کی مدد کی، ان کے دلوں میں قوت و عزیمت بخشی اور ایمان پر مزید پختہ کر دیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنا گھر، مال و دولت سب حق کی خاطر چھوڑ دیا اور معاشرے سے روپوش ہو گئے۔ (۱)

یہ طبقہ نوجوانوں کا تھا جس نے دعوت حق کے راستے میں ہر طرح کے مصائب و مخالفت کا مقابلہ کیا مگر سچائی سے نہ ہٹے۔ قرآن میں اصحاب کہف کا ذکر دور شباب کی اہمیت کو واضح کرتا ہے کہ یہی وہ بہترین عمر ہے جس میں نوجوان اپنے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں اور راہ حق میں حائل رکاوٹوں سے سبک دوش ہو سکتے ہیں اور جب کوئی انسان اللہ کی خاطر کسی کام کا عزم کر لیتا ہے تو اللہ بھی اسکی مدد کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو نبی اکرم ﷺ کو نبوت بھی جوانی کی عمر میں ملی، آپ ﷺ پر چالیس سال کی عمر میں وحی نازل ہوئی، آپ ﷺ نے اپنی جوانی میں خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے فرائض نبوت کو بخوبی ادا کیا۔

عمر کے اس دورانیہ میں اگر صحیح معنوں میں نوجوانوں کی فکری و تعمیری اصلاح کی جائے تو بہت ساری تعمیری اصلاحات منظر عام پر آسکتی ہیں۔ اقوام عالم کی ترقی و اصلاح معاشرہ کے لیئے نوجوانوں میں جنصفات کا ہونا ضروری ہے، ان کی تائید قرآن مجید میں اس طرح سے کی گئی، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿حَتَّى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (۲)

ترجمہ:۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بھرپور جوانی کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا: "میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین

---

(۱) أنوار التنزیل وأسرار التأویل، ناصر الدین، أبو سعید عبد اللہ بن عمر البیضاوی، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۸ھ، ۳/۲۷۴

(۲) سورۃ الاحقاف: ۴۶/۱۵

پر کیا ہے اور یہ بھی کہ میں ایسے اچھے عمل کروں جو تجھے پسند ہوں اور میری خاطر میری اولاد کی اصلاح کر میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور بلاشبہ میں فرمانبردار ہوں۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوانی کا دورانیہ چالیس سال تک کا ہوتا ہے اور یہ عمر عزیز کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ انسان عقلی اعتبار سے بہت پختا ہو چکا ہوتا ہے ایک صالح نوجوان کی حیثیت سے وہ اللہ اور اپنے والدین کے احسانات اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر اس کے احکام پر عمل پیرا ہو کر کیا جا سکتا ہے ایسے اعمال کو اپنا کر جو اللہ کو پسند ہیں اور جو خالصۃ اسکی رضا کے لیئے کیئے جائیں۔ والدین سے حسن سلوک کرنے والا، یہ والدین کا حق ہے کے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور ان کی فرمانبرداری کی جائے۔ ایک صالح فرد کی نشانی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آنے والی نسلوں کو بھی نیکی کی راہ پر دیکھنا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح و فلاح کی فکر میں رہتا ہے۔

جوانی عمر کا قیمتی ترین حصہ ہے اس کو غنیمت جاننا چاہیئے اور قوت و نشاط سے بھرپور کام لیتے ہوئے عمر کے اس حصے کے لیئے تیاری کر لینی چاہیئے جس میں انسان ضعف کا شکار ہوتا ہے ارشاد باری تعالی ہے:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ﴾[1]

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس نے تمہیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد قوت عطا کی پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا بنایا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی جاننے والا قدرت والا ہے۔

آیت مبارکہ میں جوانی کی عمر کو "قوت" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس عمر میں انسان توانا اور مضبوط ہوتا ہے۔ قوت کے بعد کمزوری یا جوانی کے بعد بڑھاپا اور صحت کے بعد بیماری کا خدشہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو بڑھاپے میں انسان دماغی و اعصابی لحاظ سے کمزور ہوتا ہے اس لیئے وہ زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیئے جدوجہد کر سکتا ہے۔ اسلیئے عمر شباب ہی میں بڑھاپے اور بیماری کے لیئے قبل از وقت تیار رہنا چاہیئے کیونکہ یہی وہ عمر نشاط ہوتی ہے جس میں انسان ایام ضعف کے لیئے سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہے[2] نیز زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ بڑھاپے میں انسان کچھ کرنا بھی چاہے تو بھی اس کے اعضاء اس کا ساتھ نہیں دیتے پھر حسرت و تمنا کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں رہتا۔ چنانچہ جوانی کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت میں صرف کرنا چاہیئے، یہی اللہ تعالی کے ہاں بھی سب سے

---

(۱) سورۃ الروم: ۳۰/ ۵۴

(۲) التفسیر الکبیر، فخر الدین الرازی، محمد بن عمر بن الحسن، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۰ھ، ۲۵/ ۱۱۱

زیادہ پسندیدہ ہے اور اخروی کامیابی بھی اسی میں ہے۔ جوانی میں رشد وہدایت کو اپنانے اور باطل کو چھوڑنے والوں کو قرآن مجید میں اسطرح سے خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، قولہ تعالی:

﴿فَمَا آمَنَ لِمُوسَى إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِنْ قَوْمِهِ عَلَى خَوْفٍ مِنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَنْ يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ﴾[1]

ترجمہ: تو کوئی ایمان نہیں لایا موسیٰ (علیہ السلام) پر مگر چند نوجوان اس کی قوم میں سے ڈرتے ہوئے فرعون اور اپنے سرداروں سے۔

فرعون ملک مصر کا جابر بادشاہ تھا، ربوبیت کا دعوی کرنے والا، مشرکوں کا ساتھ دینے والا اور غرور و تکبر میں چڑھا ہوا تھا۔ اس کی قوم کے چند ہی نوجوان تھے جو موت کے خوف وخطر کے باوجود ایمان لائے اور حضرت موسی علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہا اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام اور ان نوجوانوں کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلائی اور دریا پار کرایا جبکہ فرعون اپنے کفر وعناد اور غرور و تکبر کی بناء پر غرق ہوا۔[2]

تاریخ گواہ ہے کہ نوجوانون نے ہی اپنی صلاحیتوں کو اسلام کے لیئے وقف کیا اور قوم کی فلاح وبہبود کے لیئے خدمات انجام دیں۔ لہذا جن نوجوانوں کا ایمان مضبوط ہو اور عمدہ خصائل کے مالک ہوں وہی معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں اور ایسے ہی نوجوانوں کے لیئے دنیا و آخرت میں کامیابی کی خوشخبری ہے۔

حدیث کی روشنی میں:

نبی اکرم ﷺ کی شخصیت میں معاشرے کے تمام افراد کے لیئے ہدایت ورہنمائی پائی جاتی ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات پوری انسانیت کے لیئے راہ ہدایت ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد تعلیم وتربیت اور اصلاح معاشرہ تھا، جسے آپ ﷺ نے بخوبی انجام دیا۔ معاشرے کی فلاح وبہبود میں نوجوانوں کے کردار کو بہت اہمیت دی۔ آپ ﷺ نوجوانوں کو قوم کا بہترین متاع گردانتے تھے اور ان کے درس وتدریس پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے جوانی کی اہمیت کو ایک مقام پر اس طرح بیان فرمایا:

---

(۱) سورہ یونس: ۱۰/۸۳

(۲) روح البیان، أبو الفداء، إسماعیل حقی بن مصطفی، دار الفکر، بیروت، ۴/۷۱-۷۳

((اغْتَنِمْ خَمْسًاقَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ،وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ،وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ،وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ،وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ)) (۱)

ترجمہ: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، غریبی سے پہلے تونگری کو، مصروفیت سے پہلے فراغت کو اور موت سے پہلے زندگی کو۔

جوانی کی اہمیت کا اندازہ یہاں سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اخروی نعمتوں میں ملنے والی ایک نعمت جوانی بھی ہے جو ہر جنتی کو ملے گی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَهْلُ الْجَنَّةِشَبَابٌ،جُرْدٌ،مُرْدٌ،كُحْلٌ،لَاتَبْلَى ثِيَابُهُمْ،وَلَايَفْنَ شَبَابُهُمْ)) (۲)

ترجمہ: جنتی بغیر بالوں کے، بے ریش جوانی، سرمگیں آنکھوں والے ہوں گے، نہ ہی کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ہی جوانی فنا ہوگی۔

نبی اکرم ﷺ نے عمر کے اس حصے کو قیمتی گردانہ اور اسے غنیمت جانتے ہوئے دور شباب میں جسمانی و دماغی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرنے کی تاکید کی۔ اس عمر میں کیئے گئے نیک اعمال زندگی کے باقی ادوار سے زیادہ پسندیدہ ہیں یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قبول اسلام کے بعد اپنی ساری جوانی دین اسلام کی خدمت میں وقف کر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌوَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ)) (۳)

ترجمہ: طاقتور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور پسندیدہ ہے۔

نوجوان امت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسلام میں عمر شباب کی اصلاح وہدایت کو بہت اہمیت حاصل ہے اور بڑھاپے کی نسبت اس عمر میں کیئے گے اعمال صالحہ اور احکامات الٰہی کی پیروی کرنے والے کا اللہ کے ہاں بلند مقام حاصل ہے۔ یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے سائے تلے، جس دن کسی اور کا سایہ نہ ہوگا وہ نوجوان ہوگا جو اللہ کی عبادت میں وقت گزارے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین، محمد بن عبد اللہ ابن البیع، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰م، کتاب الرقاق، حدیث نمبر: ۷۸۴۶، ۴/۳۴۱

(۲) سنن الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمن، الدارمی، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۷ھ، کتاب الرقاق، باب فی أھل الجنۃ ونعیمھا، حدیث نمبر: ۲۸۲۶، ۲/۴۳۱

(۳) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فِي الْأَمْرِ بِالْقُوَّةِ وَتَرْكِ الْعَجْزِ وَالِاسْتِعَانَةِ بِاللَّهِ وَتَفْوِيضِ الْمَقَادِيرِ لِلَّهِ، حدیث نمبر: ۴۸۱۶، ۱۳/۱۴۲

((سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمْ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ الْإِمَامُ الْعَادِلُ وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ أَخْفَى حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ))[1]

ترجمہ: سات آدمیوں کو اللہ اپنے سائے میں رکھے گا جس دن کہ سوائے اس کے سائے کہ اور کوئی سایہ نہ ہو گا، حاکم، عادل اور وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں لگا رہتا ہے اور وہ دو اشخاص جو باہم صرف اللہ کے لیئے دوستی کریں جب جمع ہوں تو اسی کے لیئے جب جدا ہوں تو اسی کے لیئے اور وہ شخص جس کو کوئی منصب اور جمال والی عورت زنا کے لیئے بلائے اور وہ یہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اس لیئے نہیں آسکتا اور وہ شخص جو چھپا کر صدقہ دے یہاں تک کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا اور وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے اور اسکی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جائیں۔

کیا ہی بلند مقام ہے ایسے نوجوانوں کا جو اپنی زندگیاں اطاعت خداوندی میں صرف کرتے ہیں اور گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں کہ اللہ بروز قیامت ان کو اپنے سائے تلے رکھے گا۔

اسلام جوانی کو خاص عنایت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اللہ نے انسان کو بے مقصد زندگی کی نعمت نہیں عطا کی بلکہ انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو اپنی زندگیوں میں ڈھالنا ہے اور زندگی کے ہر مرحلے میں شریعت کی پیروی کرنا ہے۔ روز قیامت اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے متعلق سوال کیا جائے گا اور سب سے پہلا سوال تمام عمر سے متعلق ہو گا کہ کہاں گزاری اور پھر خصوصا تخصیص کے ساتھ دوسرا سوال جوانی کے بارے میں ہو گا کہ کہاں خرچ کی۔ جس کی تائید فرمان نبوی ﷺ سے کی گئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَاتَزُولُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِمِنْ عِنْدِرَبِّهِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ،عَنْ عُمُرِهِ فِيمَ أَفْنَاهُ،وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَ أَبْلَاهُ،وَمَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ،وَمَاذَاعَمِلَ فِيمَاعَلِمَ)) [2]

---

(۱) الجامع الصحیح، محمد بن إسماعیل البخاری، کتاب الجماعۃ والامامۃ، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ وفضل المساجد، حدیث نمبر: ۶۲۹، ۱/ ۲۳۴

(۲) سنن الترمذی، أبو عیسی، محمد بن عیسی (تحقیق: أحمد محمد شاکر)، شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۷۵ء، أَبْوَابُ صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالرَّقَائِقِ وَالْوَرَعِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، باب فی القیامہ، حدیث نمبر: ۲۴۱۶، ۴/ ۶۱۲

ترجمہ: قیامت کے روز جب تک بندہ پانچ چیزوں کے بارے میں نہ سوال کر لیا جائے اس کا قدم اللہ رب العزت کے دربار سے نہیں ہٹ سکتا۔ (پہلا سوال) اسکی عمر کے بارے میں ہو گا کہ عمر کس کام میں گزاری؟ دوسرا سوال اس کی جوانی کے بارے میں کہ جوانی کہاں خرچ کی؟ تیسرا سوال اسکے مال و دولت کے بارے میں کس طرح کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ پانچواں سوال جو علم حاصل کیا تھا اس پر کیا عمل کیا؟۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی عمر کو کتنی اہمیت حاصل ہے کہ قیامت کہ دن انسان اپنے قدم دربار الٰہی سے نہیں ہٹا سکتا جب تک کہ اپنی جوانی کے بارے میں جوابدہ نہیں ہو جاتا۔ لہذا اس عمر کو غنیمت جاننا چاہیئے اس سے پہلے کہ یہ گزر جائے اور اپنی تمام تر توانائیوں کو اللہ کے راستے میں وقف کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نوجوان ہی امت مسلمہ کا اثاثہ ہیں اور امت کی کامیابی اسی میں مضمر ہے کہ نوجوان طبقہ دین اسلام سے وابستہ ہو جائے، نبی اکرم ﷺ کے طرز حیات کو اپنی زندگیوں میں ڈھال لینے میں ہی دنیاوی و اخروی سعادت ہے۔ تعلیمات اسلام انسان کی شخصیت میں ایسا اعتدال پیدا کرتی ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے فکر و عمل اور اخلاق میں موجود تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے نوجوانوں کو افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ کو تھامے رکھنے پر زور دیا۔ اقوام عالم کی ترقی کے لیئے آپ ﷺ نے نوجوانوں کو مثبت راہ پر گامزن ہونے کی تاکید کی۔

فصل دوم

اخلاقی اقدار کی ترویج میں نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار

فصل دوم

اخلاقی اقدار کی ترویج میں نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار

نبی اکرم ﷺ نے منصب نبوت کے بعد، مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر بہت توجہ دی اور اس کے ذریعے لوگوں میں دین اسلام کا شعور بیدار کیا۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ تعلیم وتدریس ہی بہترین ذریعہ ہے جس سے لوگوں میں معاشرتی، سیاسی، سماجی واخلاقی اقدار متعارف کرائے جاسکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّمَابُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) (۱)

ترجمہ: بلاشبہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت سے بڑی تعداد میں معلم ومربی نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ آپ ﷺ کے شاگرد تھے منظر عام پر آئے۔ ان معلمین کے مرجع و اساس آپ ﷺ کی ذات مبارکہ تھی۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اصلاح معاشرہ میں معلمین کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ ﷺ نے نوجوان صحابہ کو نہ صرف جنگی، معاشی، علمی اور تبلیغی لحاظ سے تیار کیا بلکہ ان کی خصوصی دلچسپیوں اور رجحانات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ ان کے ذاتی رجحانات کے مطابق انکی رہنمائی وحوصلہ افزائی کی اور ان کو انہیں میدانوں میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیئے جن میں وہ انفرادی طور پر رغبت رکھتے تھے۔

آپ ﷺ کی ذات میں نفسیاتی لحاظ سے لوگوں کی اہلیت و قابلیت جانچنے کا وضع بہت نمایاں تھا۔ چنانچہ تعلیم وتدریس کے لیئے نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی تعلیمی قابلیت کے مطابق مکہ ومدینہ کے مختلف مقامات میں تقرری کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی حسن تربیت اور افراد شناسی کی بناء پر ان نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قائدانہ صلاحیتوں کو خوب بروئے کار لایا گیا، جس سے اسلام کو فروغ اور استحکام ملا۔ ان معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں عتبہ بن ربیعہ، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابو موسی اشعری، جابر بن عبد اللہ، سعد بن أبی وقاص، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن مسعود، مصعب بن عمیر، جابر بن عبد اللہ، ابو ہریرہ، ابو درداء، انس بن مالک، ابو عبیدہ بن الجراح، عبادۃ بن صامت اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ (۲)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، أبو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی، (تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی)، دار إحیاء الکتب العربیہ، فیصل عیسی البابی الحلبی، بَابُ فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ، حدیث نمبر: ۲۲۹، ۱/۸۳

(۲) عہد نبوی میں نظام تعلیم، محمد عبد المعبود، مکتبہ رحمانیہ، اقراء سنز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، ص: ۱۱-۱۲، ۱۷-۱۸، ۲۹

نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت اور افراد شناسی کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ان چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا جائے گا جن کی قابلیتوں اور خوبیوں سے عہد رسالت اور بعد کے ادوار میں خوب استفادہ کیا گیا۔ انہیں کی بدولت آج دین اسلام منظر عام پر آیا ہے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو محمد ہے اور آپ کے والد کا نام عمیر رضی اللہ عنہ تھا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ کے خوبصورت اور خوش پوشاک نوجوان تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ خناس بنت مالک نے مالدار ہونے کی وجہ سے بہت ناز سے پالا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نہایت خوش بیان اور ذہین تھے۔ جفاکش اور مصائب میں صبر واستقلال سے کام لینے والے تھے۔ قبول اسلام سے قبل آپ رضی اللہ عنہ کا اکثر وقت آرائش وزیبائش میں بسر ہوتا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے شفاف دل میں توحید کا پودا اس وقت بویا جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں پناہ گزیں تھے اور مکہ کی زمین مسلمانوں پر تنگ تھی۔ اسلیئے آپ رضی اللہ عنہ نے ایک عرصہ تک اپنے قبول اسلام کو پوشیدہ رکھا مگر جب یہ بات عیاں ہوئی تو خاندان والوں کی محبت نفرت میں بدل گئی اور قید کر لیا گیا بالآخر ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ (۱)

اشاعت اسلام واصلاح معاشرہ میں آپ رضی اللہ عنہ کا کردار:

ایک مدت کے بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جب حبش سے مکہ پہنچے تو اسلام مدینہ تک پہنچ چکا تھا۔ بیعت عقبہ اولی کے بعد مدینے والوں کی درخواست پر نبی اکرم ﷺ نے تعلیم وتدریس کے لیئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ روانہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا انتخاب بہترین معلمانہ اوصاف اور علمی بصیرت کی بناء پر کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ مدینہ میں اسعد بن زرارہ کے گھر قیام پذیر ہوئے اور اسی مکان میں آپ رضی اللہ عنہ نے غیر مسلموں کو دین اسلام کی دعوت دی اور مدینے کے پہلے دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اسکے علاوہ گھر گھر جا کر تبلیغ اسلام اور قرآن کی تعلیم دی یہاں تک کہ انصار کی تمام بستیوں میں اسلام پھیل گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں حضور اکرم ﷺ کی اجازت سے حضرت سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں جماعت کے ساتھ جمعہ کی بنیاد ڈالی، نماز جمعہ کے بعد مہمانوں کی ضیافت کے لیئے بکری ذبح کی گئی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنی محنت اور جانفشانی سے مدینہ میں ایک سال کے اندر بڑی تعداد میں لوگوں کو اسلام کی طرف مدعو کر لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی ان کامیابیوں اور بڑھتے ہوئے اسلام کو دیکھ کر اوس وخزرج کے وہ قبائل جو ابھی اسلام نہ لائے تھے، انہیں

---

(۱) أسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، عزالدین ابن الأثیر، أبوالحسن علی بن أبی الکرم، (تحقیق: علی محمد معوض)، دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۴م، ۵/۱۷۵

سخت نہ گوار گزرا چنانچہ قبیلہ عبدالاشہل کے سردار سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر نے انہیں نکالنے کا منصوبہ بنایا مگر جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے اتنی خوش اسلوبی سے دعوت اسلام اور تلاوت قرآن کی کہ وہ اس سے مغلوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اسلام قبول کر لیا جس کے بعد پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ جب مکہ مکرمہ پوری جماعت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدعو کرنے کے لیئے لوٹے تو آپ رضی اللہ عنہ کے کارنامے سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ تشریف لے آئے۔ (۱)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے حق و باطل کے معرکوں میں بھی بھرپور شرکت کی غزوہ بدر و غزوہ احد میں اسلام کی علمبرداری کا تمغہ شرف انہی کو ملا۔ غزوہ احد میں جب مسلمان منتشر ہو گئے تو بھی آپ رضی اللہ عنہ مشرکین کے نرغے میں اسلام کا علم اٹھاتے ہوئے ثابت قدم رہے بلا آخر ابن قمئہ کے وار سے زخموں کی تاب نہ لا سکے اور شہید ہو گئے۔ غربت و افلاس کا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہیدان اسلام کو کفن تک نصیب نہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے تم کو مکہ میں دیکھا تھا جہاں تمھارے جیسا حسین و خوش پاک کوئی نہ تھا، لیکن آج دیکھتا ہوں کے تمھارے بال الجھے ہوئے ہیں اور جسم پر صرف ایک چادر ہے پھر ارشاد ہوا بے شک خدا کا رسول گواہی دیتا ہے کہ تم لوگ قیامت کے دن بارگاہ خداوندی میں حاضر رہو گے "(۲)

چنانچہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے علم و بصیرت اور صبر و استقامت کی بناء پر دین اسلام کو مدینہ کی سرزمین میں تقویت ملی اور انقلاب برپا ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نہ صرف حسین و خوش پوشاک تھے بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کی خوش اسلوبی نے کثیر تعداد میں لوگوں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

حضرت ابو عبدالرحمن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج کی شاخ عدی بن سعد سے تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا شمار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم جانثاروں میں ہوتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ طویل القامت، روشن چہرہ، سلیم الطبع اور اخلاق حسنہ کا پیکر تھے۔ (۳)

---

(۱) الثقات، أبو حاتم، محمد بن حبان بن أحمد، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، ہند، ۱۹۷۳م، ۱/۹۶-۹۷

(۲) الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، أبو عمر یوسف بن عبد اللہ،، القرطبی، (تحقیق: علی محمد البجاوی)، دار الجیل، بیروت، ۱۹۹۲م، ۴/۱۴۷۴

(۳) أسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ۴/۴۱۸-۴۱۹

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں جب دعوت اسلام دی تو آپ رضی اللہ عنہ بہت متاثر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ اگلے سال جب کثیر تعداد پر مشتمل قافلہ مکہ کی طرف حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو ان میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ جہاں پوری جماعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے مشرف ہوئی اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ہجرت فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ اقدس سے فیض یاب ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا سینہ کلام الٰہی اور ارشادات نبوی کا مجمع بن گیا۔

علمی شغف:

آپ رضی اللہ عنہ کو قرآن وحدیث سے ایسا شغف تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی پورا قرآن حفظ کر لیا اور ہمہ وقت فیضان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ حاصل کرنے کے لیئے کوشاں رہتے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو قرآن، حدیث اور فقہ میں اس قدر مہارت تھی کہ کنزالعلماء اور امام الفقہاء کے القاب سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے قرآن کے علوم ومعارف حاصل کرنے ہوں وہ چار بزرگوں کی طرف رجوع کرے جن میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

((خُذُوا الْقُرْآنَ مِنْ أَرْبَعَةٍ: مِنَ ابْنِ مَسْعُودٍ، وَأُبَيٍّ بن كعب، ومعاذ بن جَبَلٍ، وَسَالِمٍ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ)) (۱)

ترجمہ: قرآن سیکھنے کے لیئے چار لوگوں کی طرف رجوع کرو: ابن مسعود، ابیبن کعب، معاذ بن جبل اور سالم مولی ابی خذیفہ۔

آپ رضی اللہ عنہ کا شمار جلیل القدر فقہاء میں بھی ہوتا ہے، مسائل کے استنباط میں بہت عبور حاصل تھا اسی لیئے آرضی اللہ عنہ پ کو امام الفقہاء کہا جاتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کی ان الفاظ میں مدح کی:

((وَأَعْلَمَهُمْ بِالْحَلالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ)) (۲)

ہمارے صحابہ میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبل ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض تربیت سے فقیہ، معلم اور مجتہد جیسی متنوع صفات کے مالک ہوئے۔

---

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۶۷۹۰، ۶/۳۰۹

(۲) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۵۴، ۱/۱۰۷

اصلاحی سرگرمیاں:

حضرت محمد ﷺ نے نوجوان صحابہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی علمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد، لوگوں کو فقہ اور سنت کی تعلیمات دینے کے لیئے مکہ میں بطور معلم مقرر کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی قرآن وسنت سے بہت زیادہ واقفیت ہونے کی بناء پر انہیں بنو سلمہ کی مسجد کا امام مقرر کیا۔ ۹ ہجری میں اہل یمن کی استدعا پر والئ یمن بنا کر بھیجا گیا جہاں آپ رضی اللہ عنہ نے حاکم ہونے کے ساتھ ساتھ یمن کے لوگوں کو تعلیم دینے کی خدمات بھی انجام دیں اور دینی مسائل سے آگاہ کیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ابھی یمن ہی میں تھے کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کی خبر سنی تو جیسا کہ الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا چنانچہ یمن سے دل اچاٹ ہو گیا اور واپس مدینہ لوٹ آئے، مدینہ میں بھی زیادہ عرصہ مقیم نہ ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کہ سب سے افضل جہاد فی سبیل اللہ ہے، پر عمل کرتے ہوئے باقی زندگی بھی میدان جہاد میں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت شام اور روم کے درمیان معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع تھا جن میں آپ رضی اللہ عنہ نے بھرپور شرکت کی اور نہایت دلیری و جوانمردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت سے معرکوں میں دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں منصب افتاء پر فائز رہے۔ جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دنیا سے رحلت فرما گئے تو عہد سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ملک شام کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیئے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مامور کیا گیا۔ شام میں آپ رضی اللہ عنہ نے اگرچہ علاقہ فلسطین میں سکونت اختیار کی مگر اشاعت علوم کا سلسلہ دور دور تک پھیلا رہا۔ آپ رضی اللہ عنہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے اور جاتے جاتے درس و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہتا۔ (۱)

۱۸ھ کو عراق، مصر اور شام میں "طاعون عمواس" کی خوفناک وبا پھیل گئی۔ ان دنوں آپ رضی اللہ عنہ شام میں مقیم تھے کہ سپہ سالار شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اس بیماری کی زد میں آ گئے اور وفات پا گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری خطبہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد سپہ سالار مقرر کیا۔ کچھ عرصہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے رہے کہ آپ رضی اللہ عنہ بھی طاعون کی لپیٹ میں آ گئے اور ۳۳ سال کی عمر میں خلیفہ عمر بن الخطاب کے دور میں وفات پا گئے۔ (۲)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جوانی میں اپنا وقت نبی اکرم ﷺ سے علم سیکھنے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے میں صرف کیا۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے بہت بڑے ماہر تھے کہ ایک دنیا ان کے علم سے فیض یاب ہوتی رہی۔ جوش جوانی میں راہ حق میں جہاد کی ایسی تڑپ تھی کہ نہ صرف عہد رسول اللہ ﷺ کی ساری غزوات میں پر جوش انداز میں شرکت کی

---

(۱) عہد نبوی میں نظام تعلیم، ص: ۱۲۰-۱۲۱

(۲) الطبقات الکبری، أبو عبد اللہ محمد بن سعد بن منیع، (تحقیق: محمد عبد القادر عطا)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰م، ۲/ ۳۴۸

بلکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی بقایا زندگی میدان جہاد میں گزاری۔ دیکھا جائے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی جوانی امت مسلمہ کی علمی و مدنی خیر خواہی میں بسر کی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

حضرت عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب بن ہاشم رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو العباس ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام ام الفضل البا بہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی ولادت ہجرت سے تین سال قبل اس وقت ہوئی جب نبی اکرم ﷺ کو اپنے قبیلے کے ساتھ شعب أبی طالب کی گھاٹی میں محصور کر دیا گیا تھا۔[1] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے بعد ۱۱ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ فطرۃ ذہین اور سنجیدہ تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی مصاحبت آپ رضی اللہ عنہ کو عہد طفولیت میں نصیب ہوئی، آپ ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ،وَعَلِّمهُ التَّأوِيلَ)) [2]

ترجمہ: اے اللہ اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر قرآن کے علم سے سرفراز فرما۔

یہی وجہ تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے دور کے ممتاز علماء میں سے تھے اور کوئی ایسا علم نہ تھا جس میں آپ رضی اللہ عنہ کو مہارت حاصل نہ ہو۔ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، ادب اور شاعری وغیرہ تمام علوم سے بخوبی واقف تھے۔ علم و بصیرت کی بناء پر آپ رضی اللہ عنہ کو "حبر امت"، "ترجمان القرآن" اور "بحر" کا لقب دیا گیا۔[3] آپ رضی اللہ عنہ میں قرآن کے علوم سیکھنے کا فطری میلان تھا اسلیئے آیات قرآنیہ کے ناسخ منسوخ و شان نزول کے بارے میں جس قدر علم آپ کو تھا کسی اور کو نہ تھا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((نَعَمْ تُرْجُمَانُ الْقُرْآنِ ابْنُ عَبَّاسٍ))[4]

ترجمہ: ابن عباس قرآن کے کتنے اچھے ترجمان ہو۔

آپ رضی اللہ عنہ کی عمر ۱۳ برس کی تھی جب حضور اکرم ﷺ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ آپ ﷺ کی وفات کے تقریبا دو برس بعد ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دنیا سے کوچ کر گئے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اپنی ذہانت و قابلیت کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی علمی مجلسوں میں بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ برابر شریک ہوتے اور قرآن پاک کے ادراک میں اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بازی لے جاتے۔ آپ رضی اللہ عنہ میں قرآن کے فہم و ادراک کی صلاحیت اس قدر گہری، وسیع اور جامع تھی کہ قرآن

---

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ۱/۳۷

(۲) مسند الإمام أحمد بن حنبل، حدیث نمبر:۲۳۹۶، ۳/۹۵

(۳) الإصابہ فی تمییز الصحابہ، أحمد بن علی بن حجر العسقلانی،(تحقیق : علی محمد البجاوی) دار الجیل، بیروت، ۱۴۱۲ھ، ص:۱۴۱-، ۱۴۳، ۱۴۶

(۴) المستدرک علی الصحیحین، حدیث نمبر:۶۲۹۱، ۳/۶۱۸

کی آیات کا جو مفہوم آپ رضی اللہ عنہ پر واضح ہوتا اس تک کسی اور کی رسائی بہت مشکل تھی۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو آپ رضی اللہ عنہ کی ذہانت و قابلیت سے آشنا کرنے کے لیئے سورۃ النصر کی آیات تلاوت فرمائیں اور لوگوں سے اس کا معنی پوچھا، قولہ تعالی:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾ (۱)

ترجمہ: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے گی اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔ تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

چنانچہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے اور کچھ نے اس آیت کی وضاحت اسطرح سے کی کہ اس میں اللہ تعالی فتح و نصرت کی خوشخبری دے رہا ہے اور پھر اس پر حمد و ثناء کا حکم دیا جارہا ہے۔ جبکہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں پائے جانے والے لطائف و اسرار کو بخوبی سمجھا اور فرمایا اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اشارہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی معنی کی تائید کی۔ غور کیا جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد حیات دین اسلام کی تبلیغ تھا، جب یہ مقصد پورا ہو گیا اور لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہونے لگے تو اب وہ وقت آگیا کہ واپس خدا سے ملنے کی تیاری کی جائے اور مغفرت طلب کی جائے۔ قرآن کی تفسیر میں وسعت ادراک کا یہ ملکہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ میں فطرتا پایا جاتا تھا۔ علم حدیث میں بھی آپ رضی اللہ عنہ کو عبور حاصل تھا، حدیث کی کتابوں میں کثیر تعداد میں روایات آپ رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہیں، یہاں تک کہ آپ رضی اللہ عنہ حدیث کے بہت بڑے حافظ کہلائے جاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اگر کسی قول و فعل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختلاف ہوتا تو وہ آپ رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یہ سب آپ رضی اللہ عنہ کے ذوق علم و جستجو کا نتیجہ تھا۔ (۲)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مختلف اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فیض یاب ہونے کے لیئے دور دراز سفر کیئے اور مصائب و آلام کو برداشت کرتے ہوئے علوم کے موتی جمع کیئے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب سینکڑوں کے حساب سے طلباء کا مجمع آپ کے در پر موجود رہتا اور قرآن، حدیث اور فقہی مسائل سے متعلق درس و تدریس کا سلسلہ ہمہ وقت جاری رہتا۔ اسکے علاوہ خطبہ، تعلیمی مذاکروں اور حلقوں میں آپ رضی اللہ عنہ سے علوم سیکھنے کے لیئے طلباء کا ازدحام رہتا تھا۔ مکہ میں فتاوی فقہ کی بنیاد آپ رضی اللہ عنہ نے رکھی، بڑے سے بڑا عالم بھی آپ رضی اللہ عنہ کے شایان علم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاوس بن کیسان الیمانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

---

(۱) سورۃ النصر: ۱۱۰/۱-۳

(۲) سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم (مہاجرین)، شاہ معین الدین احمد ندوی، اسلامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ص: ۲۴۲-۲۵۲

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپ رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل، معرکہ صفین اور دیگر معرکوں میں نہایت شجاعت اور جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ ۸ھ میں سخت بیمار ہوئے اور دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ امام ابوحنیفہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور فرمایا: ترجمہ: خدا کی قسم آج دنیا سے خبر امت اٹھ گیا۔[1]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت عہد طفولت میں ملی مگر آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے علمی ذوق کی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علوم کے موتی جمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اللہ نے آپ رضی اللہ عنہ کو فہم قرآن کی ایسی صلاحیت عنایت فرمائی تھی کہ آیات کے اسرار ورموز آپ رضی اللہ عنہ پر اسطرح عیاں ہوتے تھے کہ کسی اور کی رسائی ان مفاھیم پر مشکل ہوتی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ لیتے ہوئے اپنی مختصر زندگی کو اشاعت اسلام و تعلیم و تبلیغ میں صرف کرتے ہوئے اصلاح معاشرہ میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح

آپ رضی اللہ عنہ کا نام عامر اور کنیت ابوعبیدہ تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عبد اللہ تھا جبکہ آپ رضی اللہ عنہ دادا کے نام کی طرف منسوب ہو کر ابن الجراح کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت و تبلیغ پر اسلام قبول کیا۔[2] اسلام قبول کرنے کے بعد قریش مکہ کے ظلم و ستم کی بنا پر دو مرتبہ حبشہ کی جانب ہجرت کی پھر آخر کار سب کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے۔

جنگی خدمات:

مدینہ جانے کے بعد مسلمانوں کو قریش کی جانب سے بہت سے معرکوں میں نبرد آزما ہونا پڑا۔ جن میں سے سب سے پہلا معرکہ جنگ بدر ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے نہایت جوانمردی سے اس میں شرکت کی۔ اس معرکہ میں کفار کی طرف سے ان کو اپنے والد کا سامنا کرنا پڑا مگر توحید الٰہی کی خاطر اپنے والد تک کا خاتمہ کر دیا، ان کے جوش ایمانی نے نسبی تعلق کو نظر انداز کر دیا۔ غزوہ احد میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا اور دو کڑیاں چبھ گئیں تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے دانتوں سے کڑیاں نکالنے کی کوشش کی اور اسی اثنا میں آپ رضی اللہ عنہ کے دو دانت شہید ہو گئے مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں دانت تو کیا جان بھی نثار ہو جاتی تو آپ رضی اللہ عنہ کو پرواہ نہ تھی۔ اسی طرح غزوہ خندق، بنو قریظہ، فتح خیبر، جنگ حنین، جنگ ذات سلاسل، فتح مکہ اور دیگر طائف کی جنگوں میں نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا نیز کلمہ حق کو سربلند کرنے کے

---

(۱) الإصابہ فی تمییز الصحابہ، ۴/۱۵۱

(۲) الإستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ۴/۱۷۱۰

لیئے شجاعت و دلیری سے سر گرم عمل رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ملک شام پر کہیں اطراف سے لشکر کشی کی اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو حمص کی سپہ سالاری پر مامور کیا، جسے آپ رضی اللہ عنہ نے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے بخوبی انجام دیا اور کامیابی کا مظاہرہ کیا۔[1]

معاشرتی زندگی:

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بلند اخلاق کے مالک تھے، تواضع، ملنساری، رحم اور مساوات آپ رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے جھلکتے تھے۔ تقوی و زہد تو اس قدر تھا کہ اکثر خوف خدا میں زار و قطار روتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ میں عاجزی کا یہ عالم تھا کہ سپہ سالاری کہ عہدہ پر ہونے کہ باوجود نہایت معمولی وضع قطع میں رہتے اور آپ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں معمولی سپاہی کو بھی اتنی ہی عزت دی جاتی جو کہ سرداروں کو حاصل ہوتی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کا حسن سلوک اللہ کی مخلوق کے ساتھ نہایت شفیق ور حیم تھا۔ اتباع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے علمی لحاظ سے بھی معاشرے کی اصلاح میں خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو "امین الامت" کا خطاب دیا گیا۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍأَمِينًا،وَأَمِينُ هَذِهِ الْأُمَّةِأَبُوعُبَيْدَةَبْنُ الْجَرَّاحِ))[2]

ترجمہ: ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کا امین ابو عبیدہ بن الجراح ہے۔

اہل نجران نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کی کہ کوئی ایسا شخص بھیجا جائے جو انہیں دین اسلام کی تعلیم و تربیت دے چنانچہ ان کی درخواست پر آپ رضی اللہ عنہ کو دینی تعلیم و تبلیغ کے لیئے معلم بنا کر بھیجا گیا۔[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے اختلافات کو سلجھانے میں آپ رضی اللہ عنہ کی کاوشیں بھی کار فرما ہیں، معاملات کی اصلاح کے لیئے اپنی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے بھرپور کردار ادا کیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ملک شام میں طاعون کی وبا اس قدر پھیل گئی کہ بڑے بڑے بزرگان دین بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ البتہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ انے زندگی کے آخری لمحات میں بھی فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری سے بھاگنے سے منع فرمایا تھا اسلیئے آپ رضی اللہ عنہ کے قدم نہ ڈگمگائے مگر پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تاکید پر جابیہ کے مقام پر منتقل ہو گئے۔ باوجود اس کہ طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو گئے، مرض نے ایسی

---

(۱) سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم، ص: ۱۷۰-۱۷۲

(۲) الجامع الصحیح، محمد بن إسماعیل البخاری، کتاب المغازی، باب قصہ اہل نجران، حدیث نمبر: ۴۱۲۴، ۴/ ۱۵۹۲

(۳) سیر السلف الصالحین، إسماعیل بن محمد بن الفضل الأصبہانی، (تحقیق: کرم بن حلمی بن فرحات)، دار الرایۃ للنشر، الریاض، ۱/ ۲۶۰

شدت پکڑی کہ ۱۸ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اٹھاون برس کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ادا کی۔ (۱)

اس بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ متنوع اوصاف کی حامل تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو ہر پہلو سے متعلقہ رہنمائی ملی۔ مذہب، سیاسیات، معاشیات اور سماجیات گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ زندگی کے ہر شعبہ میں مشعل راہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت پاتے ہوئے اشاعت دین اور اصلاح معاشرہ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اہلیت و قابلیت کے مطابق انہیں جس منصب پر بھی فائز کیا بطور معلم، سپہ سالار اور امام وغیرہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا۔ راہ حق میں حائل رکاوٹوں کا جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ ہر طرح کی آزمائش پر صبر واستقامت اور حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ صحابہ کرام نے اپنی جوانی میں معاشرتی، تعلیمی و تعمیری لحاظ سے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ یہ انہیں کی کاوشوں و قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج دین اسلام پورے اقوام عالم میں پھیلا ہوا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہمارے لیئے بہترین نمونہ ہیں۔ چنانچہ دور حاضر میں نوجوان نسل کو انہیں عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیئے اور معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کے لیئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دینا چاہیئے تبھی قوم اخلاقی و سماجی لحاظ سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے اور معاشرہ برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے۔

---

(۱) الطبقات الکبری، ۷/۳۸۵

فصل سوم

اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں

فصل سوم:

اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں

کسی بھی معاشرے میں پیش آمدہ مسائل کے حل میں نوجونوں کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ معاشرے کا تعمیری استحکام نوجوانوں ہی کی بدولت ہے۔ نوجوان نسل جس قدر دینی واخلاقی اقدار کا پیکر ہو گی معاشرہ بھی اسی قدر تہذیب وتمدن سے آراستہ ہو گا۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے افراد معاشرہ کی تربیت واصلاح پر بہت زور دیا ہے۔ اگر معاشرے کے نوجوان با کردار اور تعمیری راستوں پر گامزن ہوں تو وہ معاشرے کی ترقی میں بھرپور کردار ادا کرسکتے ہیں اور معاشرہ خرافات سے پاک ہو کر امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ مگر اس کے لیئے ضروری ہے کہ افراد معاشرہ فرض شناس اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہوں۔ نوجوانوں میں دینی وفکری ارتقاءاور عارضی ودائمی مفادات کا شعور ہونا چاہیئے۔ معاشرے میں صالح اور برے ہر طرح کے نوجوان پائے جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ایسا انداذ اصلاح ہو جو فکری وعملی رجحانات کے ساتھ ساتھ احساس ذمہ داری کو بیدار کرے تاکہ نوجوان ذاتی اصلاح کے ساتھ معاشرتی اصلاح پر بھی مجبور ہوں۔

معاشرے کی ترقی میں نسل نو کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چاہے تو معاشرے کو تعمیری راہ پر گامزن کردے یا قوم کو ذلت کے اندھیرے میں پھینک دے۔ نوجوان نسل کا زندگی کے ہر شعبہ میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ عہد نبوی میں بھی آپ ﷺ نے نوجوانوں کی جسمانی، روحانی واخلاقی تربیت پر بہت زور دیا اور انہیں تمام شخصی کمالات سے مزین کیا۔یہی وجہ تھی کہ نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے معاشرے کی دینی اصلاح کے لیئے ہر طرح کی جانی ومالی قربانی سے گریز نہ کیا، پختہ مومن ومجاہد کی طرح ہر طرح کے فتن کا صبر واستقامت سے مقابلہ کیااور اسلام پورے عرب میں پھیل گیا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جو شعبہ ہائے زندگی کے ہر پہلو پر رہنمائی کرتا ہے، کسی بھی مسئلے کا حل دین الہی میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کے پیروکار نوجوانوں کا ہر دور میں بہت اہم کردار رہا ہے، وہ امت مسلمہ کا ستون اور دین کے علمبردار رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ لشکر اسلام کی عزت وترقی کی کمان بھی نوجوانوں کے ہاتھ رہی ہے۔ نسل نو کے لیے دین اسلام کی نصرت اور امت مسلمہ کی عزت وترقی کی ذمہ داری اٹھانا کچھ ناممکن نہیں اگر وہ اخلاقی، تبلیغی واجتماعی شخصیت میں باکمال ہوں۔

آج معاشرہ بے سکونی وبدحالی کا شکار ہے جس کی وجہ افراد معاشرہ کی جس قدر دین سے دوری ہے اسی قدر اصلاح معاشرہ سے روگردانی ہے۔ معاشرے کی اصلاح کا دارومدار نسل نو کی اصلاح پر ہے۔ نسل نو میں اخلاقی وروحانی تربیت کا فقدان نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ معاشرہ بہت سارے تعلیمی، معاشی اور سیاسی مسائل کا شکار ہے۔ امت مسلمہ کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے، آپس میں نااتفاقیوں کے باعث عالم اسلام کو غیر مسلموں کی طرف سے خطرات لاحق ہیں۔

امت مسلمہ کی عزت وآبرو اور دین اسلام کی نصرت کے لیئے ،ذیل میں نوجوانوں کی چند اہم ذمہ داریوں کا ذکر کیا جاتا ہے نیز عصر حاضر کے چند اصلاحی پہلوؤں کا ذکر کیا جائے گا جن میں نوجوانوں کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔

دعوت وتبلیغ کے لیے نوجوانوں کا سرگرم عمل ہونا:

دور حاضر میں امت مسلمہ کو ہر طرف سے خطرات لاحق ہیں اور مسلمان بے راہ روی کا شکار ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نسل نو اللہ کے راستے میں دعوت وتبلیغ اور جہاد کے لیئے نکلے۔ مسلمانوں کو تخلیق انسان کے مقصد سے آگاہ کریں ،ایمان کی نگہداشت اور صراط مستقیم سے روشناس کرائیں۔ مسلمان اللہ کی ذات پر مکمل یقین رکھتے ہوئے ہمت واستقامت سے آگے بڑھیں گے تو فتح ونصرت انہیں حاصل ہو گی۔ داعی الی اللہ اور مبلغین اسلام کو امت مسلمہ کا افضل ترین شخص گردانہ جاتا ہے اور اسکی اللہ کے ہاں بہت شرف ومنزلت ہے۔ قولہ تعالی:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَأُمَّةٍأُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِوَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (۱)

ترجمہ: تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

امت محمدیہ کو خیر امت کا لقب دیا گیا۔ سب سے افضل امت، سابقہ امتوں میں خاص امتیاز رکھنے والی امت ہے۔ اس فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی دینی ،روحانی واخلاقی اصلاح کا فریضہ سر انجام دیتی ہے۔ برائی سے روکتی اور اچھائی کا حکم دیتی ہے۔ داعی الی اللہ کو اللہ تعالی خاص رحمت سے نوازتا ہے، اور اسکی کہی ہوئی بات کا درجہ سب سے افضل ہے، قولہ تعالی:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًامِمَّ نْدَعَ اإِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ (۲)

ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف اور کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوں

داعیان اسلام کے لیئے دنیا وآخرت کی کامیابی اور اجر عظیم ہے، ایسا ثواب جو کہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ دَعَاإِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنْ الْأَجْرِمِثْلُ أُجُورِمَنْ تَبِعَهُ لَايَنْقُصُ ذَلِكَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا)) (۳)

ترجمہ: جو لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف بلاتا ہے اس کے لیئے اتنا ثواب ہے جتنا اس پر عمل کرنے والے کو ملتا ہے اس سے ان کے اجر وثواب میں کمی نہیں ہوتی۔

---

(۱) سورہ آل عمران:۳/۱۱۰

(۲) سورۃ فصلت:۴۱/۳۳

(۳) صحیح مسلم، کتاب العلم، بَاب مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْسَيِّئَةً وَمَنْ دَعَا إِلَى هُدًى أَوْضَلَالَةٍ، حدیث نمبر: ۴۸۳۱، ۱۳/۱۶۴

اس راستے میں نوجوانوں کے لیے مشعل راہ نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور آپ ﷺ کی صحبت میں تربیت پانے والے اعلی اخلاق و کمالات کے مالک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار، ہمت و بہادری، حق گوئی اور ثابت قدمی نوجوانوں کے لیئے باعث نمونہ ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے راستے میں انہوں نے بڑی بڑی تکالیف دیکھیں مگر اپنے مقصد سے نہ ہٹے اور صبر واستقامت سے دعوت حق پر ڈٹے رہے۔یہاں تک کہ اللہ تعالی نے انہیں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کیا۔ ان مایاناز شخصیات میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہیں دین الہی سے پھیرنے کے لیئے ہر طرح کی جانی ومالی تکالیف دی گئیں لیکن انہوں نے برداشت کیں اور ثابت قدمی کی بے نظیر مثالیں پیش کیں۔ آج نسل نو کو انہیں کی قائم کردہ روایات پر چلتے ہوئے لوگوں کو اللہ کے دین کی دعوت دینی چاہیئے۔ جس کا آغاز خود اپنی ذات سے ہوتا ہے جو کہو اس پر عمل بھی کرو نیز نرم مزاجی اور اچھا اخلاق ہی سب سے مؤثر اسلوب دعوت ہوتا ہے۔ ماحول ومعاشرے کو سمجھتے ہوئے لوگوں کی ذہنی استطاعت کے مطابق مستقل مزاجی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ حکمت ودانائی سے کام لیتے ہوئے پہلے عقیدہ توحید، عبادات اور پھر دیگر جزئیات کی اصلاح کرنی چاہیئے تاکہ لوگ شوق ومحبت سے دین اسلام کی طرف راغب ہوں اور اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار ہوں۔پختہ ایمان والے ہی دنیاوی محبت وآسائش،مال اور اولاد سے بڑھ کر دعوت حق کو بلند کرنے کے لیئے سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے راستے میں نکلتے ہیں البتہ کمزور ایمان والے بزدل ہوتے ہیں، فرائض حق کی ادائیگی میں بہانے ڈھونڈتے ہیں کیونکہ انہوں نے ایمان کا اصلی مزہ نہیں چکھا ہوتا۔

تعلیمی نظام کی اصلاح میں نوجوانوں کا کردار:

تعلیم معرفت حق کا ذریعہ اوررروحانی ومادی ترقی کا سرچشمہ ہے۔ تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا تو انہیں سب سے پہلے تعلیم کی نعمت سے سرفراز کیا، قولہ تعالی:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (۱)

ترجمہ: اور سکھلا دیے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے

تعلیم انسانیت کی معراج ہے اللہ تعالی نے روئے زمین پر انسانوں کی تعلیم کے لیئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو مبعوث کیا جنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں تعلیم کی ترویج واشاعت پر صرف کیں۔ اس جماعت کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ کی

---

(۱) سورۃ البقرہ:۲/۳۱

ذات گرامی ہے۔ آپ ﷺ نے تعلیم کے ذریعے عرب کی تاریکیوں میں دین اسلام کا اجالا کیا۔ اسلامی ریاست میں اسلامی طرز حیات کے مطابق افراد کی سیرت و کردار سنوارنے کا مؤثر ذریعہ علم ہے۔ صحیح نظام تعلیم ہی ہر سطح پر معاشیات، عمرانیات اور سیاسیات میں تربیت یافتہ افراد مہیا کرتا ہے۔

موجودہ دور کے قابل اصلاح پہلوؤں میں تعلیمی نظام کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ مخلوط تعلیم کا اسلامی نظام حیات سے کوئی تعلق نہیں، لڑکے اور لڑکیوں کے لیئے الگ الگ تعلیمی مراکز کا انعقاد ہو۔ نصاب تعلیم کی اصلاح ہونی چاہیئے اس میں اخلاق اور اسلامی طریقہ حیات کے موضوعات پر روشنی ڈالنی کی ضرورت ہے۔ دیکھا جائے تو تعلیم یافتہ لوگوں نے اخلاق کو خیر آباد کہ دیا ہے اسکی بنیادی وجہ ناقص نظام تعلیم ہے۔ مروجہ نصاب تعلیم اور اخلاقی تربیت میں کوئی ربط باقی نہیں رہا۔ ہمارے تربیتی اداروں میں دینی واخلاقی تربیت کا فقدان ہے جس کی بناء پر لوگ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بے راہ روی کا شکار ہیں۔ اساتذہ کی ذمہداری ہے کہ وہ اداروں میں تربیتی واخلاقی ماحول پیدا کریں اور شاگردوں میں اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی گزارنے کی اہمیت کو اجاگر کریں تاکہ وہ تہذیب واخلاق کے دائرے میں پروان چڑھیں، والدین کا احترام ، معلم کے احکامات کی پاسداری، چھوٹوں سے شفقت کرنے والے اور خوش لباس وخوش اخلاق ہوں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نسل نو میں سے ایسی جماعت اٹھ کھڑی ہو جو اصلاح "تعلیم اخلاق" کا بیڑا اٹھائے۔ پہلے خود اس کا نمونہ بنے اور پھر ہر قسم کی تعلیمی مجالس، تعلیمی اداروں اور تعلیمی کمیٹیوں میں اصلاح اخلاق وتربیت کی اشاعت کرے۔

موجودہ تعلیمی اداروں میں تعلیم کا مقصد محض ملازمتوں کا حصول ہے، قومی زبان کو چھوڑ کر انگریزی زبان کو اہمیت دی جارہی ہے، جبکہ انگریزی ایک لازمی مضمون کے طور پر ہونا چاہیئے اور باقی تمام مضامین اردو زبان میں پڑھائے جانے چاہیئں۔ معاشرے میں ایک طبقاتی تفاوت نظر آتا ہے جس میں سماج کے اعلی طبقات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور ان کے بچوں کے لیئے قیمتی ادارے کھولے جارہے ہیں جنہیں مثالی سمجھا جاتا ہے۔[1] جبکہ ہمارے ملک کی زیادہ آبادی غربت وافلاس میں جکڑی ہوئی ہے، غیر مستطیع و متوسط الحال لوگوں کے لیئے اعلی تعلیم حاصل کرنا کسی مصیبت سے کم نہیں۔ چنانچہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کی شرح فیس یکساں ہونا چاہیئے اور فیس کا تناسب کم سے کم ہو تاکہ تعلیم حاصل کرنا ہر فرد کے لیئے آسان ہو۔ اگر نوجوان نسل تعلیم کے ان مسائل کو حل کرنے کا بیڑا اٹھالے اور اپنی ذمہداریوں کو ادا کریں تو ایک حقیقی اسلامی نظریہ حیات پر مشتمل افراد پر اسلامی ریاست قائم کی جاسکتی ہے اور ملک تعمیری وترقیاتی راستوں پر گامزن ہو سکتا ہے۔

---

(۱) تعلیمی مسائل پس منظر اور پیش منظر، الطاف علی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۹۵ء، ص: ۳۷۲-۳۷۳، ۴۳۶، ۴۳۲

قرآن وسنت سے وابستگی اور حلال وحرام کا شعور:

نسل نو کو درست راہ پر گامزن کرنے اور اپنے فرائض کی آگاہی کے لیئے ضروری ہے کہ قرآن وسنت سے گہرا تعلق استوار کیا جائے کیونکہ یہ کامل تعلیمات کا مجموعہ ہیں۔ان میں نوجوان زندگی کے ہر پہلو سے متعلق رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوامَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَاكِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّةَنَبِيِّهِ))(۱)

ترجمہ: میں تم میں دوچیزیں چھوڑ کے جارہاہوں اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت ہے۔

قرآن وسنت کے افہام وتفہیم کی کوششیں اور عملی زندگی میں نفاذ ہی اصلاحی رجحانات کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ان سے وابستگی الفت ومحبت کے جذبات کو ابھارتی اور باہم تنازعات کو ختم کرتی ہے۔جس سے معاشرے میں اتحاد واتفاق کی فضا پیدا ہوتی ہے۔قرآن وسنت میں تربیت وتزکیئہ کا ایسا انداز پایا جاتا ہے جو اپنائیت کا درس دیتا ہے،ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کی ادائیگی کے احساس کو بیدار کرتا اور نفسانفسی کے ماحول کو ختم کرتا ہے۔

نوجوان نسل کی سماجی،اخلاقی اور معاشرتی برائیوں سے نجات کے لیئے ضروری ہے کہ حلال وحرام کا شعور بیدار کیا جائے۔یہی وہ بنیادی چیز ہے جس کا نسل نو کی تربیت میں بہت اہم کردار ہے۔حلال وحرام کا شعور عبادات کی قبولیت اور تحفظ عزت نفس کے لیئے بہت ضروری ہے۔قولہ تعالیٰ:

﴿يَاأَيُّهَاالنَّاسُ كُلُوامِمَّافِي الْأَرْضِ حَلَالًاطَيِّبًاوَلَاتَتَّبِعُواخُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾(۲)

ترجمہ: لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

حلال وحرام کے مابین فرق کا شعور نوجوانوں کو رزق حلال کمانے کی طرف راغب کرتا ہے اور تمام تر حرام ذرائع سے بچاتا ہے۔افراد میں حصول رزق حلال کے ثمرات اور حرام کے نقصانات سے آگاہی ہی معاشرتی اقدار وروایات کو مستحکم کرتی ہے۔معاشرہ رشوت،سود اور پیسہ کمانے کے لیئے ہر ناجائز ذرائع کو اپنانا،بخل اور اسراف جیسی تمام تر برائیوں اور ظلم زیادتی سے بچ جاتا ہے بلکہ ایسے افراد پر مبنی معاشرہ تشکیل پاتا ہے جو خوددار اور کفایت شعار ہوتے ہیں نیز اپنے فرائض وذمہ داریوں

---

(۱) الموطأ،کتاب الجامع،باب النَّهْيِ عَنِ الْقَوْلِ بِالْقَدَرِ،حدیث نمبر:۱۳۹۵، ۵/۳۷۱

(۲) سورۃ البقرہ:۲/۱۶۸

سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ ان تعلیمات کی روشنی میں ایسی نوجوان نسل پروان چڑھتی ہے جو کہ اخلاقی، عقلی وروحانی تمام تر شخصی صفات سے مزین اور اپنے فرائض و ذمہ داریوں کا شعور رکھنے والی ہوتی ہے۔ اصلاح معاشرہ کے لیئے ضروری ہے کہ نوجوانوں میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس پایا جائے۔

نسل نو اور اخلاقی اصول وضوابط کا نفاذ:

اسلام میں اخلاق کو بہت اہمیت حاصل ہے، عقائد و عبادات کے بعد اخلاق پر بہت زور دیا گیا۔ اخلاق و کردار کو سنوارنے کے لیئے اصول وضوابط مہیا کیئے گے، جن کی عملی صورت ہمیں نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی میں ملتی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے اعلی وپایاں اخلاق کا نمونہ پیش کیا، آپ ﷺ کی ذات کو ہمارے لیئے اسوہ حسنہ قرار دیا گیا۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دی، عفوودرگزر سے کام لیا۔ چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں سے ادب کا معاملہ اختیار کیا۔ کبھی کسی سے اپنی خاطر بدلہ نہ لیا بلکہ دین اسلام کی اشاعت کو مقدم رکھا، فتح مکہ کے موقع پر جب کہ حق باطل پر غالب آگیا اور وہ دن آگیا جب کہ کفار مکہ سے ان کے مظالم کا بدلہ لیا جاسکتا تھا مگر آپ نے اعلی اخلاق کا مظاہرہ کیا اور سب کے ساتھ معافی کا معاملہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے اخلاق سے متاثر ہو کر کہیں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور آج اسلام پوری دنیا میں روشن ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَامِنْ شَيْءٍيُوضَعُ فِي المِيزَانِ أَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الخُلُقِ،وَإِنَّ صَاحِبَ حُسْنِ الخُلُقِ لَيَبْلُغُ بِهِ دَرَجَةَصَاحِبِ الصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ))[1]

ترجمہ: میزان میں حسن خلق سے زیادہ کوئی بھاری چیز نہ رکھی جائے گی اور یقینا حسن اخلاق والا شخص روزے دار اور نماز پڑھنے والے کا درجہ پالیتا ہے۔

مسلمانوں میں اخلاق کی اس قدر اہمیت ہے کہ گویا اعلی اخلاقی قدریں اسے عبادات کے درجات تک لے جاتی ہیں اور سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہی شخص گردانہ جاتا ہے جو سب سے اچھے اخلاق کا حامل ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف قولی بلکہ عملی طور پر اپنے کردار سے لوگوں کے لیئے مثال قائم کی۔ دوسروں کو اچھائی کی تلقین کرنا اور خود اس سے دور رہنے والے کی بات میں کبھی اثر نہیں ہوتا اور منفی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جبکہ آپ ﷺ جو کہتے تھے اسے عملا ڈھال کر دکھاتے تھے۔ آپ ﷺ نے خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ۲۷ سے زائد غزوات میں شرکت کی، غزوہ خندق کے موقع پر نہ صرف قیادت کی بلکہ بذات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ خندق کھودی۔ یہ نبی آخری الزمان ﷺ کے اخلاق تھے۔ عصر حاضر میں دیکھا جائے تو ایک مربی یا استاد اخلاقیات و نصائح کو دوسروں کے لیئے تو تلقین کرتا ہے لیکن خود ان سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ آج

---

(۱) سنن الترمذی، بَابُ مَاجَاءَفِي حُسْنِ الخُلُقِ، حدیث نمبر: ۲۰۰۳، ۴/ ۳۶۲

مذہبی و سیاسی قیادت سے نوجوان نسل کیوں بیزار ہے اسلیئے کہ جن باتوں کا درس انہیں دیا جاتا ہے قائدین خود ان سے مکمل آزاد ہیں جس کے منفی اثرات معاشرے میں مرتب ہوتے ہیں اور معاشرہ اخلاقی بدحالی کا شکار ہے۔ نفسا نفسی کا دور دورہ ہے ،ہر شخص ذاتی فائدے کی خاطر دوسرے کے حقوق کسی حد تک بھی پامال کرنے کو تیار ہے۔یہاں تک کہ لوگوں کی جان ومال تک محفوظ نہیں رہے۔ کیانوجوان نسل میں ہمیں عفو درگزر، امانتوں کی پاسداری، صبر واستقلال اور صلہ رحمی جیسی صفات نظر آتی ہیں۔ آج نسل نو کیا دوسروں کی بھلائی کی خاطر اپنے حقوق سے دستبردار ہو سکتی ہے ؟ اگر ایسا ہوتا تو مسلمان دنیا میں مظالم کا شکار نہ ہوتے، قتل وغارت کا خون گرم نہ ہوتا،لوگ ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکے نہ ڈالتے اور عدالتیں مقدمات سے بھری نہ ہوتیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں میں اخلاقی تربیت کو پروان چڑھایا جائے۔ ہر ایک کو دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے آپ کو نمونہ بنا کر پیش کرنا ہو گا تا کہ برائیوں کا انسداد ہو اور اچھائیوں کو فروغ ملے۔ ایک معاشرے کی تنظیم پہلے ایک فرد اور پھر خاندان کے باضابطہ ہونے پر منحصر ہے نیز ایک باضابطہ وبا ادب شخصیت کا حامل انسان ہی معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتا ہے۔

عقائد وایمان کی پختگی:

انسانی زندگی کی اساس عقیدہ کی درستگی اور خالص ایمان ہے ،اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر یقین ہی تمام تر زندگی کا محور ہے۔ حیات انسانی کا یہی وہ بنیادی دائرہ کار تھا جس کی اصلاح کے لیئے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا۔ دین اسلام کے تمام تر عناصر کا انحصار تربیت ایمانی پر ہے ،اگر ایمان پختہ ہو تو انسان گناہوں کے انبار سے بچا رہتا ہے۔ اعمال صالحہ کی قبولیت کا انحصار لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کے حقیقی اعتراف پر مبنی ہے ،اگر اللہ اور اسکے رسول پر ایمان خالص نہ ہو گا تو کتنے ہی نیک اعمال کیوں نہ کر لیئے جائیں بارگاہ الٰہی میں قبول نہ ہوں گے۔ اللہ پر ایمان تبھی مکمل ہو گا جب اللہ کے ساتھ ساتھ اسکے رسول ﷺ کی اتباع کو اپنی عملی زندگی میں ڈھالہ جائے۔ قولہ تعالی:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْأَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَمَاأَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾ (۱)

ترجمہ: جو اطاعت کرے گا رسول کی تو در حقیقت اس نے اطاعت کی اللہ کی اور جو منہ موڑ لے تو نہیں ہم نے بھیجا آپ کو ان پر نگہبان بنا کر۔

---

(۱) سورۃ النساء:۴/ ۸۰

انسان اپنے قول و فعل میں اللہ اور اسکے سول ﷺ کی اطاعت کا پیکر ہو۔ روز مرہ معاملات میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی پیروی ہی سے حقیقی محبت کا اظہار ممکن ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((ثَلَاثٌ مَنْكُنَّ فِيهِ وَجَدَبِهِنَّ حَلَاوَةَالْإِيمَانِ مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّاسِوَاهُمَاوَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَلَايُحِبُّهُ إِلَّالِلَّهِ وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَفِي الْكُفْرِبَعْدَأَنْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ مِنْهُ كَمَايَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ))[1]

ترجمہ: یہ تین باتیں جس کسی میں ہونگیں، وہ ایمان کی مٹھاس (مزہ) پائے گا، اللہ اور اس کے رسول اس کے نزدیک تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں اور جس کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ ہی کے لئے کرے اور کفر میں واپس جانے کو ایسا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو۔

چنانچہ حقیقی محبت کا تقاضا ہی یہی ہے کہ دنیا کی ہر چیز سے محبوب اللہ اور اسکے رسول کی ذات گرامی ہو نیز ان کی تعلیمات واحکامات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالہ جائے۔ کسی سے تعلق جوڑا جائے تو صرف اللہ کے لیئے اور اگر کفر والحاد کی بناء پر توڑا جائے تو بھی صرف ذات الٰہی کے لیئے۔ محبت کی یہی سمت نوجوانوں کو دنیا وآخرت کی کامیابیاں کی طرف لے جائے گی۔

احکامات الٰہی کو جاننے کے لیئے ضروری ہے کہ نسل نو اللہ کی کتاب سے تعلق کو جوڑے۔ ایسی کتاب جو اللہ سبحانہ تعالی کے فرامین اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں نوجوان نسل کو اپنی زندگی کے ہر پہلو معاشی، سیاسی، معاشرتی و اقتصادی غرض یہ کہ ہر گوشہ زندگی پر بھرپور رہنمائی میسر ہو گی، یہ صرف عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ مکمل جامعہ حیات ہے۔ جو اس کتاب سے تعلق کو استوار رکھے گا وہ کبھی سیدھی راہ سے نہ بھٹکے گا۔ البتہ جس نے اس سے روگردانی کی تو گمراہی کا شکار ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج نوجوان طبقہ اللہ کی کتاب سے دوری کی بناء پر صراط مستقیم کی حقیقی راہوں سے ناواقفیت کا شکار ہے، قولی و عملی تقاضوں سے لاعلمی نے ان کی زندگیوں کو انحراف کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ دور حاضر کی صورت حال یہ ہے کہ نسل نو کی زندگیاں دو حصوں میں بٹ گئی ہیں ایک حصہ عبادات کا جو محض ایک رسم کی صورت میں ادا کی جاتی ہیں اور دوسرا حصہ ایسی دنیاوی زندگی پر منحصر ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ عقیدے کی درستگی دین کو دنیا میں ڈھال کر چلنا سکھاتی ہے۔

نسل نو اور خاندانی نظام کا استحکام:

خاندانی نظام نسل انسانی کی بڑھوتری کے لیئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ خاندانی نظام کی پختگی کے لیئے اللہ تعالی نے قرآن وحدیث کے ذریعے بہت سے احکامات وارد کیئے ہیں جن کو نسل نو اگر اپنی زندگیوں میں ڈھال لے تو خاندان انتشار سے

---

(۱) الجامع الصحیح، کتاب الإیمان، باب حلاوۃ الإیمان، حدیث نمبر:۱۶، ۱/۱۴

بچ سکتا ہے اور معاشرہ خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ معاشرتی خوشحالی کا انحصار خاندانی استحکام پر ہے، جس کی بنیاد قرآن و حدیث کی رو سے نکاح شرعی پر رکھی گئی، قولہ تعالی:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ﴾(۱)

ترجمہ: تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیک بخت غلام لونڈیوں کا بھی

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يَامَعْشَرَالشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُأَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ))(۲)

ترجمہ: اے نوجوانوں کی جماعت اگر تم میں سے کسی کو شادی کی قدرت ہو تو اسے ضرور شادی کر لینی چاہیئے کیونکہ یہ آنکھیں نیچے رکھنے اور بدکاری سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

معاشرے کی صحت و پاکیزگی کے لیئے ضروری ہے کہ جو لوگ جسمانی و اخلاقی صلاحیت رکھتے ہوں ان کا نکاح کر دیا جائے تاکہ وہ بے راہ روی اور جنسی شدت کا شکار نہ ہوں اور صالح افراد پر مبنی معاشرہ تشکیل پائے۔ خاندانی نظام کے استحکام کے لیئے اللہ تعالی نے مرد کو عورت کا کفیل بنایا اور عورت کی صنف نازک کی بناء پر مرد کو عورتپر قوام بنایا گیا۔

عصر حاضر میں دیکھا جائے تو نسل نو مال و دولت جمع کرنے کی تگ و دو میں عمر کے بڑے حصے تک نکاح سے محروم رہتی ہے جبکہ اللہ تعالی ایسا نکاح جو صدق و اخلاص سے کیا جائے اس میں اپنے فضل و کرم سے برکت ڈالتا ہے اور مالدار کر دیتا ہے۔ اگر معاشرے میں بے نکاح لوگوں کی تعداد زیادہ ہو تو بہت سارے مفاسد و بے حیائی کے کام جنم لیتے ہیں، ناجائز تعلقات اور شیطانی روش کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ (۳)

ترجمہ: خبردار زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیونکہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے

نکاح کے برعکس زنا فطرتا اور عقلا گناہ عظیم ہے، نسل انسانی کی تباہی کا سبب ہے۔ اس سے معاشرے میں بسنے والے افراد کی عزتیں محفوظ نہیں رہتی اور حیا و غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

---

(۱) سورۃ النور: ۲۴/ ۳۲

(۲) الجامع الصحیح، کتاب النکاح، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم (من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج)، حدیث نمبر: ۴۷۷۹، ۵/ ۱۹۵۰.

(۳) سورۃ الاسراء: ۱۷/ ۳۲

اللہ تعالی نے خاندانی نظام کو احسن طریقے سے چلانے کے لیئے اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیئے ہر طرح کے اقدامات قرآن میں وارد کیئے جیسا کہنکاح، طلاق، عدت، حق مہر، والدین و میاں بیوی کے حقوق اور نان ونفقہ وغیرہ سے متعلقہ بے شمار مسائل ذکر کیئے گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نسل نو کو قرآن وحدیث کے احکامات سے روشناس کرایا جائے۔ اداروں میں نسل نو کی معاشرتی تربیت کے لیئے دروس اور سیمنار کا انعقاد کیا جائے تا کہ وہ علوم وفنون سیکھنے کے ساتھ ساتھ عملا زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کے لیئے اسلامی احکامات جان سکیں۔

نظام حدود وقصاص اور نسل نو کا کردار:

موجودہ دور میں دیکھا جائے تو ہر طرف جنگ وفساد اور قتل وغارت کا خون گرم ہے۔ امت مسلمہ ہلاکت وسرکشی کا شکار ہے۔ اس کا سبب حکومتی سطح پر قوانین کے نفاذ میں پائی جانے والی کمزوریاں ہیں، حکومت بد نظمی کا شکار ہے۔ لوگوں کی جان ومال اور عزتیں محفوظ نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے، ظالم اور قاتل کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ظلم وستم اور نفسانفسی نے لوگوں کے اندر انسانیت اور احساسات کو دفن کر دیا ہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں یہی امت مسلمہ تھی جو کہ ایک جسم کی مانند تھی، جس کے ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا تھا۔ عہد نبوی میں شریعی حدود وقصاص سے متعلقہ احکامات کا نفاذ تھا۔ قولہ تعالی:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: عقلمندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اس کے باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے۔

قصاص میں انسانی زندگی کی بقا ہے۔ اسلام ناحق قتل کرنے والے کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا حکم دیتا ہے۔ تا کہ اس سے باقی زندگیاں محفوظ رہیں۔ قصاص عدل وانصاف کا قانون ہے اور اس میں زندگی ہے۔ عصر حاضر میں جو بد امنی وبے سکونی پھیلی ہوئی ہے اس کا سبب عادلانہ قصاص کے قانون کو نظر انداز کیا جانا ہے۔ جس سے معاشرہ مامون ومحفوظ نہیں رہا اور جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اسی طرح اسلام نے معاشرتی امن کے لیئے حدود مقرر کیں، چور کو چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ قولہ تعالی:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (۲)

ترجمہ: چوری کرنے والا مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو

---

(۱) سورۃ البقرہ: ۲/۱۷۹

(۲) سورۃ المائدہ: ۵/۳۸

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (۱)

ترجمہ: زناکار عورت و مرد میں ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

ان حدود کے نفاذ میں معاشرتی احیاوبقا ہے اور ان کا مقصد دوسروں کے لیئے مجرمین کو عبرت ناک بنانا اور آئندہ کسی کو بھی چوری، ڈکیتی یا زنا وغیرہ سے باز رکھنا ہے۔ کچھ غیر مسلم تحریکیں ان حدود و تعزیرات کے قوانین کو غیر عادلانہ نظام پر مبنی اور ظالمانہ روش قرار دینے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں جبکہ ظالم کے ساتھ نرمی کرنا اور آزادانہ چھوڑ دینا آستین کا سانپ پالنے کے برابر ہے کہ وہ پھر آئندہ کسی اور کو نقصان پہنچائے۔ احتساب و سزا کے نظام کی درستگی ہی معاشرے میں ہونے والے گھناؤنے جرائم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ ایک فرد کو عبرتناک سزا لاکھوں کو آئندہ کے لیئے نصیحت کرا دیتی ہے۔ چنانچہ ان قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کسی ایک فرد سے نہیں بلکہ حکومتی سطح پر پوری جماعت سے ہے۔ نسل نو کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کہتعزیری قوانین کی تائید وحمایت کرے۔ جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں وہ ہر انسانی قانون سے بڑھ کر قانون الٰہی کو ترجیح دیں اور شریعت اسلامی کے علمبردار ہوں۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے اور جرائم کے استیصال کے لیئے ان کا نفاذ بہت ضروری ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو نہایت ہمت و دلیری سے علی الاعلان بغیر کسی رعایت کے جاری کیا جانا چاہیے تاکہ وہ سب کے لیئے عبرت و نصیحت بنے۔

معاشرے میں اتحاد واتفاق کی فضا قائم کرنے میں نسل نو کا کردار:

دین اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں قومی یا گروہی عصبیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام امت مسلمہ میں باہمی محبت والفت، احساس اور اتحاد واتفاق کی رو سے عزت و توقیر نوازتا ہے۔ اسلام وحدت کا دین ہے جو ہر طرح کے لسانی و نسلی عصبیتوں سے خالی ہے۔ اسلام باہم ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو کر، متحد ہو کر زندگی گزارنے کا پیغام دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو دین اسلام میں ایک ہی رب، ایک ہی آخر الزماں نبی حضرت محمد ﷺ، ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا، ایک مہینے میں سب کا روزے رکھنا اور ایک حج کے موقع پر سب امیر و غریب، کالے گورے کا ایک ہی لباس میں کندھے سے کندھا ملاتے ہوئے فریضہ حج ادا کرنا وغیرہ، یہ سب باتیں مسلمانوں کو متحد ہو کر رہنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اللہ کے ہاں بھی تمام بنی نوع آدم برابر ہیں، البتہ اگر کسی کو فضیلت ہے تو تقوی کی بنیاد پر ہے جو جتنا زیادہ پرہیز گار ہو گا اتنا ہی اللہ کے ہاں اس کا درجہ بلند ہو گا۔ قولہ تعالی:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (۲)

---

(۱) سورۃ النور: ۲۴/ ۲

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۰۳

ترجمہ: اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور بکھر نہ جاؤ

مسلمانوں کو باہم مربوط کرنے اور متفق کرنے کرنے لیئے ضروری ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر نازل کی گئی آخری کتاب قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامہ جائے۔ یہ وہ نظام حقیقی ہے جو کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ ذات الہی کی طرف سے ہے اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتا ہے۔ آج مسلمان پارٹیوں، گروہوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، ہر گروہ اور پارٹی کے اندر مزید شیرازہ بندی کا ایک لامحدود سلسلہ جاری ہے۔ عداوتوں، افتراق اور تنازعات کی فضا پھیلی ہوئی ہے۔ ہر انسان وقتی اغراض کے تحت دوسروں سے اتفاق کر لیتا ہے۔ اغراض پوری ہوتے ہی یا ناکامی کی صورت میں اتفاق ختم ہو جاتا ہے اور بغض وعدوات کی نوبت آجاتی ہے۔ اس تمام صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ ہر گروہ اپنی طرف سے بنائے گئے نظام کو ذات الہی سے منسوب کر کے دوسروں پر تھوپتہ ہے، ہر جماعت کے اپنے عقیدات و نظریات ہیں، ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ تمام نوجوانان اسلام ایک پلیٹ فارم پر متفق ہو جائیں۔ البتہ آبائی تقلید اور گروہی تعصب سے ہٹ کر اگر نسل نو اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے غور کرے تو اللہ کی طرف سے بھیجی گئی کتاب قرآن مجید ہی میں ایسا نظام حیات پایا جاتا ہے جو ہر طرح کہ تعصب سے قطع نظر ہو کر تمام مسلمانوں کو متفق کر سکتا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ اس میں تغیر و تحریف کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ قیامت تک کہ مسلمانوں کے لیئے ایسا لائحہ عمل پیش کرتی ہے کہ جس سے تمام نسلی و وطنی تعصبات کا خاتمہ ہو جائے اور تمام مسلمان باہم متفق ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((الْمُسْلِمُ أَخُوالْمُسْلِمِ لَايَظْلِمُهُ وَلَايُسْلِمُهُ))[1]

ترجمہ: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس کو ظالم کے پاس چھوڑتا ہے۔

قرآن کو نظر انداز کرنے کی بناء پر مسلمان امت برباد ہو رہی ہے، افتراق کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ نوجوانان اسلام کو چاہیے کہ وہ صرف ایک اللہ کے بھیجے ہوئے نظام حیات پر عمل کریں تاکہ تمام مسلمان ایک مضبوط رسی کو تھامے ہوئے منظم و متفق ہو جائیں اور ہر طرح کے خطرات سے ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ آج امت مسلمہ کی وحدت ہندی، مصری، بلوچی اور سندھی میں بٹ کر پارہ پارہ ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے غیر مسلم قوتیں اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو رہی ہیں اور مسلمانوں پر غالب آرہی ہیں۔ مسلمان نہ صرف اجتماعی بلکہ انفرادی لحاظ سے بھی بدحالی کا شکار ہیں اور ذلت و رسوائی میں ڈوبے ہوئے ہیں، جبکہ اصلا ان امتیازات کی کوئی حقیقت نہیں۔ نسل نو کو چاہیئے کہ وہ باہمی تنازعات و امتیازات کو ختم کرتے ہوئے پوری دنیا کہ مسلمانوں کو ایک مرکز نظام الہی پر متفق کرے، اللہ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو اپنائے تاکہ امت مسلمہ کا

---

(۱) الجامع الصحیح، کتاب المظالم، باب المسلم أخو المسلم لایظلمہ ولایسلمہ، حدیث نمبر: ۲۳۱۰، ۲/ ۸۶۲

شیرازہ منظم ہو جائے اور وہ مل جل کر غیر مسلموں کے ہتھکنڈوں کو پاش پاش کریں اور انہیں ان کے غلط عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ اسی میں امت اسلامیہ کا بقاو ترقی ہے۔

ذرائع ابلاغ اور نسل نو کا کردار:

ذرائع ابلاغ کو کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی اور بقا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے ذرائع ابلاغ نیکی کے فروغ اور بدی کے خاتمے کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ فکر و نظر کی آزادی کا نام ہے۔ اسلامی نظریہ ابلاغ کے اصول وضوابط تصدیق وتثبیت، مثبت فکر کا فروغ، راست بازی، عدل وانصاف، جرائم کی پردہ فاشی، بے حیائی سے گریز اور بامقصد تفریح کی آزادی پر مبنی ہیں۔ مذہب اسلام ہی ہے جس نے ابلاغ کا تصور پیش کیا۔ یہ ابلاغ ہی کی پہلی صورت تھی جب اللہ تعالی نے فرشتوں کو تخلیق انسانی کے بارے میں بتایا، قولہ تعالی:

﴿وَإِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِإِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (۱)

ترجمہ: جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بھیجنے والا ہوں۔

تخلیق انسانی کا مقصد نہ صرف خدا کی بندگی بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے ہی اس فریضۂ ابلاغ کی ادائیگی شروع ہو گئی تھی، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد بھی دوسروں تک اللہ کا پیغام پہنچانا تھا۔ جن کی آخری کڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور اب اس فریضہ ابلاغ کی ذمہداری نوجوانان اسلام پر عائد ہوتی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا جس میں انٹرنیٹ، ٹی وی، سوشل ویب سائٹس، موبائل اور ریڈیو وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی سنگینی یہ ہے کہ ان پر دیکھے اور سنے جانے والے پروگرامز نہ صرف وقتی اثر رکھتے ہیں بلکہ دیرپا فکری تبدیلیکے حامل ہیں۔ عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ معلومات کے حصول کا ذریعہ کم اور فحاشی و اخلاقی اقدار کی پامالی کا ذریعہ بنا ہوا ہے، جس سے معاشرے میں برائی پھیل رہی ہے۔ میڈیا پر دکھائی جانے والی اکثر اشیاء صرف لطف اندوزی اور لادینیت پر مبنی ہیں جس کی اصل وجہ معتبر علماء دین کا اس میدان کو خالی چھوڑنا اور بے اعتنائی برتنا ہے۔ سیکولرزم کے علمبرداروں نے اور اسلام دشمنوں نے اس میدان کو اپنا ہتھیار بنایا اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ آج کل کے دور کے ساتھ مذہب اسلام نہیں چل سکتا۔ سنت نبوی پر عمل، جہاد اور فرائض اسلام کی جب کوئی اہمیت نہیں تو ان پر عمل کرنا تو بہت دور نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دین سے دور اور بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانان اسلام اپنی

---

(۱) سورۃ البقرہ: ۲/ ۳۰

ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے اس میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں اور اس خلاء کو پر کریں تا کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے ناپاک عزائم کا شکار نہ ہوں اور ان ذرائع کا مثبت استعمال کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ وگرنہ معاشرے میں مغربی رسوم ورواج کا رنگ مزید چڑھتا جائے گا، حیاء اور پردہ اٹھ جائے گا، نسل نو سے غیرت ومردانگی جاتی رہے گی اور عالم اسلام دینی ودنیاوی بدحالی کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ نوجوانوں کو خاموش تماشائی بننے کی بجائے میڈیا و صحافت کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا چاہیئے اور ذرائع ابلاغ کو نبوی منہج پر لاتے ہوئے مسلمانوں کی بہتری کے لیئے اقدامات اور لائحہ عمل تیار کرنے چاہیئے۔ میڈیا بذات خود ایک بری چیز نہیں مگر اصل بات اس کے استعمال اور نیت کی ہے، اسے اسلامی رنگ میں رنگنے کی ہے۔ میڈیا پر ایسے پروگرامز کا انعقاد کرنا چاہیئے جس سے مسلمانوں کی دینی واخلاقی تربیت ممکن ہو اور ذرائع ابلاغ لوگوں کے مسائل کا حل پیش کرنے اور مفید معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنے۔ نوجوان ہی ہیں جو اس بھاری ذمہداری کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور اسے اقوام عالم میں دین اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

اس تمام مذکورہ بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان کسی بھی قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں، یہی وہ طبقہ ہے جو قوم کی بہترین متاع ہوتا ہیں۔ معاشرے کی اصلاح کا دارومدار نوجوانوں پر مبنی ہے۔ جس قدر یہ طبقہ شریعت اسلامی پر عمل کرنے والا اور اخلاقی اصولوں کا پاسدار ہو گا اسی قدر معاشرہ تعمیر وترقی کی راہوں پر گامزن ہو گا وگرنہ قوم کو ذلت ورسوائی میں دھکیلنے والا بھی یہی طبقہ ہے۔ عصر حاضر میں نوجوانوں کو معاشرے کی تعمیر وترقی کے لیئے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھنا چاہیئے اور نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے، جنہوں نے اپنی تمام تر زندگیاں سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور معاشی اصلاح میں وقف کر دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہتے ہوئے ان میں وہ تمام تر تعلیمی وتربیتی اوصاف پائے جاتے تھے جو دوسروں کے لیئے نمونہ بن سکیں۔ انہیں کے صبر واستقامت اور قربانیوں سے آج اسلام کی شمع روشن ہے۔ دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں نسل انسانی کی بقا اور معاشرتی اصلاح پائی جاتی ہے۔ اسوہ حسنہ کو اپنی زندگیوں میں ڈھالنے والے افراد ہی معاشرے کے لیئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں اور معاشرہ امن وآشتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ نسل نو پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی گئی ہدایات عقائد سے لے کر اعمال تک کی روشنی میں زندگی بسر کریں اور اس طرح اتباع کریں کہ دوسروں کے لیئے بھی روشنی کا مینار بن جائیں۔

نوجوانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کی اخلاقی وروحانی اصلاح میں بھرپور کردار ادا کریں۔ جس کے لیئے موجودہ نصاب تعلیم کو اخلاق سے منسلک کرنا بہت ضروری ہے تا کہ ہر تعلیم یافتہ انسان نہ صرف علوم وفنون میں ماہر ہو بلکہ ایک مہذب انسان کی طرح زندگی بسر کرے اور معاشرے میں بداخلاقی کے ناسور سے جان چھوٹے۔ معاشرے کی بقا خاندانی استحکام میں ہے۔ شریعت اسلامی کی پاسداری ہی سے اس فریضہ کو انجام دیا جاسکتا ہے۔ جس میں نکاح، رشتہداروں کے ساتھ تعلقات اور ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کی ادائیگی وغیرہ کے احکامات پر عمل کرنے کا حکم ہے۔ نیز معاشرتی احیا کے لیئے

اسلام کے مرتب کردہ تعزیری قوانین پر حکومتی سطح پر عمل درآمد ہونا بہت ضروری ہے مثلا چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا، زنا کرنے والے کے لیئے کوڑے اور قصاص وغیرہ کے احکامات۔

دور حاضر کے چیلنجز سے نبٹنے کے لیے نسل نو کا باہمی انتشار سے ہٹ کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا بہت ضروری ہے۔ فرقہ واریت اور گروہ بندی کا خاتمہ ایک کتاب اللہ کے لائے ہوئے احکامات کو اپنانے سے ہی ممکن ہے جو کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ ذات الہی کی طرف سے مبعوث کیئے گئے ہیں اور یہی دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کر سکتے ہیں۔ نوجوان نسل کو انفرادی و اجتماعی سطح پر معاشرے کی اصلاح میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔ دین اسلام کی ترویج واشاعت کے لیئے جدید ذرائع ابلاغ سوشل ویب سائٹس، موبائل ایپلی کیشنز وغیرہ کو بروئے کار لانا چاہیئے اور اس میدان کو دشمنان اسلام کے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لیئے خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چینلز پر سائنس دانوں، محققین، علماء، پروفیسرز اور اساتذہ وغیرہ کو بطور ہیرو پیش کرنا چاہیئے اور ان سے اخذ کردہ معلومات اور کارناموں کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کرنی چاہیئے تا کہ نوجوانوں کے لیئے وہ مشعل راہ ہوں اور نسل نو کی اخلاقی وروحانی تربیت ہو سکے۔

باب سوم

مروجہ نظام تعلیم اور اخلاقی اقدار کا جائزہ

فصل اول: تعلیم کی اہمیت و مقاصد

فصل دوم: نظام تعلیم کے بنیادی عناصر

فصل سوم: نصاب تعلیم اور اخلاقی اقدار کا فروغ

فصل اول

تعلیم کی اہمیت و مقاصد

فصل اول:

تعلیم کی اہمیت و مقاصد

تعلیم کی اہمیت:

اللہ تعالی نے اپنی تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو تعلیم و تعلم کے لیئے چنا۔ تعلیم انسانیت کی معراج، حقیقی ذات کی پہچان اورانسان کی روحانی ومادی قوتوں کی نشوونما کا مؤثر ذریعہ ہے۔انسانی افکار و نظریات کی تشکیل و تعمیر اور تہذیب وثقافت کا تحفظ علم ہی کے مرہون منت ہے۔ تعلیم انسان کے دینی و دنیاوی اوج و کمال کا ذریعہ ہے۔ عرب جیسی جاہل قوم تعلیم ہی کے ذریعے اسلام کی روشنی سے منور ہوئی۔اسلام میں تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی اساس قرآن مجید اور اسوہ رسول اکرم ﷺ ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر، اللہ تعالی نے نوع انسان کے لیئے تعلیم کی فضیلت، برتری اور اہمیت کا ذکر کیا۔ جن میں سے چند آیات درج ذیل ہیں۔

ا. دین اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہدایت ورہنمائی کا سرچشمہ اور علم ومعرفت کا ذریعہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر پہلی وحی جس کے نزول سے نبوت کی ابتدا ہوئی، وہیں سے اسلام میں علم کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے، قولہ تعالی:

﴿اقْرَأْبِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْوَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾[1]

ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیااور پڑھیئے کہ آپ کا رب معزز و محترم ہے جس نے قلم سے سکھایا،اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اس آیت میں تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ علم ہی ذات الہی کی معرفت کا ذریعہ ہے اور انسان کا مقام ومرتبہ بلند کرتا ہے۔ اللہ تعالی کا احسان ہے کہ اس نے انسان کو کائنات کی ان چیزوں کا علم عطا کیا، جن سے وہ ناواقف تھا۔ آیت مبارکہ میں نہ صرف تعلیم و تعلم کی ترغیب دی گئی ہے بلکہ اس کے لوازمات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جس سے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک زبانی اور دوسری تحریری۔ خط و کتابت سے

---

(۱) سورۃ العلق:۹۶/۱-۵

تہذیب وتمدن کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ قلم ہی کے ذریعے اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو لکھا گیا اور رہتی دنیا تک باقی رکھی گئیں۔ قلم ہی کے ذریعے علوم وفنون کی تدوین اور حالات واقعات کو سینوں سے نکال کر سفینوں میں محفوظ کیا جاتا ہے ۔اگر قلم نہ ہوتا تو آج دین قائم نہ رہتا اور دنیا کے بھی سارے کام ناتمام رہتے۔

۲. اللہ تعالی نے انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت علم ودانش کی بناء پر دی۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (۱)

ترجمہ: اور خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کا علم دیا۔

اللہ تعالی نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی تو انہیں سب سے پہلے دنیا کی چیزوں کا علم عطا کیا جس سے فرشتے اور باقی مخلوقات نہ واقف تھیں اسی تفوق علمی کی بناء پر انسان کو زمین کی نیابت عطا کی اور باقی مخلوقات پر فضیلت دی گئی۔

۳. اللہ تعالی نے انسان کو ظلمت وتاریکی سے نکالنے کے لیے تعلیم وتعلم کو ذریعہ بنایا یہ انسان کو ہدایت ورہنمائی کی راہوں پر گامزن کرتا ہے اور علم کے حصول سے انسان خیر وشر میں تمیز کر سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَايَعْلَمُونَ﴾ (۲)

ترجمہ: ان سے کہو کیا علم رکھنے والے اور بے علم ایک جیسے ہو سکتے ہیں

وہ لوگ جو ایمان وکفر، حق وباطل اور نیکی وبدی میں تمیز رکھتے ہوں وہی اللہ کے ہاں محبوب ہیں اور جن کو کسی طرح کا علم حاصل نہیں مشرک ونافرمانی میں زندگیاں بسر کر رہے ہیں، ان کی اللہ کے ہاں کوئی قدر ومنزلت نہیں۔ معرفت الہی اور خوف خداہی سے اللہ کے ہاں مقام ومرتبہ بلند ہوتا ہے۔ علم والا کبھی ناجاننے والے کے برابر نہیں ہو سکتا ہے۔

۴. اللہ تعالی کی وحدانیت پر خود اللہ تعالی اور اس کے فرشتوں نیز اہل علم نے شہادت دی ہے:

﴿شَهِدَاللَّهُ أَنَّهُ لَاإِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُوا لْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَالْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۳)

---

(۱) سورۃ البقرہ:۲/۳۱

(۲) سورۃ الزمر:۳۹/۹

(۳) سورۃ آل عمران:۳/۱۸

ترجمہ: اللہ تعالی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں اور اہل علم کا بھی یہی کہنا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں وحدانیت پر سب سے پہلے رب العالمین نے خود اپنی ذات کی قسم اٹھائی پھر فرشتوں کی گواہی جو اللہ کے سب سے قریب ہیں وہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے اللہ کے وحدہ لاشریک ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اسکے بعد فرشتوں کے ساتھ اہل علم کی شہادت کا ذکر کیا گیا جو حکمت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے کائنات کی کھلی نشانیوں میں ذات باری تعالی کو پہچان لیتے ہیں اور اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہاں اہل علم کا ذکر ان کی فضیلت اور برتری کا ثبوت ہے۔ علم اور علم رکھنے والوں کی شان کا اظہار ہے۔

۵. اللہ کے نزدیک کسی بھی انسان کی بڑائی کا معیار تقوی و پرہیز گاری ہے۔ ایمان لانے کے بعد تقوی کا حصول خشیت الٰہی سے ممکن ہے۔ اللہ کا ڈر اور خوف علم والوں میں پایا جاتا ہے۔ پختہ ایمان، تقوی اور اہل علم والوں ہی کو اللہ کے نزدیک رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوامِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُواالْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللَّهُ بِمَاتَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾[1]

ترجمہ: اللہ بلند کرے گا ان کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور علم ان کے درجے اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو

لاعلمی انسان کو جہالت کی طرف دھکیل دیتی ہے جبکہ علم والے ہی ایمان کے نور سے منور ہو سکتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانے کے بعد جس قدر انسان اس کے احکامات کا علم حاصل کرتا جائے گا اتنے ہی اللہ کے ہاں درجات بلند ہوں گے اس کے برعکس علم حاصل نہ کرنے والے گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

حدیث کی روشنی میں:

تعلیم و تبلیغ کے سب سے پہلے داعی نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ آپ ﷺ نے بعثت کے فورا بعد تعلیم و تعلم کے مختلف طریقے اپنا کر مسلمانوں کو علم کی روشنی سے آراستہ کرنے کی بہت کوششیں کی۔ عہد نبوی ﷺ میں تعلیمی سرگرمیوں کے لیئے مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اصحاب علم اپنے علمی شغف کی بناء پر دروس اور علمی حلقوں میں شامل ہو کر اپنی علمی پیاس کو بجھاتے تھے۔ آپ ﷺ نے اہل اصحاب کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اسطرح اٹھایا کہ وہ دوسروں کے لیئے مشعل راہ بن سکیں۔ مکی دور میں آپ ﷺ کی صحبت میں تربیت پانے والے قابل معلمین کی تعداد متعدد ہو چکی تھی۔ ہجرت

---

(۱) سورۃ المجادلہ: ۵۸/۱۱

مدینہ سے قبل مدینہ والوں کی تعلیم کی ذمہ داری نبی اکرم ﷺ نے انہیں معلمینکے سپرد کی تھی۔ اشاعت تعلیم کے لیئے نبی اکرم ﷺ نے اسلامی ریاست کے مرکز کی حیثیت مدینہ کو قرار دیا۔ عرب کے مختلف قبائل دین اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے کے لیئے مدینہ میں آ بسے۔ دین اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور مسلمانوں کو قرآن سکھانے کی ذمہ داری آپ ﷺ کی تربیت میں رہنے والے معلمین نے ہی ادا کی۔ جن کی کاوشوں اور قربانیوں سے اسلام پورے عرب میں پھیل گیا۔

ذیل میں نبی اکرم ﷺ کے چند اقوال و احادیث کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں آپ ﷺ نے تعلیم و تعلم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

۱. آپ ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ العِلمِ فَرِيضَةٌعَلٰى كُلِّ مُسلِمٍ))[۱]

ترجمہ: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

دین اسلام میں تمام مسلمانوں (مرد و عورت) پر فرض کیا گیا کہ وہ ہر وہ علم حاصل کریں جو اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق ہو۔ ایسا علم جس میں مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کی ضمانت ہو اس کو حاصل کرنے کی فرض کی حد تک تاکید کی گئی۔

۲. علم ایک لازوال نعمت اور عطیہ خداوندی ہے۔ اللہ تعالی جس سے راضی ہوتا ہے اسے دین کی سمجھ اور علم و دانش کی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ اس بات کی نشاندہی آپ ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے:

((مَنْ يُرِدْ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ))[۲]

ترجمہ: جن کے واسطے اللہ تعالی بھلائی چاہتے ہیں انہیں دین کی سمجھ عطا کرتے ہیں۔

دین کا فہم و ادراک اللہ تعالی کی خوشنودی کی علامت ہے۔ اللہ تعالی جس سے خیر کا معاملہ چاہے اسی کا راستہ تعلیم و تعلم کی طرف آسان کرتا ہے۔

۳. علم کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ علم حاصل کرنے کو جہاد کے برابر قرار دیا گیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ العِلْمِ فَهُوَفِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى يَرْجِعَ)) [۳]

---

(۱) سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر: ۲۲۴، ۱/۸۱

(۲) الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، حدیث نمبر: ۷۱، ۱/۳۹

(۳) الجامع الکبیر، أبو عیسی محمد بن عیسی الترمذی، (تحقیق: بشار عواد معروف)، دار الغرب الإسلامی، بیروت، ۱۹۹۸م،، أبواب العلم، بَابُ فَضْلِ طَلَبِ العِلْمِ، حدیث نمبر: ۲۶۴۷، ۵/۲۹

ترجمہ: جو علم حاصل کرنے کے لیئے گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ (جہاد) میں ہے۔ جب تک واپس نہ آئے۔

جہاد کی اسلام میں بہت اہمیت ہے یہ دین اسلام کے ان شعائر میں سے ہے جس کا بہت زیادہ اجر و ثواب مقرر کیا گیا کیونکہ اس راستے میں بہت سی تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سے دیکھا جائے تو علم کے حصول میں بھی بہت جدوجہد درکار ہوتی ہے، بہت سی قربانیوں اور کاوشوں کے بعد اس نعمت کا حصول ممکن ہے۔ اسی لیئے حصول علم کو جہاد کے ہم پلہ قرار دیا گیا۔ اور اسی قدر اس کا اجر و ثواب رکھا گیا۔

۴. علم کا سیکھنا عبادت ہے۔ احادیث مبارکہ میں ایک عابد سے عالم کو زیادہ فضیلت دی گئی، جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((فَضْلُ العَالِمِ عَلَى العَابِدِكَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ،إِنَّ اللَّهَ وَمَلاَئِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمَوَاتِ وَالأَرَضِينَ حَتَّى النَّمْلَةَفِي جُحْرِهَاوَحَتَّى الحُوتَ لَيُصَلُّونَ عَلَى مُعَلِّمِ النَّاسِ الخَيْرَ))[1]

ترجمہ: ایک عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے، جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنی آدمی پر۔ اللہ تعالی، اس کے فرشتے اور زمین و آسماں کے رہنے والے حتی کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور مچھلیاں بھی ان عالموں کے حق میں دعا خیر کرتی ہیں۔ جو لوگوں کو خیر و بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں۔

جب کوئی شخص علم سیکھنے کے لیئے نکلتا ہے تو اللہ تعالی کی بنائی ہوئی تمام مخلوقات حتی کہ چرند پرند، مچھلیاں اور چیونٹیاں وغیرہ بھی اس کے لیئے دعائے خیر کرتی ہیں، فرشتے اس کے راستے میں پر بچھاتے ہیں، گویا کہ ہر ارضی و سماوی مخلوق اس کے لیئے دعا گو ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ علم سیکھنے والے اور لوگوں کو خیر و بھلائی کی طرف لانے والے ایسے ہی ہیں جیسے آسمان میں ستارے چمک رہے ہیں اور ان کی فضیلت عابدین پر ایسے ہی ہے جیسے چاند کی ستاروں پر۔ عابد کی نسبت عالم ہزار گنا زیادہ شیطان پر سخت ہوتا ہے۔

۵. جب کوئی شخص علم حاصل کرنے کیے لیئے سفر پر نکلتا ہے تو اللہ تعال اس کے لیئے جنت کی راہ آسان کر دیتے ہیں۔ جنت کا راستہ اور علم کا راستہ دونوں یکساں ہیں۔ ایک عالم جو خود بھی احکامات الہی کو سیکھتا اور عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی بھلائی کے راستے پر چلنے کی دعوت دیتا ہے، روز قیامت جب اسے جنت میں داخل کیا جا رہا ہو گا تو وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کی بھی شفاعت کا ذریعہ بنے گا جو دنیا میں اس کے علم سے شفایاب ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کا دارومدار حصول علم پر ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) الجامع الکبیر، أبواب العلم، بَابُ مَاجَاءَفِي فَضْلِ الفِقْهِ عَلَى العِبَادَةِ، حدیث نمبر: ۲۶۸۵، ۴/۳۴۷

((مَنْ سَلَكَ طَرِيقًايَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا،سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًاإِلَى الْجَنَّة)) [1]

ترجمہ:جو شخص ایسی راہ اختیار کرے جس میں اسے علم حاصل ہو تو اسکی بدولت اللہ اس کے لیئے جنت کی راہ آسان کر دے گا۔

الغرض آنحضرت ﷺ کے کہیں فرامین میں حصول علم کی تاکید کی گئی ہے۔ متعلم اور عالم کے فضائل، جنت کی بشارت، طالب علم کے لیے اللہ کی تمام ارضی و سماوی مخلوقات کا دعا گو ہونا، علم بدرجہ جہاد اور عالم وعابد کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ دین اسلام میں جس قدر علم کی ترغیب دی گئی ہے کسی اور مذہب میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ علم کا پڑھنا اور پڑھانا دن رات کی عبادات سے افضل قرار دیا گیا اور اللہ تعالی نہ صرف معلم کو دنیا میں رفعت وبلندی عطا کرتا ہے بلکہ یوم آخرت میں میں بھی اجر عظیم سے نوازتا اور جنت کا راستہ آسان کرتا ہے۔ عمل علم کے تابع ہے علم والے ہی اپنے اعمال کی اصلاح کر سکتے ہیں وگرنہ جہالت کی تاریکیوں میں گمراہ رہیں گے۔یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے علم کے میدان میں خوب مہارت حاصل کی اور ایسے گراں قدر کارنامے انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک تمام لوگوں نے ان سے فائدہ حاصل کیا۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، بَابُ فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ، حدیث نمبر:۲۲۳، ۱/۸۱

تعلیم کے مقاصد:

دین اسلام کی رو سے تعلیم کی غایت ہر دور کے انسانوں کی اصلاح اور ایک مہذب معاشرے کا انعقاد ہے۔ ہر انسان چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی بستا ہو، مالک حقیقی کی پہچان ہی اصل مقصد حیات ہے۔ تعلیم افکار و کردار کی درستگی کا پیکر ہے۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس سے انفرادی و روحانی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی تحریکات کا ایسا سلسلہ جاری ہوتا ہے، جن کے اثرات پورے معاشرے اور ریاست پر مرتب ہوتے ہیں۔ تعلیم کا منبع اسلامی تعلیمات و تصورات ہیں۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظام تعلیم کا حامل ہے جو نہ صرف عبادات بلکہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ یہ انسان کو اپنی زندگی اسلامی نظریات وتصورات میں ڈھال کر گزارنے کی تربیت دیتا ہے۔ ہر انسان کو اسلامی تعلیمات کو مد نظر رکھتے ہوئے، اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر معاشرے میں نشو ونما پانے کی مکمل آزادی ہے۔ اسی میں انسان کی دنیا و آخرت کی خیر خواہی ہے۔

قرآن وسنت پر مبنی ریاست کے تعلیمی نظام اور تہذیب وثقافت میں انسانوں کی مجموعی فلاح اور بہتری ہے۔ اسلامی فلسفہ حیات اور دور جدید کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیم کے درج ذیل مقاصد کا تعین کیا جاتا ہے۔

معرفت وعبودیت الٰہی:

اللہ تعالی نے انسان کو تمام مخلوقات پر شرف بخشا اور اسے عقل وشعور کی بناء پر اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا تاکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے رب العالمین کو پہچان سکے اور رضائے الٰہی حاصل کرے۔ انسان کو اس کائنات میں اللہ تعالی کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا۔ قولہ تعالی:

﴿وَإِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِإِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾[1]

ترجمہ: اور جب اللہ تعالی نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

اس آیت میں نائب سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کے بعد پہ در پہ آنے والے تمام نوع آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی کا نائب مقرر کیا گیا ہے۔ نائب ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا اسے خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اسکی وہ فرمانبرداری واطاعت کرے اور اسے اقتدار اعلی کا مالک تسلیم کرتے ہوئے مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔ نائب الٰہی ہونے کے ناطے اوامر شریعہ کا نفاذ اور

---

(۱) سورۃ البقرہ:۲/۳۰

دوسروں کو اسکی دعوت کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد ہوتی ہے[1]۔ معرفت ورضائے الٰہی کا پہلا راستہ ہی یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو صحیح معنوں میں نیابت الٰہی کا اہل ثابت کرے۔

اسلام کی رو سے تعلیم صرف معلومات کی فراہمی کا نام نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک جزو ہے اور حیات انسانی کا مقصد عبادت الٰہی اور اللہ اور انسان کے درمیان مضبوط تعلق استوار کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّالِيَعْبُدُونِ﴾ (۲)

ترجمہ: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

ایسا علم جو انسان کو خالق کائنات کا صحیح عبادت گزار بندہ بنائے وہی سب سے زیادہ مستحسن ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اللہ تعالی نے انبیاء ورسل علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا۔ انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کتابیں نازل کیں تاکہ انسان اطاعت وعبادت الٰہی کے صحیح طریقے جان سکے۔ عبادت صرف رکوع وسجود نہیں بلکہ زندگی کہ تمام امور میں اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کی پیروی کرنا اور ہر کام میں اس کی رضا کو مقصد حیات بنالینا عبادت ہے۔ عبادت کے اسی مفہوم کو قرآن مجید میں اسطرح بیان کیا گیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۳)

ترجمہ: (اے محمد) کہہ دیجیئے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موتسب کچھ رب العالمین کے لیے ہے۔

یہی توحید کا اصل نمونہ ہے جس میں تمام ترمالی وبدنی عبادات کو خالصتہ اللہ کے لیے کرنا، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانا اور اپنا حقیقی معبود جانتے ہوئے صرف اسی کے آگے سر تسلیم خم کرنا۔ نیز انسان پوری زندگی میں اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کا پابند ہو، اس کا جینا مرنا بھی اللہ کی رضا کے لیئے ہو تو ہی عبادت کا صحیح تصور پورا ہو سکتا ہے۔

تزکیۂ نفس:

نفس کے معنی جان، روح، ذات، حقیقت شے اور انسان کے ہیں[4] جب اس کے ساتھ تزکیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد نفس کے اندر جو غلط افکار ونظریات جڑ پکڑ گئے ہیں انہیں اکھاڑنا اور جاہلی عادات واخلاق نے نفس کے اندر جو

---

(۱) أضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن، محمد الأمین بن محمد المختار، الشنقیطی، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵م، ۱/۲۰-۲۲

(۲) سورۃ الذٰریت: ۵۱/۵۶

(۳) سورۃ الأنعام: ۶/۱۶۲

(۴) مہذب اللغات، مہذب لکھنوی، انجمن محافظ اردو بک ڈپو، نیا محل، منصور نگر لکھنؤ، ص: ۲۶۸

ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں انہیں درست کرنا ہے۔ تزکیہ نفس انسانی کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد میں لگا رہتا ہے۔ تزکیۂ نفس سے مراد نفس کا نشوونما پانا اور اسکی ذیلی کیفیات ہیں۔ قولہ تعالی:

﴿وَمَاأُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌبِالسُّوءِإِلَّامَارَحِمَ رَبِّي﴾[1]

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتی یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے۔

نفس انسانی کو مختلف کیفیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جن میں نفس امارہ، لوامہ، اور مطمئنہ کا شمار ہے۔ انسان اگر گناہ کی طرف راغب ہو اور برائی کا ارتکاب کرے تو نفس کی ایسی کیفیت کو نفس امارہ کہا جاتا ہے۔ پھر اگر اس کا ضمیر اسے ملامت کرے اور وہ توبہ کرے تو ایسی صورت کو نفس لوامہ کہا جاتا ہے۔ توبہ کے بعد گناہوں سے بچنے اور پاکیزگی کی جو کیفیت ہے اسے نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔ انسان کے توبہ کرنے اور گناہوں سے بچنے میں خود اس کا کوئی کمال نہیں کیونکہ اس کا نفس تو اسے برائی کی طرف ابھارتا ہے، نفس کا بالطبع میلان خواہشات حیوانی اور برائی کی طرف ہے۔ یہ رحیمی خداوندی ہے جو اس کو گناہوں سے بچاتی ہے اور انسان اپنے نفس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اللہ کی توفیق سے نفس کے خلاف جہاد کرتا اور مقابلہ کرتا ہے۔ اللہ تعالی اپنے بندوں پر غفور رحیم ہے۔[2]

نفس مطمئنہ کی ہی بیداری کے لیئے تعلیم بہت اہمیت کی حامل ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس انسانی میں پائے جانے والے فجور کے فطری میلانات کو ذائل کرے اور انسان کی سیرت و کردار کو اللہ کے احکامات کی روشنی میں پروان چڑھائے تاکہ نفس کی پاکیزگی اور اللہ کی خوشنودی کا حصول ممکن ہو۔ علم کا تعلق محض علوم وفنون کی فراہمی سے نہیں بلکہ اس کا مقصد تزکیۂ نفس اور انسان کے سیرت و کردار کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا بھی ہے۔ عصر حاضر میں اس مقصد کو نظر انداز کیا جارہا ہے اور تعلیم کا تربیت سے دور دور تک کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام سے تعلیم یافتہ نسل بے راہ روی اور بد کرداری کا شکار ہے۔ تعلیم ہی نفس انسانی کا ایسا تزکیۂ کر سکتی ہے کہ وہ حیوانی میلانات ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشات کو تو پورا کرے مگر اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اعتدال کی روش اختیار کرے۔ شریعت کے طریقوں کو اپناتے ہوئے اللہ سے بغاوت نہ کرے بلکہ اسکی اتباع کرے۔

تزکیۂ نفس سے مراد ترک دنیا یا رھبانیت ہر گز نہیں ہے۔ اسلام رھبانیت کا قائل نہیں بلکہ یہ تو دنیا میں رہتے ہوئے، معاملات زندگی اور خیر وشر کی کشمکش سے گزرتے ہوئے صراط مستقیم پر چل کر زندگی گزارنے کا قائل ہے اور یہی

---

(۱) سورۃ یوسف: ۱۲/۵۳

(۲) احسن التفاسیر، احمد حسن محدث دہلوی، المکتبہ السلفیہ، لاہور، ۱۹۹۶م، ۳/۱۷۳-۱۷۴

تزکیۂ نفس کہلاتا ہے جس کا حصول تعلیم سے ہی ممکن ہے۔ دور حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ نظام تعلیم میں تعلیم کے اس مقصد کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے، جس کے لیئے قرآن وسنت اور عہد نبوی کی تعلیمی روایات سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

تعمیر انسانیت:

اللہ تعالی نے جب انسان کی تخلیق کی اور اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تو اس کی رہنمائی و تربیت کے لیئے انبیاء و رسل علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر دور کے انسانوں کیے لیئے اپنا پیغام پہنچایا اور ہدایت کے مواقع فراہم کیئے۔ قولہ تعالی:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾[1]

ترجمہ: لوگ ایک امت تھے (یعنی توحید پر تھے) (پھر ان میں اختلاف ہوا) تو اللہ نے نبی بھیجے (جو) خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور اتاری ان کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ تاکہ وہ فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان ان باتوں میں جو کہ انہوں نے اختلاف کیا۔

تعلیم کا اولین مقصد اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق انسانوں کی تعلیم وتربیت کرنا ہے۔ انہیں نظریہ وحدت فکر انسانی پر قائم کرنا ہے۔ جبکہ دیکھا جائے تو مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے نہ صرف انبیاء کو جھٹلایا بلکہ ان پر نازل کی گئی کتب میں بھی اپنی مرضی سے تبدیلیاں کیں جو کہ اپنی اصل صورت میں قائم نہ رہ سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی ملت کی بنیاد رکھی جائے جو نبی آخری الزماں ﷺ کے لائے ہوئے دین کو برحق تسلیم کرے۔ اسلام کو ابدی دین قرار دیتے ہوئے وحدت فکر انسانی قائم کرے۔ تعلیمات خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اشاعت وتبلیغ اسلام کو اپنا اولین فریضہ سمجھے۔ قولہ تعالی:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[2]

ترجمہ: تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف لائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔

تعلیم کا مقصد ہی دین اسلام کی روشنی میں ملت کی فکری و عملی تربیت ہے اور ایسی امت کی بنیاد رکھنا ہے جو باقی تمام نوع انسانی کے لیئے عملی نمونہ بنے۔ ہر طالب علم میں یہ شعور بیدار ہونا چاہیئے کہ وہ امت مسلمہ کا ایک فرزند ہے۔ سب لوگ ایک ہی قوم

---

(۱) سورۃ البقرہ:۲/۲۱۳

(۲) سورۃ آل عمران:۳/۱۰۴

کے افراد ہیں۔ دین اسلام ایک ایسا دین ہے جو امت مسلمہ کی وحدت کا تصور پیش کرتا ہے۔ جس کی نظیر ہمیں انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی ملتی ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿وَمَاكَانَ النَّاسُ إِلَّاأُمَّةًوَاحِدَةً﴾[1]

ترجمہ: اور تمام لوگ ایک ہی امت کے تھے

تعلیمات اسلام نسلی، لسانی اور قومی تفریقات کا سخت مخالف ہیں۔ وہ وحدت نسل انسانی کا قائل ہے۔ تمام گروہی تعصبات سے ہٹ کر ایسا دین ہے جو مخلوق اللہ سے شفقت و محبت کا حکم دیتا ہے اور مخلوق سے محبت ہی اللہ سے محبت کا ذریعہ ہے۔ مسلمان چاہے کسی بھی ملک، کسی بھی نسل سے وابستہ ہو وہ جہاں بھی ہے دین اسلام اسے ایک مذہب میں جکڑے ہوئے ہے۔ کہیں بھی ہو وہ امت مسلمہ کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے نظریہ اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا ذمہدار ہے۔ یہی تعلیم وتربیت تمام انسانوں میں اتحاد کی فضا برپا کر سکتی ہے اور ایک متحد قوت بنا سکتی ہے۔ اس نظریہ تعلیم سے غفلت کی بناء پر آج مسلمان افتراق وانتشار کا شکار ہیں اور دشمنان اسلام مسلمانوں کو شکست دینے کی سازشوں میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ دین اسلام کے نظریہ وحدت انسانی کی روشنی میں مسلمانوں کی فکری و عملی تربیت کرنے کی ضرورت ہے۔ نظام تعلیم کو دین کی بنیاد پر یکسانی فکر و ذہن اور باہم ہماہنگی پیدا کرنے کے لیئے اقدامات اختیار کرنے چاہیئے۔ تاکہ مسلمانوں میں یکسانیت پیدا ہو اور باہمی اختلافات وانتشارات کا خاتمہ ہو نیز انسانوں کی تعلیم و تربیت کے ذریعے ایسی تعمیر نو ہو کہ رواداری، محبت و ہم آہنگی اور اخوت وبھائی چارے جیسی صفات پیدا ہوں اور امن و سلامتی اور تحفظ انسانیت پر مبنی معاشرہ تشکیل پائے۔[2]

خداداد صلاحیتوں کی نشوونما:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب تخلیق کیا تو خداداد ذہنی وجسمانی صلاحیتوں سے نوازا۔ ایسی صلاحیتیں کہ شاید جن کا علم انسان کو خود بھی نہیں ہے اور ان سے کام لیتے ہوئے آج دنیائے فانی میں انسان نے بے شمار کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔ تعلیم کا مقصد ان صلاحیتوں کی صحیح رخ پر نشوونما کرنا ہے، ایسے راستے پر لے کر چلنا ہے جس کا تعین قرآن مجید میں صراط مستقیم سے کیا گیا ہے۔

غور و فکر، تعقل و تدبر ایسی خداداد صلاحیتیں ہیں جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشتی ہیں، کائنات میں موجود زمین و آسمان کو مسخر کرنے کے راستے سمجھاتی ہیں۔ انسان دل و دماغ کی قوتوں سے حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کرتا اور پھر نتائج اخذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان صلاحیتوں کی صحیح نشوونما کرنے کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ انہیں کی صحیح یا غلط

---

(۱) سورۃ یونس: ۱۰/۱۹

(۲) عہد نبوی کا نظام تعلیم، غلام عابد خان، عوامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۸ء، ص: ۵۸-۶۲

پرورش سے عمل کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم میں ان کی اسطرح سے نشوونما کی جاتی ہے کہ انسان کبھی ذہنی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی راہ راست سے بھٹکتا ہے بلکہ تہذیب وترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے دنیا میں بے شمار ایجادات وانکشافات کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو دنیا میں انسان نے جتنے بھی کارنامے سرانجام دیئے وہ انہیں صلاحیتوں کے مرہون منت ہیں۔[1]

ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ جسمانی صلاحیتوں کو بھی تقویت دینا اور پروان چڑھانا بہت اہمیت کے حامل ہے۔ اچھی صحت والا انسان ہی اچھا دماغ رکھتا ہے۔ ایک متوازن شخصیت کی تعمیر کے لیئے اچھی صحت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو بے شمار جسمانی نعمتوں سے نوازا جن میں سے چند کا ذکر قرآن مجید میں اسطرح سے کیا گیا ہے:

﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَوَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾[2]

ترجمہ: اسی نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے کہ تم شکر گزاری کرو۔

کان اور آنکھ تعلیم حاصل کرنے کے لیئے ایسے ذرائع ہیں جن کو باقی تمام ذرائع پر زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ انہیں سے انسان علم سیکھتا اور سکھاتا ہے۔ اگرچہ علم سیکھنے میں اور بھی اعضاء وحواس انسانی بھی معاون ثابت ہوتے ہیں مگر باقیوں کی نسبت یہ زیادہ اہم ہیں۔ سماعت وبینائی ایسے حواس ہیں جو انسان کو زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہیں اور جذبہ شکر خداوندی پیدا کرتی ہیں۔ اللہ تعالی نے تمام صلاحیتوں کو اظہار کے لیئے تخلیق کیا جیسا کہ بولنا، اس قوت گویائی کے پیچھے فہم وادراک، عقل وشعور جیسی ذہنی قوتیں کارفرما ہیں۔ اسی طرح لکھنا بھی اظہار کی ایک اور صورت ہے، اللہ تعالی نے انسان کو قلم کے ذریعے لکھنا سکھایا تاکہ اس قابلیت سے کام لیتے ہوئے علم کی نسل در نسل اشاعت وترقی ہو اور یہی تعلیم کے بقاوتحفظ کا ذریعہ بھی ہے۔ تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو علم کے ذریعے ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال آئے اور وہ انہیں اپنے انفرادی واجتماعی فوائد کے لیئے بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالی کا شکر گزار بندہ بنے۔

اسلامی نظام تعلیم کے زیر تربیت طلباء وطالبات کے لیئے ایسا ماحول اور سرگرمیوں کا انعقاد ہونا چاہیئے کہ ان کی صلاحیتوں کی پرورش ہو سکے اور صحیح معنوں میں معاشرے کی ترقی وخوشحالی کے لیئے بروئے کار لایا جاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں میں علم کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ذہنی وجسمانی نشوونما وتندرستی کے لیئے عملی تدابیر اختیار کی جائیں اور کوئی بھی لائحہ عمل اختیار کرتے وقت اس بات کو لازمی ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ اللہ تعالی نے جن

---

(۱) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، مسلم سجاد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص:۴۱

(۲) سورۃ النحل:۱۶/۷۸

نعمتوں سے نوازا ہے ان کا حساب بھی لے گا۔ یہ وہ فرق ہے جو مقاصد کے حصول کے لیے تدابیر اختیار کرتے وقت اسلامی نظام تعلیم اور کسی دوسرے نظام تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ صلاحیتوں کا صحیح استعمال درست ارادے و مقصد کے تعین پر منحصر ہے۔

سطور بالا میں قرآن وسنت کی روشنی میں، دور حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مقاصد تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے نقطہ نظر سے، اسلامی ریاست میں ایک ایسا متوازن نظام تعلیم ہونا چاہیئے جو کہ معاشرے کے ایک فرد کی روحانی ومادی دونوں لحاظ سے ضروریات کی تکمیل کرے۔ ایسا نہیں کہ اسلام کا مادی واجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ قرآن وسنت میں ایمانیات، عبادات و اخلاقی تصورات کے ساتھ ساتھ دنیاوی لحاظ سے ہر شعبہ زندگی معاشیات وسیاسیات وغیرہ سے متعلق رہنمائی ملتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عصر حاضر میں نظام تعلیم کو دین اسلام کی بنیادوں اور اصولوں پر قائم کیا جائے۔ ان اصولوں اور معیارات کی روشنی میں کسی بھی نظام تعلیم میں ایسی حکمت عملی اپنائی جاسکتی ہے کہ جس سے مقاصد تعلیم کا حصول ممکن ہو اور تعلیم کی کارکردگی عملی سطح پر بہتر اور کامیاب ہو۔

فصل دوم

نظام تعلیم کے بنیادی عناصر

فصل دوم

نظام تعلیم کے بنیادی عناصر

کسی بھی ریاست کے اندر تعلیمی اداروں کے نظم کا ڈھانچہ یکساں، ایک دوسرے سے منسلک اور باہم مربوط ہونا چاہیئے۔ تعلیمی اداروں کا نظام ایسا معیاری ہونا چاہیئے جو ریاست کے تقاضوں کو اجتماعی سطح پر پورا کرنے کے ساتھ ساتھ طلباء کی انفرادی سطح پر بھی روحانی ومادی ضروریات کی تکمیل کرے۔ کسی بھی ملک کے اندر تعلیمی نظام کے مقاصد و نظم کا تعین کرنے میں مذہب کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی ریاست میں تعلیمی اداروں میں شریعت الٰہی اور قرآن وسنت کی بنیاد پر اسلامی نظام تعلیم قائم کیا جائے گا۔ جیسا کہ دین اسلام کی رو سے طالبات کے لیئے تعلیم کے ہر مرحلے میں الگ ادارے قائم کیئے جائیں۔ اسلام مخلوط نظام تعلیم کی اجازت نہیں دیتا وغیرہ۔ ڈھانچہ طے کرتے وقت مذہبی تعلیمات کے ساتھ طلباء کی عمر، نفسیات، جذباتی وجسمانی تقاضے اور ملی و قومی ضروریات کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں جو بھی نظام تعلیم رائج ہو گا اسکے بنیادی عناصر جیسا کہ استاد، نصاب، طالب علم وغیرنام کی حد تک تو یکساں ہوتے ہیں البتہ کیفیت اور نوعیت کے لحاظ سے ایک الگ ہی نظام تشکیل دیا جاتا ہے۔ ذیل میں چند تعلیمی عناصر کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو اسلامی اقدار کے احیاء اور تعلیم وتربیت میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

استاد:

نظام تعلیم میں سب سے اہم اور مرکزی کردار استاد کا ہوتا ہے۔ کسی بھی نظام تعلیم میں تعلیمی مقاصد کا حصول اور تعلیمی منصوبوں کا عملی نفاذ استاد کے تعاون وعدم تعاون پر منحصر ہوتا ہے۔ استاد ملت کا محافظ ہوتا ہے استاد ہی ہے جو طلباء کو دینی واخلاقی لحاظ سے پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ انہیں معاشرے کی ترقی کے لیئے تعمیری راستوں پر بھی گامزن کرتا ہے۔ قوم کی کامیابی وناکامی کا دارومدار استاد پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے نظام تعلیم میں استاد کی بہت اہمیت رہی ہے اور اسکی اپنی تدریس وتربیت کے لیئے خصوصی انتظام کیئے جاتے رہے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں استاد کی اہمیت ومقام:

طلباء کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری استاد پر عائد ہوتی ہے جو کہ ایک بہت بڑا اور مقدس فریضہ ہے۔ یہ شیوہ پیغمبری ہے۔ اسی فریضے کی انجام دہی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو بطور معلم بھیجا گیا، جس سے اس پیشے کے تقدس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کو اللہ تعالی نے لوگوں کی رہنمائی اور دینی ودنیاوی اصلاح کے لیے معلم کی حیثیت سے مبعوث کیا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آپ ﷺ کو بطور معلم انسانیت پیش کیا گیا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿لَقَدْمَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْبَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًامِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوعَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾[1]

ترجمہ: بیشک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑااحسان ہے کہ انہیں میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

گویا آپ ﷺ کو تمام بنی نوع انسان کے لیئے رہبر، ہادی و معلم بنا کر بھیجا گیا۔ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی علم و حکمت کی اشاعت و تبلیغ تھا۔ آپ ﷺ کو لوگوں کی دینی واخلاقی تربیت، تزکیۂ نفس، اصلاح عامہ اور اللہ کے دیئے ہوئے نظام حیات کے نفاذ کے لیئے بھیجا گیا۔ اللہ تعالی نے خود آپ ﷺ کو علم و حکمت سکھایا اور پھر قیامت تک کہ انسانوں کے لیئے معلم بنا کر بھیجا۔ دنیا کہ تمام قدیم وجدید علوم کا منبع ومرکز وحی الٰہی ہے۔

استاد قوم کا معمار ہے۔ علوم ومعارف کے انتقال کا ذریعہ معلم ہے۔ اسلام نے اس کو جو مقام و مرتبہ دیا اور اس کی قدر و منزلت کا جس طرح اہتمام کیا وہ کسی اور دین میں نہیں ملتا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ، كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا، وَلَا دِرْهَمًا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ))[2]

ترجمہ: عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو تمام تاروں پر اور عالم نبیوں کے وارث ہیں، انبیاء کی میراث نہ دینار تھا، نہ درہم، ان کی میراث علم تھی پس جس نے وہ حاصل کیا اس نے بہت حصہ حاصل کیا۔

اسلام میں معلمین کے فریضۂ تعلیم واشاعت کی وجہ سے انہیں بہت قدر و منزلت دی گئی اور انہیں خبردار بھی کیا گیا کہ تعلیم کو دوسروں تک پہنچانے میں بخل سے کام نہ لیا جائے اور بغیر کسی عوض و معاوضہ کہ جس قدر ہو سکے علم کو پھیلایا جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ عہد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلم کی حیثیت سے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا ہوتا تھا، انہیں مسلمانوں کو قرآن سکھانے کے لیئے مختلف علاقوں میں بطور معلم کے بھیجا جاتا تھا نیز ان کی تعلیمی اہلیت کو مد نظر رکھتے ہوئے سرکاری عہدوں پر بھی فائز کیا جاتا تھا۔ الغرض اسلام نے اساتذہ کو معاشرے میں جو قدر و منزلت دی اس کا اثر آج بھی باقی ہے اور معلمین کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۶۴

(۲) سنن أبي داود، کتاب العلم، بابُ الْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ، حدیث نمبر: ۳۶۴۱، ۳/ ۳۱۷

((مُعَلِّمُ الْخَيْرِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ كُلُّ شَيْءٍ حَتَّى الْحُوتُ فِي الْبَحْرِ)) [1]

ترجمہ: معلم خیر کے لیے تمام چیزیں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔

استاد کی ذمہ داری صرف کورس پڑھانا نہیں بلکہ ان کی اخلاقی وروحانی تربیت کرنا بھی ہے جس کے لیئے ضروری ہے کہ وہ خود پہلے ان کے لیئے عملی نمونہ بنے، اس کے قول وعمل میں مکمل مطابقت پائی جائے۔ اچھی عادات وخصائل کا پیکر ہو، سادہ شعار، اپنی ذمہ داری کا احساس کرنے والا،، خوف خداوندی اور یوم آخرت کی جواب دہی کا شعور رکھتا ہے۔

مثالی معلم کے اوصاف حمیدہ:

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک معمار قوم میں جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱) اسلامی روایات کے مد نظر ایک معلم نہ صرف علم وفضل کا مرجع ومربی ہوتا ہے بلکہ تقوی وپرہیز گاری میں بھی اعلی درجے ومقام کا حامل ہوتا ہے۔ معلم کے تعلیم وتعلم کا مقصد رضائے الہی ہوتا ہے وہ اللہ کی خوشنودی کے لیئے مخلص ہو کر طلباء کو تعلیم سے آراستہ کرتا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَمَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ [2]

ترجمہ: اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے جو بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی میں۔ اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔

معلم علم کو دوسروں تک پہنچانے کے راستے میں تمام تر محنتیں اور قربانیاں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے ۔یہی نیت ومقصد اس کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے کیونکہ ایسے ہی معلمین کے لیئے اللہ تعالی اپنے رحم وکرم اور عنایتوں کے دروازے کھولتا ہے۔

۲) استاد اعلی سیرت وکردار کا پیکر ہوتا ہے۔ جو کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس کے قول وعمل میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے کیونکہ اسلامی معاشرہ بے عمل معلم ومفکر کو تسلیم نہیں کرتا۔ معاشرے میں با عمل استاد کو ہی عزت وتکریم ملتی ہے اور ایسے ہی استاد کو رہنما وہادی مانا جاتا ہے۔ اچھے کردار کا مالک معلم ہی دینی واخلاقی اقدار سے طلباء کو آراستہ کر سکتا ہے۔

۳) آج کا استاد احوال دنیا سے واقف ہو، بدلتے حالات کے تقاضوں کو سمجھتا ہو۔ نئی نئی تحقیقات سے متعلق علم رکھتا ہو۔ اسے مطالعہ کا شوق اور عادت ہو، اپنے خصوصی مضمون سے متعلق اتنا علم رکھتا ہو کہ طلباء کی بحسن وخوبی تدریس کر

---

(۱) سنن الدارمی، باب فی فضل العلم والعالم، حدیث نمبر: ۳۵۵، ۱/۳۶۳

(۲) سورۃ البقرہ: ۲/۲۰۷

سکے۔ نیز اپنے مضمون کے علاوہ دین کا بھی ضروری علم رکھتا ہو، تاکہ طلباء کو پیش آنے والے ہر مسئلے کیا سلامی تعلیمات کی روشنی میں رہنمائی کر سکے۔

۴) استاد ملت کا محافظ ہے، اپنے آپ کو قوم کا امین اور مسئول سمجھتے ہوئے، معاشرے کی خوشحالی میں اہم کردار ادا کرنا چاہیئے۔ اچھا استاد زیادہ سے زیادہ اجتماعی معاملات کو پیش نظر رکھتا ہے اوان کو حل کرنے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ وہ طلباء کو علوم و معارف سکھانے کے ساتھ ساتھ ان کو پیش آمدہ معاشرتی مسائل سے بھی آگاہ رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کی ایک خیر خواہ، ہمدرد اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔

۵) بہترین معلم فن تدریس سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ اسے طلباء کو ان کی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق پڑھانے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ تدریس کے دوران جدید ذرائع کے استعمال سے آگاہ ہوتا ہے اور طلباء کے تعلم کے معیار کو بلند کرتا ہے۔ معلم طلباء کے فطری میلانات اور دلچسپیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو بہتر طریقے سے انجام دیتا ہے۔ طلباء کے اذہان کسی وقت بات سننے کے لیئے تیار ہوتے ہیں اور کسی وقت نہیں ہوتے، چنانچہ ان کے میلانات کو سمجھتے ہوئے اس وقت بات کہی جائے جب وہ سمجھنے کے لیئے تیار ہوں اور انہیں بات سننے کے لیئے مجبور نہ کیا جائے۔ تدریس کے لیئے طلباء کی ذہنی آمادگی کا ہونا بہت ضروری ہے، اس لیئے استاد کو چاہیئے کہ وہ تعلم کے دوران طلباء کی نفسیاتی کیفیات کو مد نظر رکھے۔ استاد کا طلباء کے ساتھ انداز گفتگو بہت شیریں، نرم اور آسان فہم ہونا چاہیئے، جو ہر طرح کے ذہن کے لیئے باعث قبول اور پر اثر ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((يَسِّرُوا وَلاَ تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا، وَلاَ تُنَفِّرُوا)) (۱)

ترجمہ: آسانیاں بہم پہنچاؤ، شدائد میں مبتلا نہ کرو، خوشخبری دو متنفر نہ کرو۔

طلباء کو مایوسیوں سے دور رکھنا، مشکلات و شدائد سے بچانا استاد کا کام ہے۔ آسان راہیں اور امید کی کرنیں طلباء کے لیئے حوصلہ افزائی کا ذریعہ ہوتی ہیں اور انہیں تعلیم کے حصول کے لیئے محنت ومشقت کی طرف راغب کرتی ہیں۔ بہترین طریقہ ہائے تدریس اپنانے والا استاد ہی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے اور وہی طلباء کی بہتر تربیت بھی کر سکتا ہے۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ عصر حاضر میں استاد صرف نام کا معلم ہی کہلایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا کردار طلباء کو محض معلومات کی فراہمی تک رہ گیا ہے، اخلاقی لحاظ سے تربیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ طلباء کے ساتھ ان کا تعلق محض کلاس روم کی حد تک ہے، کلاس سے باہر اسے طالب علم کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء استاد کو ادارے سے باہر وہ مقام نہیں دیتے اور تعلیمی اداروں کے اندر بھی استاد کا وہ مرتبہ نہیں رہا بلکہ انہیں تعلیمی انتظامیہ میں ماتحت ملازم کی سی حیثیت

(۱) سنن اَبی داوٗد، کتاب العلم، بَابُ الْحَثِّ عَلَی طَلَبِ الْعِلْمِ، حدیث نمبر: ۳۶۴۱، ۳/۳۱۷

دی جاتی ہے۔ تعلیمی پالیسیوں، حکمت عملی اور مقاصد تعین کرنے میں ان کو آواز اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں رہا۔ عصر حاضر میں ہونے والی نئی نئی ایجادات نے بھی استاد کے مقام کو گھٹا دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے ایسے ایسے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں جیسا کہ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹی وی اور ریڈیو کہ اب علوم کے حصول کے لیئے استاد کی ضرورت کچھ کم نظر آتی ہے۔ ایک زندہ جاوید شخصیت کے بغیر بھی علم کا حصول ممکن ہو گیا ہے۔

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے معلمین انسانیت کو سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے اور اس فریضے کو مقدس سمجھتے ہوئے، ایک معلم ہونے کی حیثیت سے طلباء کو علوم کی فراہمی کے ساتھ ساتھ، ان کی روحانی و اخلاقی تربیت کی بھی فکر کرنی چاہیئے۔ ریاست کو اسلامی نظام تعلیم کو نافذ کرتے ہوئے استاد کے مقام و مرتبہ کے پہلو کو بھی مد نظر رکھنا چاہیئے۔

طالب علم:

کسی بھی نظام تعلیم میں طالب علم کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اداروں کی بلند وبالا عمارتیں، نصاب سازی، لائبریریاں، اساتذہ کے معیار و مقاصد اور درسی کتب وغیرہ گویا کہ نظام تعلیم کے تمام لوازمات کا محور طالب علم ہے، ان کا مقصد طالب علم کو ایسی بنیادوں پر تعلیم و تربیت دینا ہے کہ جو ان کے لیئے انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر نفع بخش ہو۔

> "مسلمانوں کی تعلیمی روایت میں جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ طالب علم میں ان کا ذوق شوق، محنت و مشقت اور اس کے لیئے دور دراز کے سفر ہیں، یہ اس دور کے مسلمانوں کا مزاج تھا کہ خدا اور رسول کے واضح احکامات کے تحت طالب علم کو ایک مقدس دینی فریضہ سمجھتے تھے۔"(۱)

کسی بھی قوم کی ترقی کا دارومدار، اس میں نشوونما و تربیت پانے والے طالب علموں پر ہوتا ہے۔ طالب علم ہی قوم کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جو کہ اسے تعمیری راستوں پر گامزن کر سکتا ہے۔ اگر کسی قوم کے نظام تعلیم سے فارغ التحصیل افراد میں اپنے حقیقی مقام کا شعور بیدار نہ ہوا ہو یا ان کی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما نہ ہوئی ہو تو ایسا نظام تعلیم اور طالب علم کبھی بھی قوم کے لیئے کار آمد ثابت نہیں ہو سکتے۔ لہذا ضروری ہے کہ معاشرتی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، تعلیمی نظام کی ایسی منصوبہ بندی ہونی چاہیئے کہ جس کے ذریعے طلباء کی انفرادی قوتوں و صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا جائے اور آنے والی نسلوں کو مفید کار بنایا جائے۔ تعلیمی و اقتصادی منصوبہ بندی میں اس قدر ربط ہونا چاہیئے کہ تعلیمی مراحل سے گزرنے کہ بعد، اسی مناسبت سے طلباء کے لیئے ذریعہ معاش کا حصول بھی ممکن ہو۔ اسلامی ریاست ایک ایسی فلاحی ریاست ہو کہ جس میں لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیئے روزگار فراہم ہو، معاشرہ غربت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا شکار نہ ہو۔ چنانچہ تعلیم کے ذریعے طلباء کی اخلاقی و روحانی تربیت ہونے کے ساتھ ساتھ مادی تربیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

---

(۱) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، ص:۱۱۹-۱۲۰

طالب علم اگر تعلیم حاصل کرنے کا مقصد رضائے الٰہی بنالے تو وہ صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے تحصیل علم کے دوران ہر طرح کے مصائب و مشکلات کا سامنا کر سکتا ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قوم کی علمی و مادی ترقی میں بھرپور کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ طالب علم چند اہم خصوصیات کا حامل ہو۔

طالب علم کی خصوصیات:

اچھا طالب علم جسے معاشرے کا قیمتی سرمایہ گردانہ جاتا ہے اور جو قوم کے لیئے نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے، درج ذیل صفات کا حامل ہوتا ہے۔

۱. طالب علم کے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد خوف خدا، تزکیۂ نفس، شریعت کی پابندی، اصلاح کردار اور اسلامی اقدار کا احیاء ہونا چاہیئے۔ جس قدر طالب علم متقی و پرہیز گار ہوتا ہے اسی قدر اس کے لیئے حصول علم آسان اور نفع بخش ہوتا ہے۔ علم کی باریکیوں کو سمجھنے اور قبول علم کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیئے دل کی طہارت، خالص نیت اور کینہ وعداوت سے پاک ہونا ضروری ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ لاَ يَتَعَلَّمُهُ إِلاَّ لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْعَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۱)

ترجمہ: جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی مرضی حاصل کی جاتی ہے اس لیئے حاصل کیا کہ اس سے اپنی کوئی دنیوی غرض حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔

علم حاصل کرنے کے مقاصد میں، اسلام دنیاوی فوائد، ثروت، جاہ و جلال اور پیشوا بننے کی ہوس سے منع کرتا ہے۔

۲. علم کا تعلق شرعی علوم سے ہو یا غیر شرعی علوم سے، ایک طالب علم کے لیئے دونوں سے وابستگی ضروری ہے البتہ علوم دینیہ کو اللہ کی رضا کے علاوہ کسی اور دینی مقصد کے لیئے حاصل کرنا اسلام میں سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ غیر شرعی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور علوم دینیہ پر ناز و تکبر کرنا درست نہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ

" لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں، اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت اپنی تلواروں سے جہاد کیا"۔ (۲)

---

(۱) سنن أبي داوٗد، کتاب العلم، باب فِي طَلَبِ الْعِلْمِ لِغَيْرِ اللّٰہ تَعَالَى، حدیث نمبر: ۳۶۶۴، ۳/ ۳۶۱

(۲) احیاء علوم الدین، حجۃ الاسلام امام غزالی، (مترجم: محمد احسن نانوتوی)، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ص: ۱۶-۱۷

۳. طالب علم کو اخلاق حسنہ سے مامور ہونا چاہیئے، برے اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیئے۔ عفوودرگزر، عدل وانصاف، رحم دلی، حیاءوپاکبازی اور عاجزی وانکساری جیسی صفات کو اپنانے کے لیئے سرگرم رہناچاہیئے، قولہ تعالی:

﴿فَبِمَارَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْكُنْتَ فَظًّاغَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوامِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾[1]

ترجمہ:(اے پیغمبر ﷺ) یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تنگ خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔

ایسی تعلیم جو انسان کہ محض دنیاوی فوائد کے حصول کو مقصد حیات بنائے اور اخلاقی اقدار سے عاری کر دے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اخلاق رذیلہ کو ترک کر دینے والے افراد ہی معاشرتی زندگی کو سنوارنے میں بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کے تعلیمی نصب العین کے حصول کے لیئے، طلباء کا نیک سیرت اور اعلی کردار سے مامور ہونا ضروری ہے۔ حسن نیت اور اخلاص عمل کے پابند افراد ہی کے علم میں برکت کی امید کی جاسکتی ہے۔

۴. طالب علم کو تعلیمی مراحل کے دوران ایسے علوم کا انتخاب کرنا چاہیئے جو غوروفکر کو تقویت دیں اور تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کو بیدار کریں۔ قولہ تعالی:

﴿وَسَخَّرَلَكُمْ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾[2]

ترجمہ: اور آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے تابع کر دیا ہے جو غور کریں یقیناً وہ اس میں بہت سی نشانیاں پالیں گے۔

اللہ تعالی کی بنائی ہوئی تخلیقات کو کھوجنے کے لیئے کاوشیں کرنی چاہیئیں، تاکہ ذات الہی کی پہچان ہو، جذبہ ایمانی کو فروغ ملے اور دلوں میں محبت الہی پیدا ہو۔ تعلیم صرف امتحان میں کامیابی کے بعد نوکری حاصل کرنے تک محفوظ نہ رہے بلکہ اس کے ذریعے طالب علموں کو تحقیقی رجحانات سے بھی واقفیت ہونی چاہیئے۔

۵. طالب علم کو تعلیم کے حصول کے دوران دنیاوی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے، ذہنی و دماغی یکسوئی کے ساتھ تعلیم پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے اور حصول تعلیم کے لیئے جسمانی ومالی قربانیوں سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ صبر واستقلال اور ہمت وبردباری سے کام لیتے ہوئے ہر طرح کی مشاکل کا سامنا کرنا چاہیئے۔ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی یہ روایت رہی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے لیئے دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے، حجاز سے شام، شام سے مصر، ایک ایک حدیث کے لیے پیدل چل کر جایا کرتے تھے۔

---

(۱) سورۃ آل عمران:۳/۱۵۹

(۲) سورۃ الجاثیہ:۴۵/۱۳

تاریخ گواہ ہے کہ عظیم شخصیات جن کو آج بھی ان کے کارناموں کی بدولت سراہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے جوش ایمانی اور علمی لگن کی بدولت، تعلیم کے ایک ایک لقمے کے لیئے سینکڑوں میل پیدل سفر طے کیا اور ہر طرح کی تکالیف و مصائب کو برداشت کیا۔ جیسا کہ امام بخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سولہ برس کی عمر میں تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ آپ اپنی ضعیف والدہ اور بہن کی نگہداشت میں، مختلف شہروں حجاز، شام، بغداد، کوفہ، دمشق اور مصر وغیرہ کے علماء سے علوم حدیث کو حاصل کیا۔ (۱)

علمی سفر سے طلباء کو بہت فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مختلف ملکوں و شہروں کی ریاضتوں اور میل جول سے علمی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ ابن خلدون نے اس بارے میں لکھا ہے:

"علم کی تحصیل کے لیئے سفر کرنے اور مشائخ سے ملنے میں تعلیم میں کمال کا اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ انسان علم، اخلاق، مذہب اور دوسری فضیلتوں کو کبھی تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اور کبھی نقل، تقلید اور میل جول سے، لیکن جو ملکہ میل جول سے حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ قوی اور مستحکم ہوتا ہے۔" (۲)

۶. کھانے پینے اور لباس میں طلباء کو سادگی اختیار کرنی چاہیئے۔ قناعت پسندی کا جوہر اپنانا چاہیئے۔ علم و دانش کے حصول کے لیئے تنگ حالی اور فقر و فاقہ کو بھی صبر سے برداشت کرنا چاہیئے۔ طالب علم کو رزق حلال کھانا چاہیئے۔ کم خوری سے سبق کے فہم و فراست میں آسانی ہوتی ہے اور طبیعت بوجھل نہیں ہوتی۔ ایسی غذائیں کھانی چاہییں جو دل و دماغ کو تقویت دیں۔

۷. طالب علم پر استاد کا ادب واحترام لاگو ہوتا ہے، استاد کو ہمیشہ عظمت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے اور بلند درجہ دینا چاہیئے۔ استاد کے سامنے ادب واحترام اور عاجزی وانکساری سے بیٹھنا چاہیئے۔ بے تکلف مسکرانے اور غیر ضروری باتوں سے گریز کرنا چاہیئے۔ اسے استاد کا کامل مطیع اور خدمت گزار رہنا چاہیئے۔ طالب علم کو جماعت کے نظام اوقات کے علاوہ بھی زیادہ سے زیاد استاد کی صحبت میں علمی مذاکروں اور مجلسوں میں شرکت کرنی چاہیئے۔ (۳)

نصاب:

نصاب تعلیمی نظام کا اہم بنیادی عنصر ہے جس سے کسی بھی تعلیمی نظام کے مقاصد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ طلباء کی فکری تعمیر و تشکیل، روحانی واخلاقی تربیت اور کردار سازی کا انحصار تعلیمی نظام میں متعین کیئے گئے نصاب پر ہوتا ہے۔ طلباء

---

(۱) تھذیب الکمال، یوسف بن الزکی عبدالرحمن، المزی، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۸۰ء، ۲۴/۴۶۳

(۲) مقدمہ ابن خلدون، ص: ۶۲۰

(۳) اسلامی نظام تعلیم، ریاست علی ندوی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو-پی)، ص: ۱۱۵

اور اساتذہ میں باہم ربط نصاب ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ معلومات کا تبادلہ، تحریری و تقریری مشقیں اور امتحانات کا انعقاد انہیں موضوعات پر ہوتا ہے، جن کی نصاب کے اندر تحدید کی جاتی ہے۔

سعید احمد رفیق لکھتے ہیں:

"تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو اس کا اندازہ ہے کہ نصاب تعلیم کس طرح طریقہء تدریس، طریقہ امتحانات، نظم درسگاہ، انتخاب مدرسین، طلباء کی عمر، زمانہ تدریس وغیرہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نصاب تعلیم کا صحیح ہونا کسی قوم کو ترقی کی اعلی منازل تک لے جاسکتا ہے لیکن ایک غلط نصاب تعلیم اس کے اعلی دماغوں کو منتشر اور پریشان کر دیتا ہے۔"(۱)

گویا نصاب ہی سے نظام تعلیم منعکس ہوتا ہے اور تعلیمی نظام کے غرض وغایت معلوم ہوتے ہیں۔ نصاب کا کسی بھی ملک کے نظریہ حیات اور اقدار وروایات سے مطابقت ہونا ضروری ہے۔ پاکستان کا نصاب تعلیم اسلامی اقدار کے احیا اور نظریہ پاکستان کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیئے۔ نظریاتی تشخص کو بحال کرنے والا اور عوام تک تہذیبی و ثقافتی وراثت پہنچانے والا نصاب ہی قوم کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر سکتا ہے۔ البتہ موجودہ دور میں دیکھا جائے تو مروجہ نصاب تعلیم اسلامی نظریہ حیات اور موجودہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے مطابق تعلیم اور عمل دو الگ حیثیتیں ہیں، جن کا آپس میں ربط نہیں۔ مروجہ نظام تعلیم محض مختلف محکموں اور دفاتر کے لیئے عہدیدار تیار کرنے کا اہل ہے۔ اسلامی واخلاقی اقدار کے مطابق طلباء کی تربیت کرنے سے عاری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب سے نظریاتی تقاضوں کے مطابق مقاصد تعلیم کا حصول ممکن بنایا جائے۔ نصاب سازی کے دوران مسلم مفکرین کی آراء اور ماہرین تعلیم کے مقرر کردہ نصاب سے متعلق بنیادی عناصر کو مد نظر رکھا جائے نیز وحی الہی کی تعلیمات کی روشنی میں نصاب، مقاصد تعلیم اور اسلامی اقدار میں باہم ربط پیدا کیا جائے۔

نصاب کے بنیادی عناصر:

نظام تعلیم میں نصاب سازی بہت اہم اور مسلسل عمل ہے، ماہرین تعلیم اور تجربہ کار اساتذہ تجربات اور نتائج کی روشنی میں نصاب متعین کرتے ہیں، جس کے بنیادی عناصر درج ذیل ہیں۔

۱. نصاب سازی میں نظریہ حیات کو بہت اہمیت حاصل ہے تمام علوم کو ایک نظریے و فکر پر مرتب کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں تمام نصابات کی روح اسلام ہے، اسلام میں تعلیم کی ابتدا ہی کلام الہی سے ہوئی، تمام علوم و قوانین

---

(۱) مسلمانوں کا نظام تعلیم، سعید احمد رفیق، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، م ۱۹۶۲، ص:۲۵۵

قرآن مجید میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسلامی تصورات اور وحی الٰہی پر مبنی اصول وضوابط کے مطابق علوم کو مرتب کیا جاتا ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے زندگی کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی بندگی اور زندگی کے ہر مرحلے میں شریعت کے حدود وقیود کا نفاذ کرتے ہوئے دنیاوی زندگی کو اخروی زندگی میں کامیابی کے لیئے بسر کرنا ہے۔یہی وہ فکری محور ہے جس کے گرد قوم کا دستور وآئین اور تعلیمی نظام کے اندر نصاب کو متعین کیا جاتا ہے۔ (۱)

۲. فرد کی شخصیت کی روحانی واخلاقی تربیت اور کردار سازی نصاب سازی کا اہم عنصر ہے۔ نصاب سے ایسے لوازمات فراہم کیئے جاتے ہیں جس سے افراد کے رجحانات اور خداداد صلاحیتوں کی نشوونما ہوسکے اور ان کو ملک کی ترقی وقیادت کے لیئے بروئے کار لایا جاسکے۔

۳. نصاب اور معاشرے میں ربط پیدا کیا جاتا ہے، ایسا نصاب تشکیل دیا جاتا ہے جو معاشرے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہو نیز معاشرتی فلاح وبہبود کا ذریعہ بنے۔ وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کو دیکھتے ہوئے حالات حاضرہ کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا نصاب کا اہم نصب العین ہے۔

نصاب سازی کو بنیادی ارکان وعناصر کے ساتھ مرتب دینے کے لیئے ضروری ہے کہ ایک منظم ومربوط مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جو پورے ملک کہ تعلیمی اداروں کے لیئے نصاب تشکیل دینے کی ذمہداری اٹھائے۔ ماہرین واساتذہ پر مبنی کمیٹیاں بنائی جائیں جن کی آراء اور مشورے سے نتائج واثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے قوم کی ذہنی واخلاقی تربیت اور معاشی واقتصادی نشوونما کے لیئے نصاب سازی کی جائے۔ ایک ہی منبع سے نصاب کا تیار ہونا فکری یکسانیت اور قومی ہم آہنگی کے لیئے بہت ضروری تاکہ تمام نجی وسرکاری تعلیمی اداروں میں اسی نصاب کی پیروی کو یقینی بنایا جائے۔ (۲)

نصاب سازی سے متعلقہ اہم نقاط:

نصاب سازی کے وقت کچھ اہم امور کو مد نظر رکھنا لازمی ہوتا ہے، جن کا تفصیلا ذکر درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۱. نصاب کا مقصد محض معلومات کی فراہمی نہیں بلکہ طلباء میں سوچنے اور فکر کرنے کی صلاحیت کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔ جس کے لیئے ایسے مضامین پر زور دیا جانا چاہیئے جو ان کی ذہنی وتخلیقی خداداد صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں۔یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ادوار میں دیکھا جائے تو علم الکلام، فلسفہ اور منطق جیسے علوم عقلیہ کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ تصوف وسلوک، کلام، نحو، حکمت، حدیث، فقہ اور تفسیر جیسے علوم کا بول بالا تھا۔ ایسے مضامین کو شامل کیا جاتا تھا جو کہ طلباء میں غوروفکر کرنے اور سوچنے کی عادت ڈالے۔ جبکہ عصر حاضر میں دیکھا جائے تو فکری استعداد کے عوامل مفقود

---

(۱) تعلیمی جائزہ اور جائزہ کار، محمد رفیق وڑائچ، اردو سائنس بورڈ، اپر مال لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۱۴۶

(۲) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، ص:۱۲۵

نظر آتے ہیں۔ تاریخ، اعجاز القرآن، منطق اور ادب جیسے علوم سے روگردانی برتی جارہی ہے۔ نتیجتاً طلباء میں معلومات کا تبادلہ تو ہورہا ہے البتہ غور وفکر کی صلاحیتوں کو پروان نہیں چڑھایا جارہا۔

۲. نصاب میں دوسروں کی لکھی ہوئی باتوں کو طلباء کے لیے سمجھنا دشوار نہیں ہونا چاہیئے۔ سوچنے کے ساتھ سمجھنے میں آسانی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بہت زیادہ سلیبس والی کتب بھی شامل نہیں ہونی چاہیئے بلکہ مختصر اور مجمل پہلو کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ ایسی کتب سے طلباء میں غور وخوض کرنے اور قوت مطالعہ کی عادت پیدا ہوتی ہے نیز طلباء درسی کتب کے علاوہ دوسری کتابوں کو بھی پڑھنے کا شوق اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (۱)

۳. نصاب کی تدوین میں ذہنی وجسمانی نشوونما کے ساتھ روحانی واخلاقی تربیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے تاکہ قوم میں مخصوص اخلاقی شعور بیدار ہو اور نظام تعلیم کے ذریعے اخلاقی قدروں کو پروان چڑھایا جاسکے۔ تدریس کے ذریعے طلباء میں جذبہ حب الوطنی، توکل، قناعت، ایثار اور دیگر اخلاق فاضلہ کو فروغ ملے کیونکہ ایک مہذب اور باکردار افراد پر مشتمل قوم ہی ترقی کی راہوں پر گامزن ہوسکتی ہے۔ طلباء کے سلوک اور بدلتے رویات سے نصاب کی موزونیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۴. نصاب تعلیم میں دینی ودنیاوی دونوں طرح کے علوم کو برابری کے تناسب سے شمار کرنا چاہیے۔ دینی تعلیمات کی تحصیل زندگی کو احسن طریقے سے احکام الٰہی کے مطابق گزارنے کے لیئے بہت ضروری ہے۔ علوم دینیہ کے ساتھ فنی وپیشہ وارانہ تعلیم بھی بہت اہمیت کے حامل ہے تاکہ انسان حصول تعلیم کے بعد ذریعہ معاش تلاش کرنے میں کسی دشواری کا شکار نہ ہو۔

۵. نصاب میں وقت اور حالات کے بدلتے تقاضوں کے مطابق مشکلات ومسائل اور ان کے حل کا شمار ہونا چاہیئے۔ نئی نئی ایجادات اور بدلتے حالات کے ساتھ لوگوں کو پیش آمدہ مصائب اور دشواریوں سے آگاہی ہونی چاہیئے تاکہ طلباء ہر آنے والی مشکل کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جیسا کہ عہد نبوی میں جب جنگ وجدال کا بازار گرم تھا تو اس دور کے حالات کے مطابق گھوڑے نہایت جنگی اہمیت رکھتے تھے۔ اس لیئے تعلیمی دورانیہ میں گھوڑ سواری اور دوڑ کی مشقیں کروائی جاتی تھیں۔ اسی طرح جنگی حالات کے پیش نظر نشانہ بازی اور پیراکی کو بھی شامل نصاب رکھا گیا تھا، تاکہ نوجوان نسل مردانہ وار تعلیم کے حصول کے ساتھ دشمنان اسلام کا جوانمردی سے مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ (۲)

---

(۱) مسلمانوں کا نظام تعلیم، ص:۲۶۱-۲۶۳

(۲) عہد نبوی کا نظام تعلیم، ص:۷۸

معاشرہ:

معاشرہ ایک بہت وسیع تصور ہے، تعلیم سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ تعلیم کے عناصر میں سے معاشرہ بھی ایک ایسا عنصر ہے جو نظام تعلیم کی کامیابی یا ناکامی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ درودیوار کا ماحول اور معاشرہ افراد کی ذہنیت، کردار اور شخصیت کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ کوئی بھی تعلیمی ادارہ جس علاقے کے افراد کو تعلیم مہیا کررہا ہوتا ہے ،وہاں کے معاشرے سے اس کا باہم ربط ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے معلمین اور افراد معاشرہ کے مقاصد ہم آہنگ ہوتے ہیں، ان کے درمیان اعتماد کی فضا ہونی چاہیئے تو ہی اسلامی نظریہ حیات اور ملت اسلامیہ کے نظریاتی پہلو کا عملا نفاذ ممکن ہے۔

ایک مثالی معاشرہ ہی افراد کی روحانی وجسمانی تعلیم وتربیت کا ضامن ہے۔ اللہ تعالی نے معاشرہ کی اصلاح اور فلاح وبہبود کا خود بیڑا اٹھایا۔ کتب سماویہ کا نزول اور انبیاء ورسل علیہم السلام کا دنیا میں تشریف لانا دراصل معاشرتی اصلاح کے لیئے عملا اقدامات ہیں۔ دین اسلام کا مقصد ذات باری تعالی کی پہچان اور احکامات الہی کے عملا نفاذ پر مبنی معاشرے کو تشکیل دینا ہے۔

"اسلامی معاشرہ کی وحدت اور اسلامی تہذیب کے تشخص کو قائم رکھنے کی ایک اہم قوت جاذبہ اسلام کا تصور قومیت اور جذبہ اخوت ہے، جس کی اساس کلمہ طیبہ ہے۔"(۱)

عہد نبوی میں مدنی دور کے آغاز میں جس نئے اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس میں ذات الہی کو اقتدار اعلی تسلیم کرتے ہوئے، فکری، اخلاقی، قانونی، معاشی اور تمدنی اصولوں کو فرمان الہی کے تابع کیا گیا تھا۔ معاشرے کی سنگ بنیاد اس نظریے پر ڈالی گئی تھی کہ شریعت الہی ہی ملک کا قانون ہے۔(۲) چنانچہ ایسی اسلامی ریاست قائم ہوئی کہ پورے اجتماعی ماحول میں اللہ کے بتائے گئے احکامات کو اولیت دی گئی، ہر طرف ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کی ادائیگی، ہمدردی، فیاضی اور تعاون کی روح جاری ہونے لگی۔ ایسی پر امن فضا میں افراد معاشرہ کی ذہنی وفکری نظریات کی درستگی کے ساتھ ساتھ روحانی واخلاقی تعلیم وتربیت کا فریضہ بھی ادا ہوتا گیا۔

تعلیم کا مقصد صحت مند اسلامی معاشرے کی تشکیل ہے۔ جس کے لیئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے ذریعے افراد معاشرہ کی اسلامی تعلیمات سے گہری وابستگی اور محبت پیدا کی جائے۔ افراد ایمان، حسن اخلاق اور عمل صالح کا پیکر ہوں۔ افراد کے تزکیۂ نفس اور اسلامی تعلیم وتربیت کے ذریعے ،مہذب اور متوازن شخصیات کی تعمیر کا حصول ممکن ہو۔ اصلاح معاشرہ اور متوازن شخصیات کی تعمیر کے لیئے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو اسلامی تعلیمات کے خطوط پر استوار کرنے اور ملی وقومی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

---

(۱) تعلیم وتدریس، مشتاق الرحمن صدیقی، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص:۵۸

(۲) اسلامی ریاست، ابوالاعلی مودودی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۶۵۸

جب تعلیم مضبوط اسلامی بنیادوں پر اپنا کردار ادا نہیں کر سکتی تو معاشرہ اجتماعی طور پر انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ علم ودانش اور اخلاق و کردار کے معیار ناپید نظر آتے ہیں۔ معاشرے میں افراتفری اور بگاڑ، انسانی فلاح اور ترقی پر کبھی بھی مثبت اثرات مرتب نہیں کر سکتے۔ جبکہ صحت مند ماحول و معاشرے میں رہ کر انسان اپنی علمی کاوشوں سے کائنات کی مختلف اشیاء اور قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔

نظام تعلیم کے ذریعے لوگوں میں عدل وانصاف، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کیادائیگی جیسی تعلیمات کو فروغ دینا چاہیے تا کہ ایک دوسرے کے ساتھ عداوت، بغض و کینہ کا خاتمہ ہو اور محبت، اخوت، بردباری اور انصاف کا بول بالا ہو۔ اسلامی معاشرہ کو دشمنوں کی سازشوں سے بچانے اور باہم اتحاد و اتفاق کی فضاپیدا کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ گروہی اختلافات سے بچا جائے۔ یہ اختلافات مذہبی بنیادوں پر ہوں یا ملکی ہر طرح سے قابل مذمت ہیں۔ علم کے حقیقی معنوں اور درست نظریات پر مبنی اشاعت و تبلیغ پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ قولہ تعالی:

﴿فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوامِنْ مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾[1]

ترجمہ: پھر یہ فرماتے آپس میں اختلاف کرنے لگے، پس کافروں کے لئے 'ویل' ہے ایک بڑے (سخت) دن کی حاضری سے۔

اس آیت میں خصوصا ان لوگوں کے لیئے وعید ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان سے متعلق اختلاف رکھتے تھے اور مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لوگ افراط و تفریط کا شکار تھے، ایک گروہ غلو کرتے ہوئے حضرت عیسی علیہ السلام کو اللہ تعالی کا بیٹا مانتا تھا اور دوسرا گروہ تنقیص کرتے ہوئے نعوذباللہ رسول بھی تسلیم نہیں کرتا تھا اور بہتان طرازی کرتے ہوئے ولد الزنا کہتا تھا۔ ان تمام لوگوں کے لیئے سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ہلاکت ہے ایسے کافروں کے لیئے، روز قیامت ایسے لوگوں کو حسرت اور مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔[2]

گروہی اختلافات مسلمانوں کے عقائد و نظریات پر منفی اثرات ڈالتے ہیں اور آپس میں تنازعات اور جھگڑوں کو فروغ دیتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کی جڑیں کمزور ہوتی ہیں اور دشمن قوتوں کے لیئے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانسنا آسان ہو جاتا ہے، ان کے لیئے راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالی اختلافات اور بدامنی پھیلانے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ نظام تعلیم کے ذریعے لوگوں کے عقائد و نظریات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی ضرورت ہے تا کہ آپس میں تنازعات اور

---

(۱) سورۃ مریم:۱۹/۳۷

(۲) تفسیر مظہری:ص:۳۱۲

خلفشار پیدا نہ ہوں اور اتحاد واتفاق کی فضا برپا ہو۔ جب تک مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ منسلک رہیں گے، دشمنان اسلام اپنے ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

درج بالا بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاشرے سے جب تک ان تمام برائیوں کا انسداد نہیں ہو گا امن وسکون کی فضا برپا نہیں کی جاسکتی۔ نظام تعلیم وتربیت کے ذریعے اسلامی اقدار کا احیاء، نیکی کی ترویج اور بدی سے بچاؤ کو معاشرے میں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ احسن طریقے سے معاشرتی زندگی گزارنے کے لیئے تعلیم کو بہت اہمیت حاصل ہے نیز فروغ تعلیم میں گردونواح کے معاشرتی ماحول کا بہت کردار ہے۔ تعلیم معاشرے کے مجموعی نظریات وافکار کی عکاس ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرہ حصول تعلیم میں بہت سارے مثبت اور منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ دونوں مل کر نسل نو کو اسلامی اقدار سے روشناس کراتے ہوئے، اچھے پاکستانی ہونے کی حیثیت سے زندگی کے لیئے درست لائحہ عمل اختیار کرنے کے اہل بنا سکتے ہیں۔ معاشرہ اور تعلیم مل کر ملک وقوم کو تباہ وبرباد ہونے سے بچاسکتے ہیں اور پاکستان کو جنت کی نظیر بناسکتے ہیں۔

فصل سوم

نصاب تعلیم اور اخلاقی اقدار کا فروغ

فصل سوم:

نصاب تعلیم اور اخلاقی اقدار کا فروغ

نصاب تعلیم کسی بھی قوم کے فکری و ذہنی ارتقاء اور علمی تجربوں کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ یہ ملت کے پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، آئندہ ضروریات و تقاضوں کا ماحاصل ہوتا ہے۔ نصاب کا دینی تصورات، طرز معاشرت اور معاملات زندگی سے بہت گہرا ربط ہوتا ہے۔ نصاب حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے خاص مقاصد کے پیش نظر بنتا ہے۔ بدلتے حالات کے تقاضوں کے تحت نصاب تعلیم میں ترامیم کی جاتی ہیں۔ نصاب تعلیم میں قوم کے اساسی و کلی مقاصد، نوجوانوں کے مستقبل اور حالات کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ وہی نصاب قیمت و اہمیت رکھتا ہے جو ملی مقاصد کے تابع ہو۔ جیسا کہ اگر پاکستان کا نصاب تعلیم قوم کے اساس اسلامی نظریات پر مبنی ہے تو تقدس کے حامل ہے اور اگر اسلامی نظریہ حیات کے تابع نہیں ہے تو قابل احترام بھی نہیں۔ نصاب تعلیم ملی اساسیات کو علمی طرز سے عملی میدانوں میں ڈھالنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ نصاب تعلیم عہد کے تقاضوں اور قوم کے مقاصد سے الگ تھلگ نہیں بلکہ ان کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ مسلم سجاد اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"نصاب کے ذریعے مقاصد تعلیم کے حصول کی ایک مؤثر حکمت عملی ریاست کے ہاتھ میں آتی ہے"۔[1]

عصر حاضر میں پاکستان کے تعلیمی اداروں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے وہ اسلامی نظریہ حیات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاری ہے۔ یہ لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن اور اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے سے عاری ہے۔ اس نصاب تعلیم کے غرض وغایت تو محض دفتری امور چلانے کے لیئے قابل افراد کو تیار کرنا ہے۔ ایسے نصاب سے مقاصد تعلیم کا حصول ممکن نہیں اور یہاخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی رو سے نظریہ اور عمل دو الگ حیثیتیں ہیں، جو بے آہنگ ہیں۔ نصاب تعلیم کا مواد بھی تسلی بخش نہیں ہے اور مختلف سطحوں کے نصاب میں کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔

اس فصل میں عصر حاضر کے تعلیمی اداروں میں مروجہ نصاب تعلیم کا جائزہ لیا جائے گا کہ وہ طلباء میں دینی واخلاقی اسپرٹ پیدا کرنے میں کس قدر معاون ہے۔ نیز کیا موجوہ نصاب عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، نوجوانوں کے مستقبل کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت میں کردار ادا کر رہا ہے۔ ذیل میں اعلی تعلیمی اداروں، سکول، کالجز اور دینی مدارس کے نصاب تعلیم اور اخلاقی تربیت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

---

(۱) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، ص:۱۲۳

اعلیٰ تعلیمی اداروں کا نصاب تعلیم:

اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم کی موجودہ صورت حال کو درج ذیل نقاط میں تفصیلا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا) مملکت اسلامیہ کے نظام تعلیم کا مقصد یقینا قوم کے باشندوں کو اسلامی طرز حیات کے مطابق ڈھالنا، ان کے سیرت و کردار کو سنوارنا اور ہر شعبہ زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات کو اپنانا ہے۔ جبکہ عصر حاضر کے جامعات میں رائج تعلیمی نظام مذہبی دائرے سے خارج اور اخلاقی قدروں کو فراموش کیئے ہوئے ہے۔ یہ محض دنیا کے معاملات زندگی چلانے کے لیئے کارکن تیار کر رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مروجہ نصاب تعلیم سے طلباء میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا نہیں کی جارہی اور یہ طلباء کی اخلاقی و روحانی تربیت کے لیئے کردار ادا نہیں کر رہا۔ طلباء فرض شناسی، ضبط اوقات، عزم واستقلال اور صبر و تحمل جیسی صفات سے بالکل عاری ہیں۔ ایک دوسرے کا ادب واحترام، باہمی محبت و تعاون اور صبر و تحمل جیسی اعلیٰ اخلاقی قدریں مفقود ہیں۔ رشوت خوری، سفارشیں، بلیک میلنگ، فرائض سے جی چرانے والے اور قانون وضوابط کا قتل کرنے والے افراد کے ہاتھوں ملک کی باگ دوڑ چلی گئی ہے۔ معاشرہ فسادات اور بگاڑ کا شکار ہے۔ جس کی اصل وجہ تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم میں اساسی خرابیوں کا پایا جانا ہے۔ عقائد، عبادات و اخلاقیات کو سطحی انداز میں پڑھایا جارہا ہے، عملا ان کی زندگیوں میں ڈھالنے پر غور وخوض نہیں کیا جارہا۔ علامہ بن خلدون نے "تعلیم و تعلم" کے عنوان کے ضمن میں لکھا ہے:

"جاننا چاہیئے کہ انسان حس و حرکت کی قوت رکھنے اور غذاء و مکان کا محتاج ہونے کی حیثیت سے تمام حیوانات کے برابر ہے۔ امتیاز کی چیز صرف فکر و عقل ہے جو اسے عقل معاش، باہمی امانت، قبولو ہدایت، اصلاح آخرت کی طرف متوجہ کرتی ہے"۔ (۱)

ابن خلدون کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو دنیاوی زندگی گزارنے کے لیئے جہاں بنیادی ضروریات غذا، مکان اور لباس کی ضرورت ہے، جس کے لیے فنی و پیشہ وارانہ تعلیم کا حصول ضروری ہے تاکہ روزگار حاصل کر کے اپنی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ آخرت کی تیاری بھی ہر مسلمان کا فرض عین ہے اس فرض کی ادائیگی کے لیئے علوم دینیہ کا حصول ضروری ہے تاکہ اسلامی و خلاقی اقدار کے مطابق زندگیوں کو سنوارا جائے اور عفت وحیاء، پاکبازی، دیانتداری، عدل وانصاف اور راست بازی جیسی صفات سے انسانی زندگی متصف ہو۔

---

(۱) مقدمہ بن خلدون، عبدالرحمن بن خلدون، (مترجم: راغب رحمانی دہلوی)، نفیس اکیڈمی، اسٹریچن روڈ، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۲۲

۲) دیکھا جائے تو نسل نو تعلیم کی اعلی منازل طے کرنے کے باوجود اپنے تہذیب و تمدن سے بہت دور ہیں۔ انسان کی معاشرتی زندگی بے راہ روی کا شکار ہے۔ معاملات زندگی میں اخلاقی قدروں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، جس کی وجہ دین اسلام سے دوری ہے۔ جس قدر انسان اپنے مذہب اسلام سے دور ہوتا گیا اسی قدر اپنی روایات و اخلاقیات کو بھلاتا گیا۔ موجودہ نصاب تعلیم میں دینی تعلیم اور جدید تعلیم کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرتے ہوئے، دو متضاد عناصر کی طرح ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے، جبکہ تعلیم کی یہ آمیزش بالکل درست نہیں۔ اولا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ عنصر ہیں جبکہ اسلامی نقطہ نظر سے دنیا میں دین کو ڈھالنا ہی اصلا تعلیم کا مقصد ہے۔ دوسرا یہ کہ نصاب تعلیم میں جدید تعلیم اور اسلامی تعلیم کا یہ امتزاج مساویانہ نہیں، اس میں دین کی نسبت مغربی عنصر زیادہ طاقتور ہے۔ مغربی کلچر چونکہ عصری عنصر ہے اس لیئے وہ نصاب تعلیم میں زیادہ اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں مغربی اصول و مبادئ پر مبنی علوم و فنون کی تعلیم اس قدر دی جاتی ہے کہ طلباء کہ ذہین و فکر پر مغربی اعتقادات مسلط ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی چیز باوقعت بھی وہی نظر آتی ہے جو مغربی طرز حیات سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء اپنے اسلامی و اخلاقی اقدار کو فراموش کیئے ہوئے ہیں اور مغربی تہذیب کا لبادہ اوڑے ہوئے ہیں۔ مغربی دنیا میں پائی جانے والی خوبیوں کی نسبت، ان میں پائے جانے والے عیوب سے مکمل طور پر آراستہ ہو رہے ہیں[1]۔ جبکہ دوسری جانب ترقی یافتہ مغربی قوموں میں بنیادی انسانی اخلاق بدرجہ اولی نظر آتے ہیں، البتہ امت مسلمہ کی تہذیب و تمدن کے غالب اثرات کے باوجود اعلی اخلاقی قدروں سے عاری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کا نظام چلانے کے لیئے اعلی سیرت و کردار کے حامل افراد کی ضرورت تو انگریزوں کو اپنے ملک میں تھی۔ ہمارے ملک میں تو غلامانہ سوچ اور ذہنیت رکھنے والے افراد تیار کرنے تھے جو اپنا ملک فتح کر کے اپنے ہی ہاتھوں سے اسے دشمنوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور پھر ان کے لیئے، انہی کے طرز پر ملک کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ ایسے ہی اخلاقیات انگریزوں نے یہاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہمارا ملک ایک آزاد مملکت ہونے کے باوجود آزادانہ طور پر نظام زندگی چلانے سے عاری ہے۔

۳) عصر حاضر کے جامعات کا نصاب تعلیم اصلاً مغربی کلچر کا خدمت گزار ہے، جس میں دینیات کو محض ایک اسلامی نصاب کے طور پر رکھ کر طلباء کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ مذہبی لحاظ سے دینیات کو محض ایک نصاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، جو صدیوں پہلے لکھی گئی کتابوں پر مشتمل ہے، ان کی ترتیب و تدوین اور زبان عصری دماغوں کے لیئے قابل قبول نہیں۔ اسلام کے مبادئ کو جن مسائل پر منطبق کیا گیا ہے ان میں سے زیادہ تر اب نہیں پائے جاتے

---

(۱) تعلیمات، ص:۲۵

ہیں اور جو مسائل در پیش ہیں ان پر اسلام کو منطبق کرنے کی کاوشیں نہیں کی جارہی۔ دیکھا جائے تو ایسے نظام تعلیم میں تعلیم وتربیت پانے والے زیادہ تر طلباء مغربی عادات واطوار اور رسومات کے دلدادہ ہیں اور اسلامی تعلیمات کے تحت اخلاقی قدروں کو فراموش کیئے ہوئے ہیں۔ اگر دو چار لوگ اعتقادی و عملی لحاظ سے حامل دین ہیں بھی تو وہ اللہ کی مدد اور ان کی ذاتی کوشش کی بناپر ہو گا کہ انہوں نے اپنے عقیدہ وایمان کو مغرب کے اثر سے بچالیا ہو گا۔

فرنگیت اور اسلامیت کی اس آمیزش سے طلباء تین گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ ایک وہ جن پر فرنگیت غالب ہے، دوسرے وہ جن پر اسلامیت غالب ہے اور تیسرے وہ جو نہ پورے فرنگی ہیں اور نہ اسلامی۔ تعلیم کا یہ نتیجہ قومی مفاد کے لحاظ سے بھی خوشگوار نہیں اور اسلامی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو اسلام کبھی بھی متضاد شخصیت کی تعمیر نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ دنیا میں رہ کر معاملات زندگی کو ایسے طریقہ کار سے چلانے کے لیئے تیار کرتا ہے، جس میں مکمل طور پر اسلامی اسپرٹ نظر آتی ہو اور انسان کے سیرت وکردار میں رسول اکرم ﷺ کے اخلاقیات نمایاں ہوں۔ اس صورت حال سے تو نصاب تعلیم میں محض دینیات کی یہ آمیزش لاحاصل ہے جس کا انسانی زندگی کے معاملات سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں پائے جانے والے جامعات کے نصاب کو ایسے اساسیات پر مرتب کیا جائے جس میں ایک ہی اسلامی اسپرٹ جھلکتی ہو۔ دینیات کو محض ایک مضموں کے طور پر پڑھانے کی بجائے پورے تعلیمی نظام کی ہیئت کو اسطرح سے بدلا جائے کہ علم دین کے ساتھ دنیوی علم میں باہم ہم آہنگی اور ربط پیدا ہو جائے اور مادی واخلاقی دونوں طرح کی تربیت کا عنصر بھی پایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مغربی علوم وفنون کے درست اجزاء کو بھی اپنے اندر جذب کرلے۔ چنانچہ اس کے زیر تعلیم ایسے ماہرین سیاسیات، مقننن، معاشیات، فلسفی اور سائنسدان پیدا ہوں کہ جو ماہرین علوم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلی سیرت وکردار کے مالک ہوں اور زندگی کے تمام مسائل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کا ملکہ رکھتے ہوں۔

کالج اور سکول کا نصاب تعلیم:

سکول اور کالجز کے نصاب تعلیم کو اسلامی نظریہ حیات اور قومی اہداف ومقاصد کے تحت متعین کیا جاتا ہے۔ نصاب تعلیم کو طلباء کی عمر، نفسیاتی وجسمانی ضرورت اور نشوونما کے ادوار کو مد نظر رکھ کر تشکیل دیا جاتا ہے۔ نصابی اسکیم کے احاطہ میں، درسی کتب کی تیاری، اوقات کار، درجہ بندی، نظام امتحانات، ہم نصابی سرگرمیاں اور نتائج کی ترتیب جیسے تمام تر پہلوؤں کو شامل حال رکھا جاتا ہے تو ہی ایک مکمل اور کامیاب نصاب تیار کیا جاسکتا ہے، جس کے زیر اثر طلباء اپنی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے کامیاب زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

تعلیمی اداروں کے دائرے کے اندر طلباء صرف معلومات حاصل نہیں کررہے ہوتے بلکہ اخلاقی وجذباتی تربیت بھی حاصل کررہے ہوتے ہیں۔ اس سارے عمل میں نصاب تعلیم اور اساتذہ کے کردار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جبکہ عصر حاضر

کے سکول اور کالجز میں نافذ نصاب تعلیم طلباء کی اخلاقی وروحانی تربیت کے لیئے ناکافی ہے۔ طلباء میں معلومات کی منتقلی تو کی جارہی ہے البتہ تربیتی لحاظ سے اقدامات نہیں کیئے جارہے۔ ان اداروں کے تعلیمی مدارج میں مروجہ نصاب تعلیم، اخلاقی تربیت کو فروغ دینے میں کس قدر معاون ہے اور تربیتی لحاظ سے اس میں پائے جانے والے نقائص کو درج ذیل ذکر کیا جاتا ہے۔

ثانوی واعلی ثانوی مدارج کے نصاب تعلیم میں اخلاقی اقدار کے حوالے سے اسلامیات لازمی کی کتاب میں محاسن اخلاق (کسب حلال، ایثار، عدل وانصاف، سچائی اور دیانت داری وغیرہ) اور رذائل اخلاق (منافقت، تکبر، حسد، جھوٹ اور غیبت وغیرہ) سے متعلق موضوعات پر مختصر اذکر کیا گیا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر اس سطح کے طلباء کے لیئے یہ انداز تحریری ناکافی اور غیر معیاری ہے۔ جس طرح سے مسلم طالب علم کے لیئے ان اخلاقی اقدار کی ضرورت واہمیت کو واضح کرنا تھا اس طرح سے تربیتی انداز نہیں اپنایا گیا۔ معاشرے سے ان عنوانات کا تعلق واضح کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ محض ایک تعارفی انداز میں محاسن ورذائل اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ثانوی مدارج کے نصاب تعلیم میں سورۃ احزاب، سورۃ الانفال اور سورۃ الممتحنہ کی مخصوص آیات بمع ترجمہ شامل کی گئی ہیں مگر ان آیات میں اخلاقی اقدار پر بہت کم احکامات پائے جاتے ہیں۔ نصاب تعلیم کو مرتب کرتے وقت اس امر کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ جبکہ اسلامی نظریاتی قوم کے طلباء کیلیئے اسلامی واخلاقی اقدار کی کس قدر ضرورت واہمیت ہے۔

اعلی ثانوی مدارج کے نصاب تعلیم میں اسلامیات لازمی، مطالعہ پاکستان اور اردو لازمی کے مضامین کے تحت اخلاقی اقدار کے حوالے سے چند موضوعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسا کہ اسلامیات لازمی کی کتاب میں آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں عفوودرگزر، صبر واستقلال اور مساوات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مطالعہ پاکستان کی کتاب میں شہریوں کے حقوق وفرائض، اخوت وبھائی چارہ 'معاشرتی انصاف ومساوات، خطبہ حجتہ الوداع اور انسانی حقوق کے حوالے سے خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ جبکہ اعلی ثانوی مدارج کے طلباء کی اخلاقی تربیت کے لیئے یہ مواد بہت قلیل ہے۔ اس میں مزید اضافے اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ ایسا معیاری اور جامع مواد شامل کیا جائے جس سے اخلاقی اقدار کے احیاء میں خاطر خواہ مدد مل سکے۔

جماعت ششم سے لے کر جماعت ہشتم تک کے نصاب میں دیگر علوم کے علاوہ، اسلامیات کے ساتھ عربی کا نصاب بھی ملتا ہے۔ عربی کے نصاب کے پہلے حصے میں مختلف موضوعات جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ، نماز، وضو، قوم مسلم، اخوت اور اللہ کی معرفت سے متعلق مختصر امواد موجود ہے جو کہ ناکافی ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف سورتوں جیسا کہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ یوسف، سورۃ یسین اور سوۃ الحجرات وغیرہ کے چند رکوع بمع لفظی وبامحاورہ ترجمہ ذکر کیئے گئے ہیں مگر ان آیات میں پائے جانے والے ذیلی عنوانات کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ اخلاقی اقدار پر کسی بھی عنوان سے متعلق بحث نہیں ملتی۔

اسلامیات کی مختصر سی کتاب میں حفظ کے لیئے چند سورتوں جیسا کہ سورۃ اللیل، سورۃ التین اور سورۃ الضحیٰ، سورۃ الشمس، سورۃ الفجر وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے نیز ناظرہ قرآن پاک کے حوالے سے پاروں کا شمار بھی ملتا ہے مگر اس قوم کا المیہ یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھانے کے لیئے اکثر تعلیمی اداروں میں قاری کا بندوبست نہیں کیا جاتا اور اسلامیات کے اکثر اساتذہ قرآن پڑھانے میں دلچسپی نہیں لیتے یا پھر اسلامیات کو ایک عام مضمون جانتے ہوئے کسی اور مضمون کے استاد کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جس کو وجہ سے اسلامی حقائق طلباء پر صحیح معنوں میں واضح نہیں ہوتے اور تربیتی عنصر ناپید نظر آتا ہے۔ طلباء اسے عام اورآسان مضمون تصور کرتے ہیں۔ اخلاق وآداب دیانت، منافقت سے اجتناب قومی اتحاد اور صبر واستقامت سے متعلق مختصر امعلومات فراہم کی گئیں ہیں جو کہ مزید وضاحت طلب ہیں۔

اخلاقی اقدار کے حوالے سے اردو اور معاشرتی علوم کی کی کتب میں پائے جانے والے مجموعی اسباق میں، محض دو سے چار اسباق میں رسول اکرم ﷺ بحیثیت "صادق وامین"، شفقت وسادگی، عدل واحسان، امن وسلامتی، آداب معاشرت اور ایفائے عہد وغیرہ کا مختصر اذکر ملتا ہے، جو کہ ان مدارج کے طلباء کیے لیئے بہت کم اور ناکافی ہے اور اسمیں مزید اصلاح کی ضرورت ہے۔ دیگر سائنی علوم کو دیکھا جائے تو کسی بھی سبق کو اسلامی واخلاقی اقدار سے نہیں جوڑا گیا۔ پورے نصاب میں کہیں بھی قرآن وحدیث کو سمونے کی کوشش نہیں کی گئی جبکہ سائنس کا اصل ماخذ ہی قرآن پاک ہے۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی و نظریاتی مملکت ہونے کے باوجود، اس کا نصاب طلباء کو اسلامی واخلاقی اقدار پہنچانے سے قاصر ہے۔

جماعت سوئم سے لے کر جماعت پنجم تک نصاب کے اندر مذہبی اعتبار سے چند سورتوں کو حفظ کرنے کے لیئے متعین کیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ الکافرون، سورۃ اخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس اور آیۃ الکرسی وغیرہ۔ اسلامی واخلاقی اقدار کے حوالے سے، آنحضرت ﷺ کے اخلاق حسنہ سے متعلق عفوودرگزر، سچائی، صبر وشکر، ایثار، رحم دلی، بردباری، رواداری، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، دھوکہ نہ دینا وغیرہ کا مختصر اذکر ملتا ہے جو کہ اسلامی فلاحی ریاست کے مسلم طلباء کے لیئے ناکافی ہے۔ کم ازکم نصاب کے اندر اخلاقی صفات پر جامع اور تفصیلا آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں سے روشنی ڈالتے ہوئے ذکر کرنا چاہیئے۔ جو کہ طلباء کی ذہنی وفکری استعداد کے مناسب ہو۔ ان عنوانات پر اساتذہ کو مزید روشنی ڈالتے ہوئے طلباء کو اخلاقی اقدار کا خوگر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ ان درجات میں کی گئی تربیت بعد میں مثبت نتائج مرتب کرتی ہے۔

دینی مدارس کا نصاب تعلیم:

تین سو سال قبل ایسا نصاب تعلیم تھا جس کو درس نظامی سے موسوم کیا جاتا تھا جو اس وقت کی حکومت اور معاشرت کے تمام تقاضوں کو پورا کر رہا تھا جبکہ عصر حاضر میں دینی مدارس کا نصاب تعلیم وہ نتائج نہیں دے رہا جو اس وقت کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء عوام الناس کی فکری وروحانی تربیت میں کردار ادا کر رہے تھے۔ایک وقت تھا جب مسلمان حکمرانوں کی قیادت تھی،اس دور عروج میں دین اور دنیا کی تعلیمی ضرورتیں ایک ہی نظام تعلیم پورا کر رہا تھا مگر جب دور محکومی وانحطاط آیا،دینی ضروریات کو پورا کرنے والا نصاب تعلیم عربی زبان اور چند دینی علوم تک محدود ہو گیا،یہ معاشرت وریاست کے تقاضوں سے بے تعلق ہو گیا۔ایسی صورت میں ان مدارس سے فارغ التحصیل علماء وفضلاء کے حصہ میں صرف خطابت و امامت کے فرائض رہ گئے،جس کی بناء پر انہوں نے بھی دینی علوم کو سطحی انداز میں دیکھنا شروع کر دیا اور مزید دوسروں کو دینی حقائق واضح کرنے سے قاصر ہو گئے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید نظام تعلیم کے علمبرداروں نے مذہب کو دائرہ تعلیم سے خارج کر دیا۔اس طرح دینی مدارس اور جدید نظام تعلیم ایک دوسرے کے مد مقابل آ گئے۔علماء دین جدید علوم کو سیکھنا حرام تصور کرنے لگے اور جدید تعلیم کے حامل لوگوں کے ہاں دینی نصاب تعلیم کی کوئی وقعت نہ رہی۔ضرورت اس امر کی ہے کہ درس نظامی کے نصاب کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔ایک مشترکہ تعلیمی بورڈ کے ذریعے دین اور جدید نظام تعلیم کا امتزاج کیا جائے۔دونوں نظام تعلیم پر مشتمل کتب کا چناؤ کرتے ہوئے نیا نصاب مرتب کیا جائے۔ایسا نصاب جو مقاصد تعلیم اور ملی و قومی ضروریات سے مطابقت رکھتا ہو۔اس کے لیئے نئی کتب تیار کی جائیں،ضروری نہیں کہ ماضی کی تمام کتب کو خارج کیا جائے البتہ اسلوب نگارش سہل اور عام فہم ہونا چاہیئے۔ایسے ہی نصاب تعلیم سے دین اور دنیا دونوں کے مقاصد کا حصول ممکن ہے اور معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اخلاقی و عملی تربیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔

خلاصہ کلام

اعلی تعلیمی اداروں،ثانوی واعلی ثانوی مدارج اور سکول کے طلباء کے لیئے متعین کردہ نصاب تعلیم پر مذکورہ بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مروجہ نصاب تعلیم کو اسلامی واخلاقی تربیت کے حوالے سے مرتب نہیں کیا گیا البتہ انسان کی جسمانی ومادی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام تر آسائشوں کے حصول کے لیئے اہتمام کیا جا رہا ہے اور طلباء کو دفتری کارکنوں کی حیثیت سے تیار کیا جا رہا ہے۔نظام تعلیم کا مقصد محض کتابیں رٹا کر امتحانات کا انعقاد کرنا یا علوم وفنون سکھا کر دفتری عہدیداروں کو تیار کرنا ہے۔ایسے نظریے پر مبنی تعلیمی نصاب میں عقیدہ ومذہب اور اخلاقیات وکردار کی کوئی گنجائش نہیں ہے،جبکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا،روحانی ومادی زندگی کے تمام تر حرکات وسکنات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اسلام جہاں روحانی ضرورت کے طور پر انسان کا تعلق اللہ سے جوڑنے پر زور دیتا ہے وہاں مادی حاجیات کی

تکمیل کے اسباب مہیا کرتا ہے اور انسان کی صلاحیتوں کو منظم کر کے انہیں دنیاوی زندگی کی تعمیر وترقی میں لگاتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلام انسان کی روحانی، عقلی اور جسمانی تمام تر صلاحیتوں کو متوازن اور ہم آہنگ کرتا ہے۔ جبکہ مروجہ نصاب تعلیم کو غیر اسلامی و نظریاتی بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہے، دینی و دنیاوی تعلیم دو الگ حیثیتیں رکھتی ہیں، ان میں کوئی ربط نہیں پایا جاتا، دین کے برعکس مغربی علوم وفنون کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء مغربی عادات واطوار کے دلدادہ ہیں اور اپنے مذہبی اقدار وروایات کو فراموش کیئے ہوئے ہیں۔ مذہبی طور پر صرف چند صفحات پر مشتمل اسلامیات کی کتاب کے ذریعے انتہائی مختصر انداز میں اخلاقی اقدار سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا مواد نہایت قلیل اور غیر جامع ہے۔ مواد متعین کرتے وقت تربیتی پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی مواد کو طلباء تک پہنچانے کے باوجود اخلاقی تربیت کا فقدان نظر آتا ہے۔

نصاب تعلیم میں مزید اضافے اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کے لیئے ضروری ہے کہ پیشہ وارانہ اور دینی تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ سائنسی علوم کا دینی تعلیم سے کوئی ربط نظر نہیں آتا جبکہ ان تمام علوم کے اساس قرآن وحدیث ہیں۔ تعلیمی مقاصد کو اسلامی نظریاتی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نصاب تعلیم میں اسلامی واخلاقی اقدار کو اہمیت دی جائے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیتی پہلوؤں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ اس دور کا المیہ یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اخلاقی کردار سے عاری ہیں۔ جس کی وجہ مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کا غیر اسلامی واخلاقی بنیادوں پر مرتب کیئے جانا ہے جبکہ اسلامی نظریہ تعلیم کے مطابق طالب علم کے سیرت وکردار کی تشکیل سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لہذا تعلیم وتربیت کے سارے نظام کو اسلام کی مستقل اقدار کے تابع مرتب ومنظم کرنے کی ضرورت ہے۔ پورے نظام تعلیم کی ہیئت کو اس طرح سے بدلا جائے کہ اس میں حقیقی اسلامی اسپرٹ نظر آئے۔ نصاب تعلیم میں اخلاقیات کو محض چند ابواب میں سرسری ساذکر کرنے کی بجائے اسلامی واخلاقی اقدار کو بنیادی حیثیت دی جائے اور جامع وتفصیلی انداز تحریر اپنایا جائے۔ چنانچہ مروجہ نصاب تعلیم میں ملی، اسلامی واخلاقی تقاضے پورے کرنے کے لیئے ترامیم واصلاح کی ضرورت ہے۔

باب چہارم

اعلیٰ تعلیمی ادارے اور نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب

فصل اول: تعلیمی اداروں کا تعارف

فصل دوم: سروے نتائج اور تجزیاتی مطالعہ

فصل سوم: نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب

فصل چہارم: مروجہ نظام تعلیم کے مسائل اور اخلاقیات

فصل اول

تعلیمی اداروں کا تعارف

فصل اول:

تعلیمی اداروں کا تعارف

عصر حاضر میں مسلم ممالک میں دو طرح کے نظام تعلیم متوازی سطح پر کام کر رہے ہیں ایک دینی نظام تعلیم اور دوسرا جدید نظام تعلیم۔ دو طرح کے نظام تعلیم سے دو الگ طرز کی شخصیات تیار ہو رہی ہیں، جن میں سے کسی کو بھی مثالی شخصیت نہیں کہا جا سکتا، دونوں معاشرے میں الگ الگ اثر ورسوخ رکھتی ہیں۔ موجودہ دور کے دینی نظام تعلیم پر مشتمل مدارس میں تعلیم وتربیت پانے والے طلباء مذہبی زندگی کے رہنما ہوتے ہیں، انہیں صرف دینی علوم کی تعلیم دینے میں محنت کی جاتی ہے۔ ان مدارس میں فیس کا کوئی تصور نہیں ہوتا، مختلف مکاتب فکر کے مختلف مدارس ہوتے ہیں اور فارغ التحصیل طلباء اسی مکتب فکر کے نمائندے ہوتے ہیں۔ جبکہ تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہی دینی اقامتی ادارے ملک کی علمی و عملی دونوں طرح کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے، مگر پھر مغرب کی علمی ترقی سے علحیدگی اختیار کرنے کی وجہ سے یہ اپنا مقام برقرار نہ رکھ سکے۔ دوسری طرف جدید علوم پر مشتمل ادارے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں وغیرہ ہیں۔ جن میں زیادہ جدید مغربی افکار و تہذیب پر مشتمل علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ سرکاری بجٹ کے تعلیمی مد میں اخراجات انہی اداروں پر لگائے جاتے ہیں۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل طلباء ملک کا نظم ونسق چلاتے ہیں اور ہر دائرے کے ماہرین و قائدین انہی اداروں سے تیار ہوتے ہیں۔

لہذا یہ بات قابل فکر ہے مسلم ریاست میں دینی مدارس سے تعلیم حاصل کرنے والے طلباء جدید مغربی علوم و اصطلاحات سے نا آشنا ہیں۔ وہ علم السیاست، علم القانون وغیرہ کو جدید اصطلاحات کے مطابق سمجھ کر، ان کے بارے میں اسلامی احکامات کی وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔ جس کے لیئے ضروری ہے کہ ان علوم سے متعلقہ تعلیمات اسلامی کو جاننے کے لیئے، ان اصطلاحوں میں ان علوم کو پیش کیا جائے جن کو وہ با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری طرف عصر حاضر کے جدید مغربی افکار اور قدروں پر مشتمل اداروں میں تعلیم سے آراستہ ہونے والے طلباء جو عملا تمدن، سیاست، عدالت و قانون کو سنبھالے ہوئے ہیں، جدید مسائل سے تو آشنا ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ان مسائل کے بارے میں اسلام کسطرح رہنمائی کرتا ہے، اسلامی روایات وتعلیمات سے متعلقہ ان کی معلومات بہت محدود ہے۔

ہر لحاظ سے ایسا نظام جو کہ مسلمانوں کو دو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دے، اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام ایک ایسے نظام تعلیم کا قائل ہے جو وحدت ویکسانیت کا قائل ہو اور جس میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ ملت اسلامیہ کی یکجہتی کے لیئے بھی ضروری ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں ایک ہی نوعیت کے تعلیمی مقاصد کا عملا نفاذ کیا جائے، ایسے مقاصد جو طلباء کی دینی تعلیمات کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ جدید علوم ومسائل پر بھی روشنی ڈالیں۔

چنانچہ ملک میں ایک مثالی قیادت کو قائم کرنے کے لیئے تعلیمی اداروں میں ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں دینی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ملی ضروریات کی تکمیل بھی کی جاسکے۔ ذیل میں مملکت اسلامیہ کے اندر دو متوازی سطح پر کام کرنے والے تعلیمی اداروں کا تفصیلا ذکر کیا جائے گا۔ ان کی موجودہ صورت حال اور نقائص و خوبیوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

دینی مدارس:

دینی مدارس کا نظام تعلیم ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہ انہی مدارس کی بدولت ہے کہ آج عوام الناس کا کسی حد تک دین اسلام سے واسطہ قائم ہے۔ دینی نظام تعلیم کا مقصد مسلمانوں کو ذات باری تعالی کی پہچان، حق و باطل میں فرق اور حقوق اللہ و حقوق العباد کا تحفظ کرتے ہوئے دنیاو آخرت کی سعادت حاصل کرنا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿فَلَوْلَانَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍمِنْهُمْ طَائِفَةٌلِيَتَفَقَّهُوافِي الدِّينِ﴾[1]

ترجمہ: کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں۔

دین کا علم حاصل کرنا اور معاملات زندگی میں احکامات الہی کو سیکھنا جہاد اکبر ہے۔ اگر معاشرے کی ایک جماعت تحصیل علم اور دوسروں کو دین اسلام کی نشرواشاعت کا فریضہ ادا کرنے کے لیئے گھروں سے نکل پڑتی ہے تو باقی تمام سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے اور اگر کوئی جماعت بھی اس کام کے لیئے نہیں نکلتی تو معاشرے کے تمام افراد گناہگار ٹھہرتے ہیں اسے فرض کفایہ کہا جاتا ہے۔[2] دیکھا جائے تو دینی مدارس اس فرض کی ادائیگی میں کوشاں ہیں، اس آیت میں تحصیل علم کے لیئے گھروں سے نکلنے اور سفر کرنے کی تلقین کی گئی ہے اسی لیئے دینی مدارس جیسے اقامتی ادارے قائم کیئے جاتے ہیں تا کہ مختلف اطراف سے آئے گئے طلباء یہاں قیام کریں اور تعلیم حاصل کریں۔ دینی علوم کا ادراک اور زندگی کے ہر معاملے میں تعلیمات اسلام کی پیروی ہی ان مدارس کا اولین مقصد ہے۔

دینی مدارس اپنے نظریات و افکار سے لوگوں کو مذہب اسلام سے جوڑنے میں اہم کردار ادا در رہے ہیں لیکن ملک کی عمومی ضروریات و تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے مد مقابل جدید نظام تعلیم نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، جس کا مقصد محض دنیاوی جاہ و جلال اور مفادات حاصل کرنے کے لیئے ملازمتوں کا حصول ہے۔ دیکھا جائے تو دینی مدارس میں تعلیم و تربیت پانے والے طلباء کو دین کی نشر و اشاعت اور اسلامی اقدار کے احیاء میں جو کردار ادا کرنا چاہیئے وہ بھی اس سطح پر نظر نہیں آتا۔ دینی مدارس میں تعلیم پانے والے طلباء دین اسلام کی تعلیمات کو سیکھنے اور سمجھنے کے لیئے ایک طویل

---

(۱) سورۃ التوبہ:۹/۱۲۲

(۲) تفسیر مظہری، ص:۲۹۱

مدت تک محنت کرتے ہیں مگر جب یہی طالب علم عملی میدان میں نکلتے ہیں تو گردونواح کے ماحول سے متاثر ہو کر احکامات الٰہی پر بہت کم عمل پیرا ہوتے نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پھر دوسروں کو تعلیمات اسلامی پر کاربند کرنے اور اشاعت اسلام میں ان کا کردار بہت کم نظر آتا۔

آج معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ چند رسمی روایات واقدار کو کہیں کہیں اپنایا جارہا ہے مگر دین اسلام کی اصل تعلیمات کا عملی نفاذ مفقود نظر آتا ہے جبکہ اسلامی تعلیمات کو محض اخذ کرنا کافی نہیں بلکہ عملی طور پر زندگی کے ہر مرحلے میں ڈھالنا ضروری ہے۔ایسے علم کے بارے میں جو نفع بخش نہ ہو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَايَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَايَخْشَعُ))[1]

ترجمہ:اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جس میں تیر اڈر نہ ہو۔

عصر حاضر میں اسلامی مدارس کے اساتذہ، منتظمین اور فارغ التحصیل طلباء نے معاشرتی ماحول سے متاثر ہو کر وقت کا ضیاع کیا،یہاں تک کہ ان کا کام صرف امامت وخطابت تک محدود رہ گیا۔جس کی وجہ سے معاشرے کے افراد اسلام کی مستقل قدروں سے محروم رہ گئے حتی کہ شدت پسندی اور انتہا پسندی کی آوازیں سنائی دینے لگی اور معاشرے کا شیرازہ بکھر گیا جو کہ لمحہ فکریہ ہے۔چند دینی مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں مثبت تبدیلی رونما ہو رہی ہے جبکہ زیادہ تر یہ ادارے محض سطحی کردار ادا کر رہے ہیں۔معاشرے کی موجودہ صورت حال کو بدلنے کے لیئے دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاحی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

دینی مدارس اور عصری تقاضے:

دور حاضر کے دینی مدارس کو ان کے حقیقی مقاصد میں پورا اترنے کے لیے اور فکری و عملی لحاظ سے اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے درج ذیل نقاط کو پیش نظر رکھنا چاہیئے:

۱) درس نظامی کے نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے مطابقت دینے کی اشد ضرورت ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ یہ ایسا نظام تعلیم تھا جو اسلامی اقدار کے احیاء میں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا مگر جب حالات نے مسلمانوں کے ہاتھ سے قیادت کو چھین لیا اور غیر ملکی مسلم حکمرانوں نے اپنے افکار کی نشر واشاعت کا کام شروع کیا تو یہ درس نظامی صرف چند دینی علوم اور عربی زبان تک محدود ہو گیا۔اس نظام سے فارغ التحصیل علماء صرف خطابت وامامت کے فرائض انجام دینے لگے، طلباء کو بھی دینی علوم سے گہری وابستگی نہ

---

(۱) صحیح مسلم،کِتَاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ،باب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ يُعْمَلْ،حدیث نمبر:۴۸۹۹، ۱۳/ ۲۵۱

رہی اور سطحی انداز میں لینا شروع کر دیا۔ لہٰذا اسطرح سے دینی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلباء آئندہ عوام الناس کو تعلیمات اسلام سے آگاہ کرنے میں اپنے فرائض بخوبی انجام نہ دے سکے۔ دوسری طرف جدید تعلیم کے علمبرداروں نے مذہب کو نظام تعلیم سے تقریباً خارج کر دیا۔ دوالگ نظام تعلیم جدید اور قدیم ایک دوسرے کے مد مقابل آگے اور تعلیم حاصل کرنے کے حقیقی اہداف و مقاصد مفقود ہو گے۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایک نیا نظام تعلیم بنایا جائے جو ان نقائص سے پاک ہو جو موجودہ دور کے دو مختلف نظام تعلیم پرانا مذہبی نظام تعلیم اور انگریزوں کی رہنمائی میں قائم کردہ عصری نظام تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ ایسا نظام تعلیم ہو جو ایک مسلمان اور آزاد قوم کی حیثیت سے تمام تر ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل ہو۔

اس پس منظر میں، ضرورت اس امر کی ہے کہ درس نظامی کے نصاب تعلیم کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے اور ایک ایسا نصاب تعلیم متعین کیا جائے جو دینی و دنیاوی دونوں مقاصد کو پورا کرے۔ جس کے لیئے ایک مشترکہ تعلیمی بورڈ کا انعقاد ہونا چاہیئے۔ یہ تعلیمی بورڈ دونوں اقسام کے علوم کے ماہرین اور تمام مسالک کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور ان کی باہم مشاورت اور حتمی فیصلے سے کتب کا چناؤ کرتے ہوئے نصاب کو مدون کیا جائے۔

۲) عصر حاضر میں امت مسلمہ فرقہ واریت کا شکار ہے۔ پاکستان کے اندر حنفی بریلوی، حنفی دیوبندی، اہل حدیث اور اہل تشیع وغیرہ کے نام سے فرقہ بندی پائی جاتی ہے۔ ہر ایک فرقے سے منسلک علماء اپنے اپنے عقائد و نظریات کے حامل ہیں اور ان سے متعلقہ مدارس میں طلباء کو انہی افکار پر پروان چڑھایا جاتا ہے۔ اس فرقہ بندی میں شدت پسندی انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ ہر کوئی اپنے نظریات کو درست اور دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی زد میں لگا ہوا ہے۔ جس سے دین اسلام کی اصل روح باقی نہ رہی اور علوم دینیہ سیکھنے اور سمجھنے کا اصل مقصد زائل ہو تا گیا۔ ذات الٰہی کی پہچان اور عوام الناس کی خیر خواہی جیسے مقاصد مفقود ہونے لگے۔ ایک دوسرے سے تنازعات کی بنا پر معاشرے میں نفرت وعداوت کی فضا پھیلنے لگی۔

اہل علم و فضل کو چاہیئے کہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے افکار و نظریات کو تحمل اور خندہ پیشانی سے سمجھتے ہوئے، مشترکہ معاونت سے اسلامی نظام تعلیم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں۔ اسلامی اصولوں کو اپنایا جائے اور دینی تعلیم کو جدید خطوط پر نئے سرے سے مرتب کیا جائے تاکہ مذہبی تعصب، فرقہ وارانہ اختلافات اور جہالت کا خاتمہ ممکن ہے۔

۳) حکومت کو چاہیئے کہ مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کے لیئے ملازمتوں میں مواقع دینے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ان کے لیئے نصاب تعلیم میں مخصوص تعلیمی کورسز کا شمار کیا جائے کہ جن کے حصول سے وہ کسی ہنر میں مہارت حاصل کر سکیں اور عملی زندگی میں صاحب روزگار ہوں۔

۴) درس نظامی کے قائدین کو مقاصد تعلیم کی درستگی کی ضرورت ہے یا تو محض اسی مقصد پر اکتفا کیا جائے کہ دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء کو علوم دینیہ سے واقفیت ہونی چاہیئے یا معاشرے کی مختلف النوع ضروریات کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک ایسی متوازی شخصیت کی تعمیر ہونی چاہیئے جو دین اور دنیا دونوں میں توازن برقرار رکھ سکے۔ دین الٰہی تمام تر علوم کا مجمع ہے۔ قرآن پاک ایسی کتاب ہے جو ہر طرح کے علم کا سرچشمہ ہے، چاہے اس کا تعلق تفسیر، حدیث اور فقہ سے ہو یا سیاسیات، معاشیات اور سماجیات سے۔ بلاشبہ درس نظامی میں بہت سارے علوم کو پڑھایا جاتا ہے مگر یہ صرف ایک سطحی مطالعہ ہے، کسی بھی علم سے حقیقی معنوں میں نفع حاصل کرنے کے لیئے اس سے نہ صرف گہری وابستگی ضروری ہے بلکہ اس کو عصری تقاضوں کے مطابق معاملات زندگی میں عملاڈھالنا بھی آنا چاہیئے۔ جیسا کہ علم معاشیات سے صرف واقفیت پر اکتفا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ جدید دور کے معاشی مسائل پر بھی پوری نظر ہونی چاہیئے۔اسی طرح قرآن، سنت اور فقہ وغیرہ دینی علوم سے واقفیت کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے متنوع مسائل تجارت، بنکاری اور سیاست وغیرہ پر ان کا اطلاق بھی ضروری ہے۔المیہ یہ ہے کہ جہاں فنی مہارتیں ہیں وہاں شریعت کا علم نہیں ہے اور جہاں شریعت کا علم ہے وہاں فنی مہارتیں نہیں ہیں۔

۵) حکومت اور دینی مدارس کے درمیان تعلقات کو اگر مضبوط بنیادوں پر استوار کر لیا جائے تو بہت سی مشکلات سے بچا جا سکتا ہے۔ حکومت پاکستان کو مدارس کے اندرونی معاملات اور انتظامی خود مختاری کو یقینی بنانا چاہیئے۔ دور حاضر میں دیکھا جائے تو یہ تعلق برائے نام ہی نظر آتا ہے۔ایک تو یہ تعلق محکمہ زکوۃ وعشر کی رو سے نظر آتا ہے۔ حکومت نے دینی مدارس کے لیئے زکوۃ فنڈ میں سے کچھ حصہ متعین کیا ہے۔ اس کی تقسیم بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے جو کہ دینی تعلیم سے متعلقہ اداروں اور حضرات کو ناپسند کرتی ہے۔لہذا وہ اہل مدارس کو اس فنڈ کے حصول کے لیئے رسوا کیئے ہوئے ہے۔ دوسری جانب دینی مدارس سے حاصل شدہ سندات کو محکمہ تعلیم میں تدریسی ملازمت کے لیئے ایم اے اسلامیات یا عربی کے مساوی قرار دینے کا اعلان تو کر دیا گیا مگر عملی طور پر دیکھا جائے تو محکمہ تعلیم کے اہل کار دینی مدارس سے نفرت و ناپسندیدگی کی بناء پر مدارس سے فارغ التحصیل افراد کے لیئے رکاوٹیں حائل کیئے رکھتے ہیں۔[1] لہذا دینی علوم کے حصول کے بعد عملی میدان میں یہ افراد ملازمتوں کے حصول کے لیئے مارے پھرتے ہیں

---

(۱) دینی مدارس کا نظام تعلیم، ص:۵۴

بالآخر امامت، خطابت یا مساجد میں بچوں کی تعلیم القرآن کی حدود تک محدود ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں بے روزگاری اور معاشی بحران نظر آتا ہے۔اگر حکومت اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے تو بہت سے معاشی ومعاشرتی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کو بھی ملکی قیادت سنبھالنے کے مواقع فراہم کیئے جاسکتے ہیں۔معاشرے میں امن وسلامتی اور محبت کی فضاپیدا کرنے کے لیئے دینی مدارس سے وابستہ افراد اور عوام الناس کے مابین تفریقات کو ختم کرنا ہو گا نیز حکومت اور مدارس کے درمیان اچھے تعلقات استوار کرنا ہوں گے۔

نجی اور سرکاری تعلیمی ادارے:

اسلامی ریاست ایک ایسی نظریاتی ریاست ہے جہاں عوام اور حکومت کے نظریہ افکار اور مقاصد باہم آہنگ ہوتے ہیں۔مقاصد کی تکمیل اور نظریہ کے تحفظ کے لیئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون واعتماد کی خوشگوار فضا معاشرے میں قائم ہوتی ہے۔مسلم معاشرے کے افراد تعلیمی دائرے میں خدمات کے جذبے کی رو سے وسائل اور صلاحیتیں لگانے کا اگر جذبہ رکھتے ہیں تو حکومت ان کے اس جذبے کو پروان چڑھاتی ہے اور عوام کے حقیقی نمائندہ کی حیثیت سے ان کے تعلیمی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔دیکھا جائے تو مسلم مملکتیں مسلمانوں کو تمام تر تعلیمی وسائل اور اعلی معیار کی تعلیم فراہم نہیں کر پارہی، جس کے لیئے اسے بعض مقامات پر عوام کو اس مقصد کے لیئے شریک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔لہذا تعلیمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیئے نجی ادارے قائم کیئے جاتے ہیں۔پاکستان میں ایک عرصہ سے پرائیویٹ انگریزی میڈیم اداروں کی رسم پڑ گئی ہے، یہ ایسے ادارے ہیں جو حکومت کی سرپرستی میں، معاشرے کے چند افراد پر مشتمل گروہ تعلیمی خدمات کے پیش نظر قائم کرتے ہیں مگر یہ حکومت کے داخلی انتظام وانصرام میں مداخلت سے آزاد رہتے ہیں۔دوسری طرف دیکھا جائے تو سرکاری تعلیمی ادارے بھی ملک کے بیشتر علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں زیادہ تر حکومت کی بنائی گئی تعلیمی پالیسیوں کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ان دو طرح کے تعلیمی اداروں نے درمیانے درجے کے طبقے اور غریب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔لوگوں کی یہ سوچ بن گئی ہے کہ ملک کے نافذ شدہ قومی نظام تعلیم (سرکاری ادارے) ان کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں، اس لیئے ہر طبقے کا فرد حتی کہ غرباء بھی اپنے احساس محرومی کے پس منظر میں نجی تعلیمی اداروں میں جانے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔موجودہ صورت حال ریاست سے ایسی منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہے، جس میں تعلیمی دائرے کو مکمل طور پر نجی شعبہ پر نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ حکومت کا براہ راست عمل دخل ناگزیر ہو اور ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے نجی تعلیمی اداروں کی نگرانی اور مقاصد کی تکمیل میں ان کا کردار جانچنے کا اختیار رکھتی ہو۔چنانچہ نجی وسرکاری تعلیمی اداروں کو مد نظر رکھتے ہوئے، حکومت کی تعلیمی پالیسی میں درج ذیل بنیادی نکات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہو گا۔

۱) حکومت نجی تعلیمی اداروں کو کھولنے میں افراد معاشرہ کی حوصلہ افزائی کرے گی اور ان اداروں کو کھولنے کا مقصد کوئی کاروبار یا پیسہ کمانا نہیں بلکہ دینی فریضہ کے طور پر امت مسلمہ کی خدمت اور حکومت کی تعلیمی کوششوں میں معاونت ہو۔

۲) نجی تعلیمی ادارے حکومت کی مجموعی تعلیمی اسکیموں کا جزو ہوں گے۔ان میں نصاب تعلیم، کتب، اساتذہ کے لیئے مشاہرے اور امتحانات کا انعقاد اسی طرح سے ہو گا جو سرکاری تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ جس طرح سے سرکاری تعلیمی اداروں میں طلباء کی مخلوط تعلیم ممنوع ہے، نجی میں بھی ممنوع ہو گی۔ سرکاری اداروں میں جو تعلیمی انتظامات و معیارات قائم کیئے جائیں وہی نجی اداروں کے لیئے بھی ہوں۔ایسا نہ ہو کہ نجی اداروں میں مختلف پر آسائش ماحول فراہم کیا جائے اور معاشرے کا صرف مخصوص طبقہ ہی وہاں تعلیم حاصل کر سکے۔

۳) حکومت جسطرح سے سرکاری اداروں کی نگرانی و جانچ پڑتال کرتی ہے اسی طرح نجی اداروں کی نگرانی کا نظام بھی قائم کیا جائے تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ ادارہ مجموعی تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے میں کس حد تک کردار ادا کر رہا ہے۔ نیز اساتذہ کے مشاہرے و مراعات اسی نوعیت کے ہونے چاہیئے جو سرکاری اداروں میں تہہ ہوتے ہیں، نہ کہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلیل مراعات دیئے جائیں اور ان کا استحصال کیا جائے۔ تعلیمی ادارے نفع خوری کی غرض سے نہیں بلکہ تعلیمی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہونے چاہیئے۔[1]

حکومت کو تمام سطح کے تعلیمی اداروں کی نگرانی و جانچ پڑتال کے لیئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنی چاہیئے، کیونکہ تعلیمی اداروں سے نکلنے والے طلباء ہی قوم کے مستقبل کو سنوار سکتے ہیں اور اسے ترقی یافتہ ملک کی صف میں لا سکتے ہیں۔لہذا یہ ادارے اسلامی مملکت کے مجموعی نظریاتی مقاصد اور دینی واخلاقی تربیت کا مرکز ہونے چاہیئے۔اس کے برعکس قوم کے نوجوانوں کے مستقبل سے کھیلنے والے خائن اور بددیانت لوگوں کے لیئے ایسے قوانین بھی بنائے جا سکتے ہیں جن کے تحت وہ سزا کے مستحق ٹھہریں اور معاشرے سے مفاسد کا خاتمہ ہو۔

اشرافیہ کے تعلیمی ادارے:

صاحبان اقتدار، اعلی مناصب پر فائز عہدیدار اور صاحب دولت وثروت کے لیئے اعلی سہولیات، الگ نصاب اور مخصوص نظام تعلیم پر مشتمل ادارے وضع کیے گئے ہیں۔ مراعات یافتہ طبقہ مخصوص تعلیم کی بنیاد پر اپنی بالادستی قائم کیئے ہوئے ہے۔سب سے زیادہ مقتدر، اور مؤثر یہی تعلیمی ادارے ہیں، جن سے معاشرے میں طبقاتی تفاوت کی فضا برپا ہو رہی

---

(۱) اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، ص:۹۰-۹۳

ہے، جو کہ بے شمار معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا سبب ہے۔ یہ سب غیر ملکی آقاؤں کی منصوبہ بندی ہے۔ انہوں نے طبقاتی نظام تعلیم کو ہتھیار بنا کر اپنے مذہب کے پیروکاروں اور تہذیبی افکار کے حامل افراد کو وجود میں لایا۔ جیسا کہ اعلی خاندانوں کے لیئے فوج کے مخصوص تربیتی ادارے کھولے گئے، اسی طرح عیسائی مشنری تعلیمی ادارے ہیں جو کہ مغربی وعیسائی تعلیمات پر مشتمل ہیں، یہ ادارے بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں مذہب سے متعلق شکوک وشبہات کے بیج بو دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے بچے اپنے عقائد و نظریات میں متزلزل ہو جاتے ہیں اور عیسائیت کے نظریات کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل میں متعدد بار غیر ملک ومذہب کے حامل تعلیمی اداروں کو ختم کرنے کی سفارشات پیش کی گئیں مگر بر سر اقتدار طبقہ جو کہ مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب ہے کہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے ان اداروں کا قیام ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ آج بھی پاکستان میں سینکڑوں کی تعداد میں مشنری تعلیمی ادارے پائے جاتے ہیں جن کا اپنا مخصوص نصاب تعلیم ہے اور ان کا ملک کی تعلیمی انتظانیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ انہی تعلیمی اداروں کی ایک نوعیت لارنس کالج اور ایچی سن کالج وغیرہ ہیں، جہاں ابتدائی دور میں نام نہاد اعلی خاندانوں کی فہرست داخلے کے لیئے تیار کی جاتی تھی اور صرف اسی کو داخلہ دیا جاتا تھا جس کا نام خصوصی فہرست میں شامل ہو جیسا کہ والیان ریاست، ان کے رشتہ دار اور دیگر شرفاء وغیرہ مگر پھر ۱۹۴۷ء کے بعد اس پابندی کو ختم کر دیا اور ہر اس شخص کے بچوں کو داخلہ دیا گیا جو اہل ثروت، جاگیر دار، صنعت کار یا مغربی تہذیب سے بہت مرعوب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے افراد انگریزوں کے وفادار، مغربی تہذیب سے متاثر اور اپنے معاشرتی ماحول اور افراد سے الگ تھلگ رہنے والے ہوتے ہیں۔[1]

چنانچہ ملک میں اگر بیک وقت مختلف اہداف ومقاصد کے حامل تعلیمی ادارے رائج ہوں گے تو عدل ومساوات پر مبنی اسلامی اصولوں سے وابستگی محال ہے جبکہ اسلام نے برابری کی سطح پر تمام نوع انسان کے لیئے حصول تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے تعلیم کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیتے ہوئے تمام بلا تخصیص اس کا حصول ہر انسان کے لیئے فرض قرار دیا۔ اس رو سے دیکھا جائے تو مسلمان ہی در حقیقت یکساں نظام تعلیم کے بانی ہیں۔ اس پس منظر میں پاکستان ایک نظریاتی مملکت، قومی یکجہتی اور تہذیبی ہم آہنگی کا حامل ملک ہونا چاہیئے مگر موجودہ متضاد نظام تعلیم ان اقدار کو فروغ دینے سے قاصر ہے۔

---

(۱) مجلہ تعلیم (خصوصی تعلیم، شمارہ ۴)، پاکستان میں یکساں نظام تعلیم، مسلم سجاد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسز اسٹڈیز، اسلام آباد، مرکز ایف /۷،، ۱۹۹۵ء، مقالہ (خواص اور عوام کے تعلیمی ادارے، سلیم منصور خالد)، ص: ۸۱-۸۲

منتخب اعلی تعلیمی ادارے:

جامعات ایسے تعلیمی ادارے ہیں جہاں عمومی تعلیم و تدریس سے ہٹ کر تحقیقات، انکشافات اور مہارات سکھانے کا عمل ہوتا ہے۔ یہاں اعلی تعلیم، علوم وفنون میں تخصیص اور ڈگریوں کے حصول کے لیئے انتظام وانصرام کیئے جاتے ہیں۔ افراد کی ماہرانہ اور خداداد صلاحیتوں کی دریافت وترویج کے لیئے مواقع فراہم کیئے جاتے ہیں۔ جامعات کو اپنے تعلیمی ارتقاء کے مراحل سے گزرتے ہوئے تیرھویں صدی میں باقاعدہ قانونی اداروں کی حیثیت سے منظم کیا گیا۔ جبکہ چوھدویں صدی میں ان کے لیئے "یونیورسٹی" کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ (۱)

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کا نظریہ اسلام ہے، ایسا نظریہ جو کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ تمام مخلوقات کے مالک اللہ کی طرف سے ہے۔ اس نظریے کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہی دنیا وآخرت کی کامیابی ہے۔ اسلامی نظریاتی ریاست میں تعلیم کی حیثیت غیر معمولی ہوتی ہے اور تعلیم کا مقصد قرآن وسنت کے مطابق عبادات ومعاملات میں احکام الہی کو جاننا اور رضائے الہی کا حصول ہے۔ افراد معاشرہ کی انفرادی صلاحیتوں اور مہارتوں کو ترویج دیتے ہوئے قوم کی تعمیر و وترقی کے لیئے تیار کرنا ہے۔ اس تناظر میں پاکستان میں موجودہ جامعات کو دیکھا جائے تو معاشی ومعاشرتی پسماندگی اور نسل نو میں اسلامی واخلاقی اقدار کے فقدان کا ذمہدار جامعات کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جامعات میں اسلامی تہذیب واقدار کا ماحول فراہم نہیں کیا جاتا، مخلوط اور آزادانہ تعلیم نسل نو کے بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ تعمیر سیرت وکردار اور اخلاقی تربیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ملک کے معاشی واقتصادی مسائل کے حل کے لیئے غیر ملکی ادنی درجے کے ماہرین کو زیادہ زرمبادلہ صرف کرکے بلایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خود جامعات کے اساتذہ تعلیم وتربیت کے لیئے بیرون ملک جاتے ہیں، جہاں وہ اپنے علوم سے متعلقہ ایسی مہارتیں اور انکشافات کرتے ہیں جن کا پاکستان میں اطلاق ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس طرح سے محض مغربی اقدار وروایات کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ بین الاقوامی تعلیم یافتہ اساتذہ ک پاکستان میں زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جامعات کی علاقائی مراکز میں تقسیم سے یہ قومی یکجہتی وتعمیر نو کے فروغ میں کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں، معاشرے سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان تمام امور کی اصلاح کے لیئے ضرورت اس امر کی ہے کے جامعات کے چارٹر میں نظریہ پاکستان کے مطابق مقاصد میں ترامیم کی جائیں اور نظریاتی مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کے فرائض و تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بنایا جائے۔ غیر ملکی تہذیب وتمدن کے پھیلاؤ کو روکنے کیے لیئے جامعات میں اخلاقی وروحانی تربیت کو فروغ دیا جائے، غیر ملکی لٹریچر اور مہارتوں کی نسبت ملکی شعور واعلی تعلیم یافتہ افراد کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ جامعات کے نصابات میں عصری مسائل کے

---

(۱) مجلہ تعلیم (۸)، پاکستان میں جامعات کا کردار، مسلم سجاد، (مقالہ: تعلیم، نظریہ پاکستان اور ہماری جامعات، پروفیسر پرویز اے صدیقی)، ص: ۸۷-۸۸

مطابق ترامیم کی جائیں۔ جامعات فنی وپیشہ وارانہ تعلیم اور تخصیص و تحقیق کے مخصوص اداروں کے طور پر کام کریں تاکہ نوجوانوں کو اعلی تعلیم کے حصول کے بعد روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوں۔[1]

عصر حاضر کے اعلی تعلیمی ادارے تعلیم کے حقیقی مقاصد سے بے پرواہی برتے ہوئے ہیں۔ تعلیمی اداروں کو محض کمائی کا ایک ذریعہ بنایا جارہا ہے اور طلباء کی تعلیم وتربیت کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اعلی تعلیمی اداروں میں صرف فنی وپیشہ وارانہ تعلیم پر زور دیا جارہا ہے اور طلباء کو دفتری ملازمین کے طور پر تیار کیا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملاً دینی واخلاقی تربیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ نسل نو تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود اخلاقی تنزلی کا شکار ہے۔ جھوٹ، خیانت، ظلم وستم، حسد، بغض وکینہ، بے حیائی اور بدکاری وغیرہ معاشرے میں عام ہے۔ نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیئے باقاعدہ فیلڈورک کیا گیا ہے۔ ایک سوالنامہ تیار کر کے اسلام آباد کی تین مختلف یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے طلباء سے پر کروایا گیا ہے۔۔ اس سوالنامے کا مقصد یونیورسٹیوں کے طلباء کی آراء لینا ہے تاکہ یہ جانا جاسکے کہ تعلیم یافتہ نسل نو میں پائی جانے والی بداخلاقیوں کے اسباب کیا ہیں؟ منتخب کردہ یونیورسٹیوں کا تعارف درج ذیل ہے۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

جامعہ نمل جسے "جامعہ قومی برائے جدید لسانیات" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستانی حکومت کے زیر اہتمام چلنے والا ایسا ادارہ ہے جس میں مختلف ملکوں میں بولی جانے والی زبانیں سکھائی جاتی ہیں، خصوصا بیرون ملک پاکستانی سفارتخانوں میں تعینات ہونے والے سول یا فوجی افسران کو وہاں کی مقامی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ یہ ادارہ سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ۱۹۶۹ء میں قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کو باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ ۲۰۰۰ء میں دیا گیا اور اس کے بعد اسے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کہا جانے لگا۔ یہ تبدیلی پرویز مشرف کے دور حکومت میں ہوئی اور ہر دور میں یونیورسٹی کا ریکٹر جنرل رینک کا افسر ہونے کا فیصلہ دیا جاتا رہا۔ آج یونیورسٹی کے ریکٹر میجر جنرل ضیاءالدین نجم ہیں۔ جو اپنی تعلیمی اور تخلیقی صلاحیتوں سے یونیورسٹی کے معیار کو بلند کرنے کے لیئے بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہ جامعہ ۲۵ ایکڑ سے بھی زائد رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ۱۰،۰۰ سے زائد طلباء کو زیر تعلیم سے آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت ۵ مختلف تعلیمی بلاک اور ایک آئی ٹی بلاک پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ کے اندر دور دراز سے تعلق رکھنے والے طلباء کے لیئے رہائش کا انتظام بھی ہے۔ جامعہ کے اندر طلباء کے لیئے ۴ ہاسٹل پائے جاتے ہیں۔ اس جامعہ میں

---

(۱) مجلہ تعلیم (پاکستان میں جامعات کا کردار)، ص:۹۳

مختلف ممالک کی زبانیں سکھائی جاتی ہیں اور عوام الناس کو ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ جیسا کہ دور حاضر میں نمل میں ۲۷ مختلف زبانیں سکھائی جارہی ہیں۔ یونیورسٹی کے طلباء نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک سے بھی تعلق رکھتے ہیں مثلاً سعودی عرب، چائنہ، ایران، کوریا، مشرق وسطی اور دیگر دوسرے ممالک سے وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جامعہ میں مختلف تحقیقی پروگرام کا انعقاد بھی کیا گیا ہے۔ مختلف مضامین میں گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے پروگرام آفر کیئے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں مختلف شعبہ جات قائم کیئے گئے ہیں جیسا کہ انجینئرنگ اور کمپیوٹر سائنس کا شعبہ، انگلش اسٹڈیز کا شعبہ، مینیجمنٹ سائنسز اور سوشل سائنسز کے شعبے۔ ان شعبہ جات کے زیر اہتمام مختلف ڈیپارٹمنٹ اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ جیسا کہ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، پاکستان اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ، اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ، ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ وغیرہ۔ جامعہ میں ۳۵ سے زائد تعلیمی شعبہ جات پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں تعلیمی و تحقیقی سرگرمیوں کے ۵۰۰ سے زائد ماہر تعلیم اور اعلی تعلیم یافتہ اساتذہ پائے جاتے ہیں۔ طلباء کے لیئے لائبریری کا انتظام بھی ہے جس میں ۱۵،۰۰۰ سے زائد کتب پائی جاتی ہیں، جس سے طلباء اور اساتذہ کی تعلیمی اور تحقیقی ضروریات کو باخوبی پورا کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے چار مختلف صوبوں میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز سے وابستہ ۷ ریجنل کیمپسز پائے جاتے ہیں۔ جن میں مختلف تعلیمی پروگرام کا انعقاد کیا گیا ہے اور تحقیقی لحاظ سے بھی طلباء میدان علم میں نشوونما پارہے ہیں۔

انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کو ۱۹۸۰ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد تعلیمات اسلام کی ترویج واشاعت اور طلباء کو اسلامی طرز حیات سے روشناس کرانا ہے۔ یونیورسٹی کی ابتداء "اسلامی یونیورسٹی" کے نام سے قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے کیمپس میں کی گئی، جس میں LL.M ڈگری پروگرام سے ابتداء کرتے ہوئے صرف ۹ شاگردوں کو زیور تعلیم سے سے آراستہ کیا گیا۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں باقاعدہ یونیورسٹی کو زیر تعمیر کیا گیا اور اس کا نام بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی رکھا گیا۔ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آج یونیورسٹی میں ۹ فیکلٹیز اور ۶ تعلیمی بلاک پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی ۱۲۰ تعلیمی پروگراموں کو چلا رہی ہے۔ اس جامعہ میں ۱۷،۰۰۰ سے زائد نوجوانوں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جن میں سے ۷۰۰۰ خواتین اور باقی مرد حضرات ہیں۔ یونیورسٹی کے زیر سرکردگی چلنے والا ادارہ اقراء کالج آف ٹیکنالوجی میں ۲۰۰۰ سے زائد طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروچانسلر پروفیسر ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ابا الخیل ہیں، جن کا تعلق سعودی عرب ریاض سے ہے اور ریکٹر کے منصب پر پروفیسر ڈاکٹر معصوم یاسین زئی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۲۰۱۲ء میں ہائر ایجوکیشن کمیشن نے پاکستان کی جنرل یونیورسٹیوں کی رینکنگ میں اس یونیورسٹی کو چوتھے نمبر پر قرار دیا۔ اس یونیورسٹی کے دو کیمپسز ہیں ایک اولڈ کیمپس جو کہ فیصل مسجد اسلام آباد میں واقع ہے اور دوسرا نیو کیمپس ایچ-۱۰/ اسلام آباد میں ہے۔

اس جامعہ میں طلباء کی دینی و دنیاوی تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیئے مختلف شعبہ جات پائے جاتے ہیں۔ بیسک اور اپلائڈ سائنسز کا شعبہ، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کا شعبہ، لینگویج اور لٹریچر کا شعبہ، مینیجمنٹ سائنسز کا شعبہ، شریعہ اور لاء کا شعبہ، سوشل سائنسز کا شعبہ اور اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ۔ جامعہ کے اندر ۷ تعلیمی بلاک پائے جاتے ہیں، جن میں مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیو کیمپس میں ایک سینٹرل لائبریری بھی پائی جاتی ہے۔ جس میں عربی، اردو، انگلش اور فارسی زبان میں بہت ساری کتب میسر ہیں۔ لائبریری میں اسلامی تعلیمات سے متعلقہ، تفاسیر، احادیث، فقہ اور سیرت النبی ﷺ وغیرہ پر بیش بہا مواد پایا جاتا ہے۔ جن سے اصول الدین اور شریعہ اینڈ لاء کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے طلباء خوب استفادہ کرتے ہیں۔ لائبریری میں انسائیکلپیڈیاز اور ڈکشنریاں بھی وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ جو زبانوں کے فہم میں طلباء کو معاون ثابت ہوتی ہیں۔

یونیورسٹی میں طلباء کی رہائش کے لیئے ۷ ہاسٹل عورتوں کے لیئے اور ۶ مردوں کے لیئے تعمیر کیئے گئے ہیں۔ جن میں رہائش کے لیئے بیرون ملک اور دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے پاکستانی طلباء کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک عمارت کو کیفیٹیریا کے طور پر مختص کر دیا گیا ہے۔ جس کے آس پاس بینک اور کتابوں کی خریداری کے لیئے چھوٹی دکانیں بھی کھولی گئی ہیں۔

وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، پاکستان کی پہلی ایسی یونیورسٹی ہے جس کا مقصد اردو زبان کو تعلیم و تدریس کے لیئے بنیادی زبان کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ اس یونیورسٹی کا انعقاد پاکستان کے آرڈیننس نمبر CXIX 2002 کے تحت ۱۳ نومبر ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ یونیورسٹی نے اپنے کام کا آغاز دو وفاقی گورنمنٹ کالجز کو لیتے ہوئے کیا جن کے نام ہیں وفاقی اردو سائنس کالج کراچی اور وفاقی اردو آرٹس کالج کراچی۔ نومبر ۲۰۰۳ء میں وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد نے باقاعدہ تدریسی پروگرامز کا آغاز کیا۔ جس کے لیئے یونیورسٹی میں باقاعدہ شعبہ جات قائم کیئے گئے، اکنامکس اور مینیجمنٹ سائنسز کا شعبہ، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس کا شعبہ، جن کا بھرپور زور بزنس ایڈمنسٹریشن اور کمپیوٹر سائنس کے مضامین کی تعلیم و تدریس پر تھا۔ یونیورسٹی میں بی-اے سے لے کر پی-ایچ-ڈی کی سطح کے تمام پروگرامز کا انعقاد کیا گیا ہے۔ معاشیات، بزنس ایڈمنسٹریشن، اسلامک اسٹڈیز کامرس، کمپیوٹر سائنس، اردو اور اپلائڈ فزکس جیسے تمام مضامین میں بی-

اے،ماسٹر،ایم فل وغیرہ کروانے کے لیئے شعبہ جات قائم کیئے گئے ہیں۔کل نو شعبہ جات یونیورسٹی میں قائم ہیں،اردو کا شعبہ ،اکنامکس کا شعبہ،کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ کا شعبہ،بزنس ایڈمنسٹریشن کا شعبہ،کامرس کا شعبہ،اپلائیڈ فزکس کا شعبہ،الیکٹرکل انجینئرنگ کا شعبہ،اسلامیات کا شعبہ، قانون کا شعبہ۔یونیورسٹی سے منسلک کیمپسزز،کالجز اور ادارے پاکستان یا پاکستان سے باہر کہیں بھی قائم کیئے جائیں گے۔

خلاصہ بحث :

عصر حاضر کا المیہ یہ ہے کہ قوم دو متوازی قسم کے نظام تعلیم میں جکڑی ہوئی ہے۔دینی نظام تعلیم نے فرقہ واریت کا رنگ اختیار کر کے کہ دین اسلام میں تعلیم حاصل کرنے کہ حقیقی مقاصد کو بھی مفقود کر دیا ہے۔اور دوسرا جدید یا سیکولر نظام تعلیم مثلاً سکول،کالج،یونیورسٹی وغیرہٍ جو کہ مذہب،تہذیب وتمدن اور اخلاق و معاشرتی تربیت سے بالکل عاری ہے۔یہاں تک کہ قومی سطح پر بھی بحران کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔یہ مغربی رجحانات کے زیر اثر قائم کیئے جاتے ہیں اور انہی کی بے خدا تہذیب میں مدون کی گئی کتب کو پڑھایا جاتا ہے۔نیز جدید نظام تعلیم نے قوم کے با اثر،باوسائل اور حکمران طبقے کے لیئے خصوصی ادارے قائم کر کے معاشرے میں میں طبقاتی تفاوت پیدا کر دیا ہے۔یہ ادارے عدم مساوات کی مستقل بنیادیں ہیں،ہر بچے کا تعلیمی دائرہ اس کی معاشی حیثیت اور خاندانی پس منظر میں الگ الگ منقسم ہوتا چلا گیا۔اسی طرح افراد قوم کے معاشرتی روابط،دلچسپیوں کے مراکز،طرز زندگی حتی کہ فکر و نظر کے پیمانے بھی منقسم ہوتے گئے۔غرض یہ کہ تعلیمی زندگی میں طبقاتی تفاوت نے خاندانی معیارات کو ادنی واعلی درجات میں تقسیم کر دیا ہے،جس سے معاشرے میں عداوت،عدم یگانگت اور تصادم کی فضا برپا ہو گئی ہے۔لہذا ہمارا عمومی نظام تعلیم تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔معاشرے میں دو طرح کے نظام ہائے تعلیمی ادارے دو الگ طرح کی شخصیات کو تیار کر رہے ہیں جو اپنا اپنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں مگر کسی کو بھی مثالی شخصیت نہیں کہا جا سکتا۔نئی نسل کے لیئے جدید علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی علوم کا حصول بھی ضروری ہے۔اب سوچنا یہ ہے کہ کسطرح اس دو طرفی نظام تعلیم کی خلیج کو ختم کر کے ایک ایسا مربوط نیا نظام تعلیم بنایا جائے،جس سے معاشرے میں یکساں نظام تعلیم کا بول بالا ہو۔اسلامی نظریاتی ریاست میں ایک ہی نظام تعلیم رائج ہونا چاہیئے جو اس کے نظریہ کے مطابق ہو اور ملک کی متنوع ضروریات کو بحسن وکمال پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔اسلامی مملکت میں ایسے نظام تعلیم کی گنجائش نہیں ہے جو صرف قدیم اسلامی علوم سے منسلک ہو اور جدید علوم سے بے بہرہ ہو اور نہ ایسے نظام تعلیم کا تقاضا کرتی ہے جس میں علوم کی اساس مغرب کا بے خدا فلسفہ ہو اور دین اسلام کی اساس قرآن وسنت سے بالکل بے بہرہ ہو۔قوم کو متحد و منظم کرنے کے لیئے مشترکہ نصب العین،ہم زبان اور یکساں نظام تعلیم کا نفاذ بہت ضروری ہے۔

فصل دوم

سروے نتائج اور تجزیاتی مطالعہ

سروے نتائج

سوالنامہ

نوجوانوں میں اخلاقی اقدار کا فقدان اور اعلی تعلیمی ادارے

نام:_____ جنس:_____ عمر:_____

تعلیم:_____ جامعہ:_____

نمبر شمار	آپ سے درخواست ہے کے دیئے گئے سوالات کو غور سے پڑھیئے اور درست جواب کا انتخاب کریں	ہاں	نہیں	معلوم نہیں
۱)	کیا موجودہ معاشرے کے نوجوان اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہیں؟			
۲)	کیا معاشرے کی اصلاح کیلئے نوجوان اپنے فرائض کو ادا کر رہے ہیں؟			
۳)	کیا قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار نوجوانوں کی دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت پر ہے؟			
۴)	کیا دین اسلام ایک متوازن شخصیت کی تعمیر کے لئے اخلاقی و روحانی تربیت پر بہت زور دیتا ہے؟			
۵)	کیا صالح معاشرے کے انعقاد کے لئے مادی تعلیم کے ساتھ روحانی و اخلاقی تعلیم و تدریس بھی ضروری ہے؟			
۶)	آپ کے خیال میں اخلاقی تربیت کے لئے تعلیمی نظام میں اخلاقی اقدار کا شامل نصاب ہونا ضروری ہے؟			
۷)	کیا موجودہ نظام و نصاب تعلیم اخلاق و کردار کی اصلاح کے لئے موزوں ہے؟			
۸)	کیا دور حاضر کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیتی ماحول بھی میسر کیا جا رہا ہے؟			
۹)	کیا اعلی تعلیمی سطح پر تعلیم کے ذریعے دینی و اخلاقی کردار سازی کا حصول ممکن ہے؟			
۱۰)	کیا اعلی تعلیمی سطح پر نصاب تعلیم میں عقائد، اقدار اور کردار سازی کو اہمیت حاصل ہے؟			
۱۱)	کیا نصاب تعلیم اخلاق و کردار کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہو رہا ہے؟			
۱۲)	کیا مروج نصاب تعلیم میں مادی اور روحانی اخلاقی اقدار کے مابین عدم توازن نظر آتا			

	ہے؟			
۱۳)	کیا عصر حاضر کے نظام تعلیم میں دین سے بے زاری اور علوم وفنون کے حصول کو فروغ دیا جارہا ہے؟			
۱۴)	کیا ہمارے نظام تعلیم میں اسلامی تعلیم وتربیت کے برعکس پیشہ وارانہ تعلیم کو ترجیح دی جا رہی ہے؟			
۱۵)	کہیں ایسا تو نہیں کے اخلاقی اقدار کتابوں کی حد تک تو موجود ہیں مگر عملی تربیت کا فقدان ہے؟			
۱۶)	کیا نسل نو تعلیم کے حصول کے باوجود اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہے؟			
۱۷)	کیا نسل نو کی اخلاقی وروحانی تربیت میں اساتذہ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں؟			
۱۸)	کہیں نوجوانوں کے اخلاقی زوال کا سبب والدین کی غفلت اور غیر متوازن سلوک تو نہیں؟			
۱۹)	کیا الیکٹرانک میڈیا نوجوانوں میں بداخلاقیوں کو فروغ دے رہا ہے؟			
۲۰)	کیا انسان کے اخلاق وکردار پر اسکی صحبت کا بھی اثر ہوتا ہے؟			
۲۱)	کیا خدا سے دوری اور یوم آخرت سے بے خوفی اخلاقی انحطاط کا سبب ہے؟			
۲۲)	کیا قومی تعلیمی پالیسیوں میں مقاصد تعلیم کا غیر اسلامی رو سے مرتب کرنا اخلاقی فقدان کا سبب ہے؟			
۲۳)	کیا نظام تعلیم کی تنظیم وتربیت میں غیر ملکی دباؤ موجود ہے؟			

مہرین زاہد (ایم فل (علوم اسلامیہ)/ نمل، اسلام آباد)

کسی بھی انسان کے لیئے تعلیم کے ساتھ اخلاقی وروحانی تربیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔تربیت انسانی ہی کے لیئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا تا کہ وہ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع بنا سکیں اور ان کی زندگیوں کو دین اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔دینی واخلاقی تربیت کے بغیر اسلام کا انسان مطلوب تیار نہیں ہو سکتا۔اگر تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفوس سے غفلت برتی جائے تو ایک یکسو اور مضبوط مسلم شخصیت پروان نہیں چڑھتی اور معاشرہ بے شمار برائیوں کا شکار ہوتا ہے۔دور حاضر کی یہی صورت حال ہے کہ تعلیمی اداروں میں اخلاقی وروحانی تربیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ان اداروں میں پروان چڑھنے والی نسل نو اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہے۔تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نوجوان ان صفات حمیدہ سے عاری ہیں،جن سے مسلمانوں کے سیرت وکردار کو سنوارا جاسکتا ہے۔مسلمان نبی آخر الزمان ﷺ کی تعلیمات کو بھولے ہوئے ہیں،جن کی بعثت کا مقصد ہی اعلی اخلاق کی تکمیل ہے۔اخلاقی پسماندگی کی بناء پر آج مسلمان بیشتر انفرادی،معاشرتی اور معاشی مسائل کا شکار ہیں اور معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔معاشرے کی موجودہ صورت حال پاکستان کے مستقبل کے لیئے لمحہ فکریہ بنتی جا رہی ہے۔لہذا نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیئے میں نے ایک سوالنامہ تیار کر کے باقاعدہ فیلڈ ورک کیا ہے۔اس سوالنامے کے ذریعے سکالرز اور دانشوروں کی آراء کا تجزیہ کیا گیا ہے۔یہ سوالنامہ تین جامعات سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبہ جات کے طلباء سے پر کروایا گیا ہے۔سوالنامہ پر کرنے کے لیئے جن نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ان کی عمر ۱۹ سے زائد تھی۔ہر جامعہ سے ۱۰۰ نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا۔کل ۳۰۰ سوالنامے پر کرائے گئے ہیں۔یہ سوالنامہ objective type ہے۔ہر سوال کی تین آپشنز دی گئی تھیں۔سوال کے جواب میں ہاں،نہیں اور معلوم نہیں میں سے کسی ایک جواب کا انتخاب کرنا تھا۔سوالنامے کے نتائج کو تینوں جامعات کے مجموعی نتائج کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ہر سوال کی تینوں آپشنز کی percentage نکالی گئی ہے اور گراف کی صورت میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔آخر میں تمام تر آراء کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

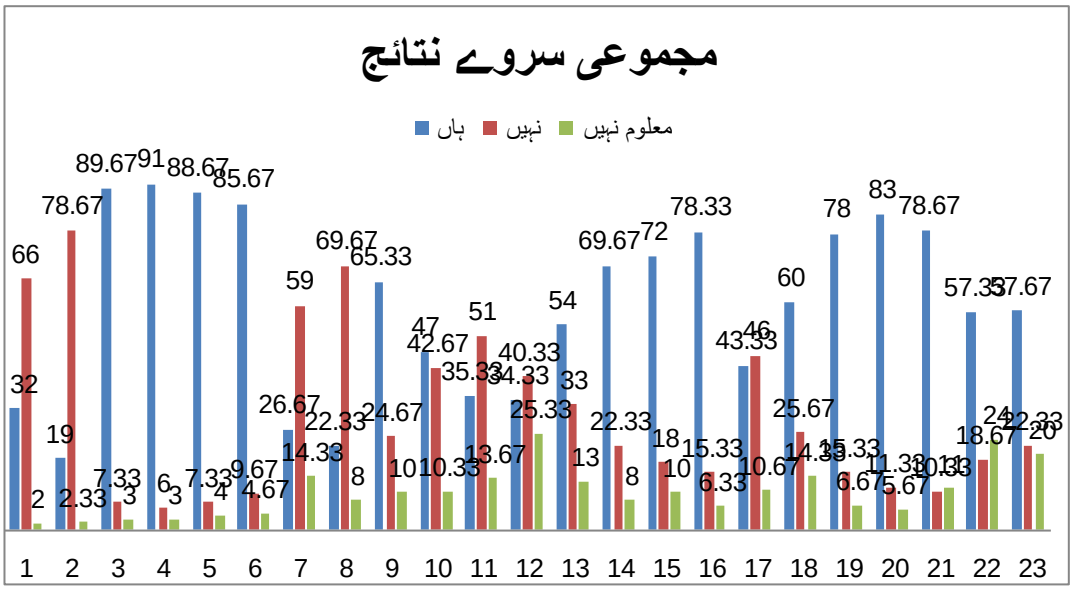

پہلے سوال میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا موجودہ معاشرے کے نوجوان اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہیں؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
32٪	66٪	2٪

سوال نمبر ۲: کیا معاشرے کی اصلاح کیلئے نوجوان اپنے فرائض کو ادا کر رہے ہیں؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
19٪	78.67٪	2.33٪

سوال نمبر ۳: کیا قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار نوجوانوں کی دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت پر ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
89.67٪	7.33٪	3٪

سوال نمبر ۴: کیا دین اسلام ایک متوازن شخصیت کی تعمیر کے لئے اخلاقی و روحانی تربیت پر بہت زور دیتا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
91٪	6٪	3٪

سوال نمبر ۵: کیا صالح معاشرے کے انعقاد کے لئے مادی تعلیم کے ساتھ روحانی و اخلاقی تعلیم و تدریس بھی ضروری ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
88.67٪	7.33٪	4٪

سوال نمبر ۶: آپ کے خیال میں اخلاقی تربیت کے لئے تعلیمی نظام میں اخلاقی اقدار کا شامل نصاب ہونا ضروری ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
85.67٪	9.67٪	4.67٪

سوال نمبر ۷: کیا موجودہ نظام و نصاب تعلیم اخلاق و کردار کی اصلاح کے لئے موزوں ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
26.67٪	59٪	15.33٪

سوال نمبر ۸: کیا دور حاضر کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیتی ماحول بھی میسر کیا جا رہا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
22.33٪	69.67٪	8٪

سوال نمبر۹: کیا اعلی تعلیمی سطح پر تعلیم کے ذریعے دینی و اخلاقی کردار سازی کا حصول ممکن ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
65.33٪	24.67٪	10٪

سوال نمبر۱۰: کیا اعلی تعلیمی سطح پر نصاب تعلیم میں عقائد، اقدار اور کردار سازی کو اہمیت حاصل ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
47٪	42.67٪	10.33٪

سوال نمبر۱۱: کیا نصاب تعلیم اخلاق و کردار کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہو رہا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
35.33٪	51٪	13.67٪

سوال نمبر۱۲: کیا مروج نصاب تعلیم میں مادی اور روحانی اخلاقی اقدار کے مابین عدم توازن نظر آتا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
34.33٪	40.33٪	25.33٪

سوال نمبر۱۳: کیا عصر حاضر کے نظام تعلیم میں دین سے بے زاری اور علوم و فنون کے حصول کو فروغ دیا جا رہا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
54٪	33٪	13٪

سوال نمبر ۱۴: کیا ہمارے نظام تعلیم میں اسلامی تعلیم و تربیت کے بر عکس پیشہ وارانہ تعلیم کو ترجیح دی جارہی ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
69.67٪	22.33٪	8٪

سوال نمبر ۱۵: کہیں ایسا تو نہیں کے اخلاقی اقدار کتابوں کی حد تک تو موجود ہیں مگر عملی تربیت کا فقدان ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
72٪	18٪	10٪

سوال نمبر ۱۶: کیا نسل نو تعلیم کے حصول کے باوجود اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
78.33٪	15.33٪	6.33٪

سوال نمبر ۱۷: کیا نسل نو کی اخلاقی و روحانی تربیت میں اساتذہ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
43.33٪	46٪	10.67٪

سوال نمبر ۱۸: کہیں نوجوانوں کے اخلاقی زوال کا سبب والدین کی غفلت اور غیر متوازن سلوک تو نہیں؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
60٪	25.67٪	14.33٪

سوال نمبر ۱۹: کیا الیکٹرانک میڈیا نوجوانوں میں بداخلاقیوں کو فروغ دے رہا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
78٪	15.33٪	6.67٪

سوال نمبر ۲۰: کیا انسان کے اخلاق و کردار پر اسکی صحبت کا بھی اثر ہوتا ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
83٪	11.33٪	5.67٪

سوال نمبر ۲۱: کیا خدا سے دوری اور یوم آخرت سے بے خوفی اخلاقی انحطاط کا سبب ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
78.67٪	10.33٪	11٪

سوال نمبر ۲۲: کیا قومی تعلیمی پالیسیوں میں مقاصد تعلیم کا غیر اسلامی رو سے مرتب کرنا اخلاقی فقدان کا سبب ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
57.33٪	18.67٪	24٪

سوال نمبر ۲۳: کیا نظام تعلیم کی تنظیم و تربیت میں غیر ملکی دباؤ موجود ہے؟

ہاں	نہیں	معلوم نہیں
57.67٪	22.33٪	20٪

سروے کا تجزیاتی مطالعہ:

اس سروے کے statistical analysis کے بعد، مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ عصر حاضر کی نوجوان نسل تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اخلاق و کردار سے عاری ہے اور اپنے حقوق و فرائض سے غافل ہے۔ جیسا کہ سوالنامے میں جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا نوجوان اصلاح معاشرہ میں اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں تو ۷۸۰۶۷٪ افراد نے نہیں میں جواب دیا اور ۶۶٪ نوجوانوں کے تحت حقیقت میں نوجوان اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہی نہیں ہیں، جس کی وجہ دور حاضر کا نظام تعلیم ہے۔ موجودہ نظام تعلیم کے ذریعے نوجوانوں کو تعلیم تو میسر کی جارہی ہے البتہ عملی تربیت مفقود نظر آتی ہے۔ ۶۹۰۶۷٪ نوجوانوں کے تحت تعلیمی اداروں میں تربیتی ماحول میسر نہیں کیا جارہا ہے۔ جبکہ نوجوانوں کی اکثریت ۸۸۰۶۷٪ کے نزدیک صالح معاشرے کے انعقاد کے لیئے مادی تعلیم کے ساتھ روحانی واخلاقی تربیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ۹۱٪ نوجوان اس بات کا فہم رکھتے ہیں کہ دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو متوازن شخصیت کی تعمیر کے لیئے اخلاقی وروحانی تربیت پر بہت زور دیتا ہے۔ موجودہ دور کے نظام تعلیم کو پرکھا جائے تو ۵۴٪ نوجوانوں کے تحت نظام تعلیم میں دین سے بے زاری اور علوم وفنون کے حصول کو فروغ دیا جارہا ہے۔ ۶۹۰۶۷٪ نوجوان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ نظام تعلیم میں اسلامی تربیت کے برعکس پیشہ وارانہ تعلیم کو ترجیح دی جارہی ہے۔

نظام تعلیم کا بنیادی عنصر نصاب تعلیم ہے۔ مروجہ نصاب تعلیم ۵۱٪ نوجوانوں کے مطابق اخلاق و کردار کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت نہیں ہورہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۷۸۰۳۳٪ نوجوان تعلیم کے حصول کے باوجود اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہیں۔ اخلاقی تنزلی کے بہت سے دیگر اسباب بھی ہیں۔ نوجوانوں سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا تو ۴۶٪ نوجوانوں کے مطابق طلباء کی روحانی واخلاقی تربیت میں اساتذہ اپنا کردار ادا نہیں کر رہے ہیں۔ ۶۰٪ نوجوان اخلاقی زوال کا سبب والدین کے غیر متوازن سلوک اور ان کی غفلت کو ٹھہراتے ہیں۔ ۷۸٪ نوجوانوں نے الیکٹرانک میڈیا کو نوجوانوں میں بداخلاقیوں کو فروغ دینے کا سبب قرار دیا۔ ۸۳٪ نوجوانوں کے تحت انسان کے اخلاق و کردار پر صحبت کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ۷۸۰۶۷٪ نوجوانوں کی خدا سے لاتعلقی اخلاقی انحطاط کا سبب ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مذکورہ اسباب کہ سدباب کے لیئے پہلے قومی تعلیمی پالیسیوں میں مقاصد تعلیم کو اسلامی رو سے مرتب کیا جائے۔ تعلیمی نظام میں اسلامی قدروں کو فروغ دینے سے ہی طلباء کی مادی وروحانی تربیت کا حصول ممکن ہے۔ نیز اساتذہ اور والدین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے مادی ضروریات کے ساتھ نوجوانوں کی اخلاقی وروحانی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ معاشرے کی فلاح وبہبود کا انحصار اعلی سیرت وکردار کے حامل افراد پر ہے۔ اخلاقی صفات سے متصف افراد ہی قوموں میں عزت ومقام حاصل کر سکتے ہیں۔ آج مسلمان اخلاقی تنزلی کے سبب اپنا

مقام کھو چکے ہیں۔ شریعت محمدی پر عمل پیرا ہونے کی بجائے مغربی تہذیب کا بول بالا ہے۔ مغربی زبان اور مغربی کلچر کے حامل افراد کو عزت و تکریم سے دیکھا جاتا جبکہ اپنے مذہب اسلام پر عمل پیرا ہونا مسلمانوں کے لیئے دشوار ہو گیا ہے۔ محض چند فیصد نوجوان ہیں جو صحیح معنوں میں دین اسلام کو عملا زندگیوں میں ڈھالے ہوئے ہیں ،یہی افراد دنیاوآخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہیں۔ چنانچہ نوجوانوں کی د صحیح تربیت کے لیئے ضروری ہے کہ تعلیمات اسلام سے ان کے تعلق کو جوڑا جائے اور یوم آخرت پر ایمان کو پختہ کیا جائے۔ نوجوانوں کی روحانی واخلاقی تربیت سے ہی یہ معاشرہ امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

فصل سوم

نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب

نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے اسباب

دین اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہیں۔ یہ صرف عقائد وعبادات کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کی عملی زندگی اور سیرت وکردار پر بھی بہت زور دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی تصور مذہب انسان کو دیتا ہے جس میں محض نماز، روزہ مذہبی عمل نہیں بلکہ ہر وہ کام جو اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے لیئے کیا جائے عبادت ہے۔ اس کا مقصد تمام معاملات زندگی میں اسلامی تعلیمات کا نفاذ اور اعلی اخلاقی قدروں پر سیرت وکردار کی تشکیل ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کسی بھی قوم کو اقوام عالم میں اپنا مقام بنانے اور ترقی کی اعلی منازل تک پہنچنے کے لیئے علوم ومعارف سے کہیں زیادہ اخلاق عالیہ کو اہمیت حاصل ہے۔ البتہ عصر حاضر میں سیکولر نظام تعلیم اور معاشرے میں مغربی تہذیب کی بالادستی کی وجہ سے مسلمانوں نے دینی انداز فکر وعمل اور اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا ہے۔ اعلی ڈگریوں کے حصول کے باوجود مسلمان اخلاقی قدروں سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ غیر محسوس طریقے سے حقیقی اسلام کی تصویر کو مسخ کر کے لادینیت کو فروغ دیا جارہا ہے۔ نوجوانوں میں بے حسی، مفاد پرستی اور بے حیائی عام ہوگئی ہے۔ وہ اعلی صفات جن کی بناء پر ہمارے اسلاف اعلی مرتبوں تک پہنچے تھے مسلمانوں نے ترک کر دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان انحطاط کا شکار ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کا تقاضا یہ ہے کہ نسل نو کی اخلاقی تربیت واصلاح پر توجہ مرکوز کی جائے۔ تربیت کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ پہلے ان امراض واسباب کی جانچ کی جائے جو کہ نسل نو میں اخلاقی تنزلی کی وجہ ہیں۔ ذیل میں ان اسباب وعلل کا ذکر تفصیلا کیا جاتا ہے۔

اساتذہ کا منفی کردار:

اسلامی تربیت کا سب سے پہلا وسیلہ معلم کا کردار ہے۔ معلمین انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں۔ یہ شیوہء پیغمبری ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کے بعد یہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کی ہر شعبۂ زندگی سے متعلق بہترین رہنمائی کریں اور انہیں راہ حق سے بھٹکنے نہ دیں۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کی کامیابی کا دارومدار محنتی اور علمی ذوق رکھنے والے اساتذہ پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ قوم کے بنیادی نظریے کے مطابق طلباء میں علمی وفکری ذوق پیدا کریں، ان کی اخلاق تربیت کریں اور انہیں تہذیب نفس سے آراستہ کریں۔ طلباء میں خیر کی استعداد کو پروان چڑھانے میں استاد کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ماں کی آغوش کے بعد، انسان کی تربیتِ اخلاق کے لیئے معاشرے کی اہم ترین شخصیت استاد ہی ہے۔ استاد قوم کا مربی ہے۔ استاد میں احساس ذمہ داری اور دیانت دار ہونا بہت ضروری ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[1]

ترجمہ: سنو کہ تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کی بابت سوال ہو گا۔

صرف کورس پڑھا دینا یا وعظ و تقاریر کرنا استاد کا فرض نہیں بلکہ معلم و مربی ہونے کی حیثیت سے طلباء کے لیئے بہترین نمونہ بننا چاہیئے۔ طلباء کے عقائد و ایمان کی درستگی، اخلاقی تربیت، اچھے عادات و خصائل کو اختیار کرنا، قوم کے اعلی نظریات و مقاصد سے ہم آہنگ کرنا، حق و باطل، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا شعور دینا اساتذہ کے اولین فرائض میں سے ہے۔ بچوں کی صلاحیتوں کی صحیح نشو و نما کے لیئے ضروری ہے کہ استاد بغیر کسی دنیاوی حرص و لالچ اور لذتوں کے مخلص ہو کر نہایت لگن اور دل سوزی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی کرے۔ تعلیم و تدریس کا مقصد حصول زر نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیئے خلوص نیت ہو کر طلباء کی تربیت کرنا ہے اور نہایت مستقل مزاجی اور مضبوط قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے اپنے فرائض کو ادا کرنا ہے۔ ایسے اساتذہ ہی اللہ کے ہاں سرخرو اور اس کے بندوں میں معزز و محترم ہوتے ہیں، اپنے مقام و منصب کو سمجھتے ہوئے مثبت کردار ادا کرنے والے اساتذہ ہی تاریخ کے اوراق میں اپنا نام ثبت کر جاتے ہیں اور ان کے طلباء ان کے لیئے باعث فخر اور صدقہ جاریہ بنتے ہیں۔

عصر حاضر میں دیکھا جائے تو اساتذہ اپنے فرائض و ذمہ داریوں سے غفلت برتے ہوئے ہیں، محض معلومات کی فراہمی تک اپنے آپ کو محدود کیا ہوا ہے۔ طلباء کی دینی و اخلاقی تربیت کا کوئی رجحان نہیں۔ جس کے نتیجے میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود طالب علم کی شخصیت میں وہ صفات نظر نہیں آتی جو تعلیم و مذہب کا اصل مقصد ہیں۔ اساتذہ کے درج ذیل منفی رویات طلباء میں اخلاقی تنزلی کا سبب ہیں:

اساتذہ اپنی ذات سے طلباء کی اخلاقی تربیت کے لیئے نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جبکہ عصر حاضر میں بیشتر اساتذہ اپنے برے اخلاق کی وجہ سے طلباء پر برا اثر ڈال رہے ہیں، مثلاً سیگریٹ نوشی کرتے ہیں، انتقاما کسی کے نمبر کم کر دینا یا پیسے لے کر نمبر بڑھا دینا، بدلے کی آگ میں کسی کو فیل کر دینا اور ٹیویشن پڑھنے پر مجبور کرنا، فحش کلامی کرنا وغیرہ۔ اساتذہ کو چاہیئے کے اپنے اقوال کو اپنے اعمال سے تقویت دیں کیونکہ آنکھوں سے دیکھا گیا عمل کانوں سے سنی گئی بات سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے تزکیۂ نفس اور اسلامی تربیت اخلاق کے لیئے ضروری ہے کہ پہلے خود اساتذہ اس کا عملی نمونہ بن کر پیش کریں۔ اس سلسلے میں عام آدمی کے مقابلے میں اساتذہ پر کہیں گنا زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ افسوس کہ عملی دنیا میں یہ چیز بہت کم نظر آتی ہے۔ اساتذہ محض طلباء تک معلومات کی فراہمی اور وعظ و نصیحت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور تربیت کو سرے سے نظر انداز کیا ہوا ہے۔ حالانکہ اسلامی تربیت کا پہلا ذریعہ معلم کا کردار ہے اور وعظ و تقاریر کا عمل کردار کے بعد شروع ہوتا

---

(۱) الجامع الصحیح، کتاب الجمعہ، باب الجمعہ فی القری والمدن، حدیث نمبر: ۸۹۳، ۲/ ۵

ہے۔یعنی اگر ہم صحیح معنوں میں مسلمانوں کو شعائر اسلام کا پابند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے مسلمان معلم بننا چاہیئے جو اپنے عمل و کردار سے طالب علم کو متاثر کرے اور طالب علم خود بخود اسلام کی طرف کھینچے چلے آئیں۔[1]

۱. استاد کا تعلق تمام طلباء کے ساتھ یکساں نوعیت کا ہونا چاہیئے۔ طلباء کے درمیان تفریق کرتے ہوئے کسی کو بہت زیادہ توجہ، محبت اور احترام دینا اور کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور نظر انداز کرنا، طلباء پر غلط اثرات مرتب کرتے ہیں، طلباء احساس کمتری کا شکار ہوتے ہوئے اور تعلیمی سرگرمیوں میں آگے بڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔اسی طرح اساتذہ امتحانات کے انعقاد، پرچوں کی جانچ پڑتال اور نتائج کی تیاری میں بھی جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور دیانت داری سے کام نہیں لیتے۔ جس سے محنت کرنے والے طلباء مایوسی کا شکار ہوتے اور ان کے دل میں استاد کا مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔استاد کو ہمیشہ طلباء کے نتائج کی تیاری میں انتہائی دیانتداری سے کام لیتے ہوئے تقوی کا اعلی معیار قائم رکھنا چاہیئے۔ طلباء کے مابین غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے یکساں برتاؤ کرنا چاہیئے تاکہ طلباء کا اعتماد برحال ہو اور وہ تعلیمی میدان میں اپنی صلاحیتوں سے بھرپور کام لیتے ہوئے ترقی کریں نیز وہ اساتذہ کو حقیقی معنوں میں احترام و مرتبہ دیں۔

۲. استاد کو بچوں کی اصلاح، برئے خصائل سے بچانے اور اچھی عادات کا پابند بنانے کے لیئے درمیانہ روش اختیار کرنی چاہیئے۔بے شک یہ درست ہے کہ طلباء کے ساتھ نرمی و شفقت سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کریں جیسا کہ اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں مگر بہت زیادہ حلیمی بھی بچوں کے بگاڑ کا سبب ہوتی ہے۔بچوں کو بالکل کچھ نہ کہنا انہیں اتنا دلیر بنا دیتی ہے کہ وہ پھر کام ہی نہیں کرتے اور نظم وضبط کے بھی پابند نہیں ہوتے۔ البتہ استاد اگر بہت زیادہ تشدد پسند اور چھوٹی چھوٹی بات پر مارنے کا عادی ہو تو طلباء مزید اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور استاد کی کہی ہوئی بات ان پر بے اثر ہوتی ہے۔ استاد کے اس قسم کے طرز عمل سے بچہ کو جھوٹ کی عادت پڑ جاتی ہے اور سزا سے بچنے کے لیئے وہ چالاکی و عیاری کو کام میں لاتا ہے۔یہ بری عادتیں روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہیں اور بچے کی زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔

چنانچہ طلباء کی درست تربیت کے لیئے ضروری ہے کہ کسی بھی بے جا حرکت کو دیکھتے ہوئے استاد کو نرمی سے سرزنش کرنا چاہیئے۔البتہ سزا دیتے وقت بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے، دس برس کی عمر سے اوپر کے بچوں کو نہایت اشد

---

(۱) نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید (تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)، ابوالاعلی مودودی، محمد قطب، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۷م، ص:۲۰

ضرورت کی حالت میں سزا دی جاسکتی ہے، وہ بھی ٹانگوں یا تلوؤں وغیرہ پر جہاں ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ بچوں کے منہ پر قطعاً نہیں مارنا چاہیئے[1]۔ اس بارے میں ابن سکویہ کا مشورہ یہ ہے کہ:

"خطاکار شاگرد کے ساتھ بتدریج سختی کی جائے اور اگر پھر بھی باز نہ آئے تو برملا تادیب کی جائے۔ اس کے بعد بھی اگر بے عنوانی سرزد ہو تو ہلکی جسمانی سزا دی جائے اور اگر استاد اس طرح بھی اسے درست نہ کر سکے تو پھر ہمارا مشورہ یہ ہے کہ کچھ وقفے کے بعد پھر مندرجہ اصلاحی اقدامات کا اعادہ کیا جائے۔"[2]

۴. اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ تعلیمی اداروں میں پر اعتماد ماحول پیدا کریں اور اپنے رفقائے کار اور تعلیمی انتظامیہ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں۔ قولہ تعالیٰ:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾[3]

ترجمہ: اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں مدد کرو اور برائی اور گناہ کے کاموں میں (ایک دوسرے کی) مدد نہ کرو۔

البتہ آج کل اساتذہ نے اپنے آپ کو صرف ایک مخصوص کورس طلباء تک پہنچانے تک محدود کر رکھا ہے۔ طلباء کی دیگر تعلیمی و معاشرتی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ تعلیمی اداروں سے باہر تو اساتذہ اور طلباء میں کوئی واسطہ نظر نہیں آتا۔ نیز تعلیمی ماحول میں ایک دوسرے کے لیئے حسد اور اعتراضات کی بوچھاڑ نظر آتی ہے، اساتذہ اپنے ہی ساتھ کے رفقا پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ شاگردوں کے سامنے دوسرے اساتذہ کے مضامین اور طریقہ تدریس سے متعلق برائیاں کی جاتی ہیں۔ اساتذہ کا ایک دوسرے کے ساتھ حسد اور تنقید، شاگردوں پر برے اثرات مرتب کرتے ہیں اور ان کے دلوں سے استاد کا عزت و مقام ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اساتذہ کو چاہیئے کہ طلباء کی توجہ زیادہ سے زیادہ علوم کی تحصیل کی طرف مبذول کریں اور تعلیمی اداروں میں پر اعتماد فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

۵. استاد کو اپنے مضمون پر مکمل عبور ہونا چاہیئے، موضوع سے متعلقہ تمام تر معلومات کو احسن طریقے سے پہنچانے کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے برعکس استاد محض خلاصے پر اکتفا کرے یا گائیڈوں وغیرہ کا استعمال کرے اور پیریڈ کا زیادہ وقت گپ شپ لگا کر پورا کرے تو اس طرح طلباء کی حق تلفی ہو گی اور تعلیمی و اخلاقی لحاظ سے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

---

(۱) تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، احمد شبلی نعمانی، مترجم (محمد حسین خان زبیری)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۲۰۹

(۲) تہذیب الاخلاق، ص ۲۰

(۳) سورۃ المائدہ:۵/۲

خلاصہ کلام یہ ہے کہ موجودہ دور کہ تمام تر اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ اس قسم کے منفی رویات سے اجتناب کریں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے طلباء کی تعلیمی واخلاقی نشوونما میں مثبت کردار ادا کریں۔ طلباء کو اسلامی نظریہ حیات سے آگاہ کریں اور اسلامی نظام تعلیم اور اخلاقی قدروں کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ آج کے دور میں جنگیں میدان جنگ میں کم اور فکری محاذ پر یہ معرکے زیادہ سرگرم نظر آتے ہیں۔ مسلم ممالک جسمانی طور پر آزاد ہونے کے باوجود ذہنی وفکری لحاظ سے برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے تسلط سے آزاد نہ ہوسکے۔ اس صورت حال میں استاد ہی صرف طلباء کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ کرپشن، بدعنوانی اور اخلاقی تنزلی کے خاتمے کے لیئے استاد کو نئی نسل کو ان کو نظریاتی اساس سے جوڑنا ہوگا اور ان کے مغربی افکار کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اسلامی نظریہ حیات پر مبنی تعلیم وتربیت پانے والے طلباء ہی ملکی قیادت کو سنبھال کر معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کرسکتے ہیں اور قوم کو اخلاقی تنزلی سے نکال سکتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا:

ذرائع ابلاغ کے ذریعے معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بڑا فریضہ ادا کیا جاسکتا ہے اور زبردست فلاحی اور اصلاحی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ مگر عصر حاضر میں الیکٹرانک میڈیا مغربی تہذیب کو معاشرے میں تیزی سے فروغ دے رہا ہے۔ اسلامی قدروں کو پامال کیئے ہوئے ہے۔ اس نے سماجی رویوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ پہلے وقت میں لوگ پورے دن کے کاموں سے فارغ ہوکر شام کو مل جل کر بیٹھتے اور اپنا اپنا حال سناتے تھے اور دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے تھے جس سے آپس میں محبت والفت بڑھتی تھی۔ جب کہ آج کل لوگ فارغ اوقات میں ٹی وی پر ڈش یا کیبل پر آنے والے چینلز سے رات دیر تک لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ صبح پھر دیر سے بیدار ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے نماز بھی رہ جاتی اور صبح سویرے تازہ دم کاموں کی ابتدا بھی نہیں کی جاسکتی۔ اسطرح دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے مسلمانوں کے لیئے سخت نقصان دہ ہے۔

الیکٹرانک میڈیا پر ایک طرف تو ٹی وی، وی سی آر اور انٹرنیٹ پر دکھائی جانے والی فحش فلمیں، ماڈلنگ، شوبز، عریانی اور کارٹون وغیرہ نسل نو کی اخلاقی اور دیگر برائیوں کا سبب ہیں۔ دوسری طرف میڈیا کے ذریعے مسلمانوں میں غلط خبریں پھیلا کر افتراق وانتشار برپا کیا جارہا ہے۔ مسلم امت باہمی تنازعات اور فتنہ وفساد کا شکار ہے۔ فحش گانے، غیر اخلاقی ڈرامے، ڈائیلاگ اور خاکے نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کررہے ہیں۔ بے حیائی کے وہ مناظر جو کسی وقت میں صرف مغربی ممالک میں ہی دیکھے جاتے تھے، اب انٹرنیٹ کے ذریعے ان کی رسائی ہر شخص تک ممکن ہے۔ جس کی وجہ سے مسلم ممالک میں فحاشی کا سیلاب آرہا ہے۔ جیسا کہ انسانی زندگی کا ابتدائے بلوغت کا زمانہ انتہائی نازک ہوتا ہے۔ ایسی عمر میں عریانیت پر مبنی فلمیں اور ڈرامے لگاتار دیکھنا انسانی جذبات کو ابھارتا ہے اور بالآخر بدکاری اور دیگر جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ مسلمان اسلامی تہذیب کو بھلا کر غیر ملکی

تہوار ویلنٹائن ڈے،ہیپی نیو ایئر ، جشن بہاراں اور بسنت وغیرہ منانے میں مصروف ہیں۔ دلفریب اشتہاروں کے ذریعے نوجوانوں کو پہننے، اوڑھنے اور کھانے پینے کے نت نئے طریقے سکھائے جاتے ہیں، جن کا اسلامی اصول وضوابط سے کوئی واسطہ نہیں۔

انٹرنیٹ اور ٹی وی پر دکھائے گئے پروگراموں کا سب سے زیادہ نقصان بچوں کا ہوتا ہے وہ ان کے اتنے رسیا ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے اور دیگر سرگرمیوں کی طرف ان کی توجہ نہیں رہتی اور پھر ان کی اس عادت کو چھوڑوانا والدین کے لیئے مشکل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے نتیجہ میں چیر چڑاپن، دوسروں کے ساتھ بدتمیزی اور بڑوں کو جواب دینا جیسی بداخلاقیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ کارٹونوں وغیرہ کے زیادہ تر پروگراموں میں مغربی کلچر جھلکتا ہے جو کہ بچوں کو بچپن ہی سے مغرب کا دلدادہ اور اسلامی تہذیب سے دور کر دیتا ہے۔ ان بچوں کو اداکاری کرنے ناچنے اور گانے سننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ڈش اور کیبل کے ذریعے بھارتی اور غیر ملکی پروگرام براہ راست گھر بیٹھے دیکھے جاسکتے ہیں، جس نے شرم وغیرت اور شرافت کا جنازہ نکال دیا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ بولنے، اوڑھنے اور رسوم ورواج میں بھارتی ثقافت نے کافی حد تک پاکستان میں فتح حاصل کر لی ہے۔

زنانہ تعلیمی اداروں میں این جی اوز اور کمرشل لوگوں کی آمادگی بڑھتی جارہی ہے۔ میک اپ کی اشیاء اور بالغانہ صحت سے متعلق ادویات کی فروحت کے لیئے کہیں گروپ انتظامیہ کی سرپرستی میں داخل ہوتے ہیں۔ بالغانہ صحت سے متعلق بغیر کسی پردے اور حیا کے خواتین کو لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ آزادی نسواں کے نام پر فحاشی اور بے پردگی کو عام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تعلیمی اداروں میں کلچرل شو اور میوزک پروگرام کے انعقاد کے لیئے فلمسٹار اور گلوکار کو معزز مہمانوں کے طور پر مدعو کیا جاتا ہے اور ان کی خوب پذیرائی کی جاتی ہے[1]۔

میڈیا کی وجہ سے ملک کی ۹۸ فی صد آبادی تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ نسل نو دینی تعلیم سے عاری، اور سٹیٹس بنانے میں مشغول ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان بے روزگار ہیں اور میڈیا کے آگے روزانہ اکثر وقت بے مقصد گزار کر زندگی کا قیمتی حصہ ضائع کر رہے ہیں۔ بچے جن کو بچپن ہی سے ایسے مناظر دیکھنا کا عادی کر دیا جاتا ہے وہ بڑے ہو کر کیوں نہ فحاشی کے دلدادہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج نسل نو فلسطین، کشمیر اور افغانستان میں اپنے مسلمان بہن بھائیوں پر کیئے جانے والے ظلم وستم اور درد کو سمجھنے کی بجائے عیش پرستی میں مبتلا ہے۔ مسلمان الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کی گئی یہودیوں کی سازشوں کا ادراک نہیں کر پارہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر معلمین اور رہنماؤں کو چاہیئے کہ وہ دو یا تین ایسے چینلز کو خریدیں جن میں اسلامی تعلیم اور اخلاقی قدروں کو دلکش انداز میں پیش کیا جاسکے تاکہ وہ عوام الناس کے لیئے جاذب النظر ہوں۔ اسلامی تعلیمات پر

---

(۱) استاد ملت کا محافظ، ثریا بتول علوی، تنظیم اساتذہ پاکستان (خواتین)، المکتبہ الرحمانیہ، جے ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۲۴

مبنی ایسا ٹھوس لٹریچر تیار کرنا بھی ضروری ہے کہ جس کو انٹرنیٹ پر بھی پیش کیا جاسکے۔ نیز ان چیلنز کے ذریعے اسلام کے خلاف کیئے جانے والے پراپگینڈے اور سازشوں کا بھی ساتھ ساتھ جواب دیا جاتا رہے تاکہ دشمنان اسلام کی سازشیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں۔

اسلام فنون لطیفہ اور تفریح کے خلاف نہیں بشرطیکہ یہ کہ وہ اسلامی اصول واقدار کے مخالف نہ ہوں۔ والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی خداداد صلاحیتوں کو تعمیری اور تفریحی پروگراموں میں زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کریں جو کہ ان کی ذہنی وجسمانی نشوونما کے لیئے ضروری ہے نیز انہیں ٹی وی اور انٹرنیٹ کو بغیر کسی اصلاحی مقصد کے دیکھنے سے پرہیز کرنے کی ترغیب دیں تاکہ ان کے عادات واخلاقیات پر برا اثر نہ پڑے اور وہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتی پالیسیوں کے ذریعے میڈیا کو اسلامی حدود کے دائرے میں لانا بھی ضروری ہے تاکہ معاشرے سے جرائم کا انسداد ہو اور میڈیا کو اصلاحی کاموں کے لیئے استعمال میں لایا جاسکے۔

والدین کی غفلت:

بچوں کی اچھی تربیت کرنا والدین کا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ اولاد کی اصلاح وتربیت شرعی فرائض میں سے ہے اور فرض کو ترک کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ قولہ تعالی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾[1]

ترجمہ: اے اہل ایمان بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے۔

اللہ کی خوشنودی کے حصول، اپنے فریضے کی انجام دہی اور یوم آخرت سزا سے بچنے کے لیئے والدین کو چاہیئے کہ وہ بچوں کی دینی ،ایمانی، اخلاقی، جسمانی اور عسکری غرض یہ کہ ہر طرح سے تربیت کا خیال کریں تاکہ بہتر نسل وجود میں آئے۔ بچہ فطرتاً توحید اور ایمان باللہ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس میں فطری طور پر برائیوں سے دوری اور طہارت وپاکیزگی پائی جاتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ ، وَيُنَصِّرَانِهِ ، وَيُمَجِّسَانِهِ))[2]

ترجمہ: ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین یا اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ التحریم:۶۶/۶

(۲) الجامع الصحیح، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی أولاد المشرکین، حدیث نمبر:۱۳۸۵، ۲/۱۰۰

آپ ﷺ کی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بچہ فطری طور پر پاکیزہ دل اور نفیس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔پیدائش کے بعد وہ والدین کے پاس امانت ہوتا ہے یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اگر وہ اسے علم وادب سکھاتے، دینی واخلاقی تربیت دیتے اور خیر کا عادی بناتے ہیں تو وہ دنیا وآخرت دونوں میں خوش نصیب رہتا ہے اور اگر والدین اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کرتے ہوئے اسے جانوروں کی طرح مہمل چھوڑ دیتے ہیں اور وہ برے کاموں کا عادی بن جاتا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔والدین کے لیئے ضروری ہے کہ وہ شروع ہی سے بچوں کی ایمانی تربیت کریں اور تعلیمات اسلام کی بنیادوں سے منسلک کریں تاکہ وہ دین اسلام ہی کو حقیقی اور صحیح مذہب تسلیم کرے۔ آپ ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ تربیت ایمانی کے لیئے سب سے پہلے نومولود بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنی چاہیئے۔ تاکہ سب سے پہلے وہ جن کلمات کو سمجھے اور سیکھے وہ یہی کلمہ توحید ہو۔ پھر جب بچوں میں عقل وشعور آنے لگے تو انہیں حلال وحرام کے احکامات سکھائے جائیں تاکہ شروع ہی سے اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کی بجاآوری کرنے اور جن سے روکا ہے ان سے بچے رہنے کی مشق کریں اور عادی ہو جائیں۔اسطرح وہ اسلام ہی کو درست منہج سمجھتے ہوئے بڑھتا چلے جائیں گے اور یہی ان کے لیئے حقیقی لائحہ عمل ہو گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مروا الصبيان بالصلاة لسبع سنين و اضربوهم عليها في عشر سنين و فرقوا بينهم في المضاجع))[1]

ترجمہ: اپنی اولاد کو سات سال کا ہونے پر نماز کا حکم کرو اور نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو۔جب وہ دس سال کے ہو جائیں ان کے بچھونے الگ الگ کر دو۔

ان احکامات میں حکمت یہ ہے کہ بچہ نو عمر ہی سے اللہ کی اطاعت کرنے والا اور اس کے حکم پر گردن جھکانے والا عادی بن جائے اور ان عبادات سے روح کی پاکیزگی، جسمانی تندرستی اور اپنے اقوال اور اعمال کی اصلاح معلوم ہونے لگ جائے۔ یہ تربیت اولاد کا وہ منہج ہے جو اللہ اور س کے رسول ﷺ کا بتایا ہوا ہے اور اسی میں والدین اور اولاد دونوں کے لیئے دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں کامیابی ہے۔

عصر حاضر میں دیکھا جائے تو والدین تربیت سے زیادہ سٹیٹس بنانے کی تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں۔ان کے نزدیک اولاد کی تربیت کا معیار کچھ اور ہے۔ایک طرف امیر طبقہ ہے جو اولاد کو زندگی کی ہر آسائش اور سہولتیں میسر کرتے ہیں مگر وقت اور توجہ نہیں دیتے۔والد اکثر بیرونی دوروں پر رہتے ہیں اور والدہ سوشل سرگرمیوں اور میٹنگوں میں مصروف رہتی ہیں۔اولاد کو آیائیں پالتی ہیں اور ڈرائیور بچوں کو سکول لے کے جانے اور واپس لانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ایسے والدین

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین، کتاب الصلاۃ، باب فی مواقیت الصلاۃ، حدیث نمبر:۷۰۸، ۱/۳۱۱

سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بچوں کی ٹھاٹھ اور شان وشوکت سے پرورش کر کے حق ادا کر دیا۔ جب کے یہ بچے اخلاق وآداب سے عاری اور اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق وفرائض سے بالکل غافل ہوتے ہیں۔ بڑھاپے میں والدین کا سہارا بننے کی بجائے انہیں اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ آتے ہیں۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو غربت میں مبتلا ہے۔ والدین غریب ہیں یا چھوٹی سی ملازمت کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی بنیادی ضروریات پورا کرنے میں پھنسے رہتے ہیں۔ جیسا کہ دووقت کی روٹی میسر آجائے، تن کپڑوں سے ڈھانپا جائے اور سرکاری سکول میں تعلیم حاصل کروادی جائے۔ اس سے آگے بچوں کی تربیت کے بارے میں سوچنے کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا اور نہ توجہ ہوتی ہے۔ مالی پریشانیوں سے نکلیں تو بچوں کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچیں۔

والدین چاہے امیر ہوں یا غریب انہیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ بچوں کی صرف مادی ضروریات پوری کرنے سے حق ادا نہیں ہو جاتا بلکہ ان کی بہتر تعلیمی واخلاقی تربیت کرنا بنیادی فریضہ ہے۔ والدین کو اپنے تمام تر کاموں پر اس فریضے کو فوقیت دینی چاہیئے۔ نیک اولاد ہی والدین کے لیئے سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ جو والدین بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرتے وہ دنیا میں بھی پچھتاتے اور آخرت میں میں بھی سزا کے مستحق ہوں گے۔ ہر مربی اور استاد کا بھی فرض ہے کہ اگر وہ والدین کی غفلت کی بناء پر بچوں میں بگاڑ دیکھیں تو ان سے رابطہ کریں اور انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس دلائیں۔ والدین کو اپنے تربیت کے معیار کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ محض مادی ضروریات کی تکمیل اور جھوٹی شان وشوکت بنانے کے چکر میں اولاد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ انہیں وقت اور توجہ دینی چاہیئے اور تعلیمات اسلام کی روشنی میں تربیت اولاد کا درست لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

اسلامی نظام تعلیم وتربیت کا فقدان:

دین اسلام دنیا کی زندگی کو اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق گزارنے کا نام ہے۔ انسان کی زندگی کا بنیادی عنصر ایک دوسرے کے ساتھ باہم تعلقات ہیں۔ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ دین اسلام ان تعلقات کو تعمیری انداز میں نبھانے اور خوشگوار بنانے کے لیئے اخلاق وآداب سکھاتا ہے۔ ایک دوسرے سے کے حقوق وفرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ معاشرے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اخلاق کے اعلی اصولوں کی آبیاری ہو تو پرامن معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم وتربیت سے مستحکم اور یکسو مسلم شخصیت وجود میں آتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم سے ہی نفس انسانی کی ایسی تربیت ممکن ہے کہ جس سے پھر انسان کے لیئے اللہ کے احکامات کی پیروی مرغوب اور آسان ہو جائے۔

عصر حاضر میں دیکھا جائے تو اسلامی نظام تعلیم وتربیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ لوگ دین اسلام کو محض بچوں کو قرآن کا ناظرہ پڑھوا دینا، موجودہ تعلیم کے ساتھ دینیات کا مضمون منسلک کر دینا، اسمبلی میں کچھ اچھی اچھی باتیں بتا دینا اور نماز، روزہ

ادا کر دینے کی حد تک سمجھتے ہیں۔ جب کہ اسلام کا تصور حیات بہت وسیع ہے۔ دنیا کا کوئی بھی کام اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیئے کیا جائے اور وہ اسلامی اصول وضوابط سے مطابقت رکھتا ہو تو عبادت ہے، پھر چاہے اس کا تعلق تعلیم سے ہو، معیشت سے ہو یا معاشرت سے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آج دین اور دنیا کو الگ کر دیا گیا ہے۔ جہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے وہاں دنیا کے مسائل اور امور سے لاتعلقی ہے اور جہاں دنیاوی تعلیم دی جاتی ہے ان کی دینی واخلاقی حالت نا گفتہ بہ ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کہتے ہیں:

> "اسلامی نظام تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر شعبہء زندگی میں اسلام کے دیئے ہوئے اقدار کی روشنی میں سوچنے اور ان بنیادوں پر فکر انسانی کی تشکیل جدید کرنے کا کام انجام دیں۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ ہم جدید معاشیات کو جانیں۔ ایڈم سمتھ سے لے کر ہیرلڈ اور فیلڈ مین تک جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے ہم واقفیت پیدا کریں لیکن صرف واقفیت ہی پیدا نہ کریں بلکہ اس کا ہم تنقیدی جائزہ لیں اور یہ نہ سمجھیں کہ جو کچھ وہاں سے آتا ہے وہ حق ہی ہے بلکہ ہم قرآن اور حدیث کی دی ہوئی اقدار کی روشنی میں اس کو پرکھیں کہ اس میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے اور پھر معاشی فکر کو اسلام کی بنیادوں پر مرتب ومدون کریں اور اس کی روشنی میں اپنے معاشی مسائل اور انسانیت کے معاشی مسائل کا حل تلاش کریں"[1]۔

گویا اسلامی نظام تعلیم کی رو سے جس بھی دائرہ علم میں ہوں، انسان کا انداز فکر وسوچ اسلامی اقدار سے مطابقت رکھتا ہو اور اس میں اسلامی فکر کو جاری وساری کیا جائے۔ بلاشبہ اس کے لیئے ہم سائنس بھی پڑھیں، سیاسیات بھی پڑھیں اور دیگر تمام تر علوم جو اللہ سبحانہ تعالی کی بندگی اور انسانیت کی خدمت کے لیئے ہیں۔ مگر افسوس آج لادینی تمدن ان کا علمبردار بنا ہوا ہے اور دین کا دنیاوی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے جب پاکستان مجبوراً چھوڑا تو اقتدار اپنے ہی تربیت یافتہ اور وفادار سیاستدان اور جاگیرداروں کے سپرد کیا۔ جو محض نام کے مسلمان تھے اور انہوں نے پاکستان میں نفاذ اسلام کی مزاحمت کی۔ مگر عوام الناس کے جذبہ ایمانی اور دباؤ کی بناء پر چند سطحی تبدیلیاں کیں، جن سے عملی طور پر معاشرے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ اسطرح پاکستان کا نظام تعلیم اجتماع ضدین پر منحصر ہے۔ اس کے حقیقی مقاصد اور تنظیمی ڈھانچہ مغربی فکر وتہذیب پر مشتمل ہیں، البتہ اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور عربی کو بھی اسلام کی نمائندگی کے لیئے برائے نام جوڑ دیا گیا ہے[2]۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج طلباء تعلیمی اداروں میں فکر وعمل کے اس تضاد کی بناء پر اسلامی تربیت سے محروم ہیں۔ تعلیم

---

(۱) نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید (تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)، ص:۴۰

(۲) ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل، محمد امین، دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۱۶۶-۱۶۷

یافتہ ہونے کے باوجود ایک مضبوط مسلم شخصیت پروان نہیں چڑھتی اور عملاً انسان کے کردار میں اخلاقی ومعاشرتی اقدار کا کوئی لحاظ نظر نہیں آتا۔

بری صحبت:

انسان کی صحبت اس پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے اور انسان اپنی صحبت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اگر اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت میں رہے گا تو اچھائی کی طرف چلے گا اور اگر برے لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا تو برے اثرات مرتب ہوں گے۔ اسی لیئے اللہ تعالی نے اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا۔ قولہ تعالی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾[1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

وقولہ تعالی:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا يَا وَيْلَتَى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا﴾[2]

ترجمہ: اور اس دن ظالم شخص اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا ہائے کاش کہ میں نے رسول اللہ کی راہ اختیار کی ہوتی ہائے افسوس کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ صالحین کی صحبت میں رہنا کا حکم دیا اور اللہ کے نافرمانوں اور گناہگاروں سے وابستگی رکھنے سے منع فرمایا کیونکہ انسان کی گمراہی اور بداخلاقیوں کا سبب صحبت بد اختیار کرنا ہی ہوتا ہے۔ برے لوگوں سے تعلق داری انسان کو تباہی وہلاکت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ))[3]

ترجمہ: آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے لہذا ہر انسان کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی لگا رہا ہے۔

اچھی صحبت سے انسان اچھا اور بری صحبت سے انسان برا بنتا ہے والدین اور اساتذہ کو اس بات پر خصوصی نظر رکھنی چاہیئے کہ بچے کن بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور پڑھتے لکھتے ہیں۔ اگر ان کی دوستی ایسے بچوں کے ساتھ ہے جو گالیاں دیتے ہیں، چوری

---

(۱) سورۃ التوبہ: ۹/ ۱۱۹

(۲) سورۃ الفرقان: ۲۵/ ۲۷-۲۸

(۳) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب من یؤمر أن یجالس، حدیث نمبر: ۴۸۳۳، ۴/ ۲۵۹

کرتے ہیں، پڑھائی سے جی چاتے ہیں اور سیگریٹ پیتے ہیں تو بچہ ان کے ساتھ رہ کر انہیں کی عادتیں سیکھے گا۔ والدین کو بچوں کی دوستی یاری پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے تاکہ وہ اچھے بچوں کی صحبت میں رہ کر اچھی عادات وخصائل اور اخلاقیات کو اپنائیں۔ آپ ﷺ نے صحبت کے اثرات کی مثال بہت خوبصورت انداز میں دی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إنما مثل جليس الصالح و جليس السوء كحامل المسك و نافخ الكير حامل المسك إما أن يحذيك و إما أن تبتاع منه و إما أن تجد منه ريحا طيبة و نافخ الكير إما أن يحرق ثيابك و إما أن تجد منه ريحا خبيثة))[1]

ترجمہ: اچھے اور برے شخص کی صحبت کی مثال عطر فروش اور لوہار کی سی ہے۔ اگر تم عطر فروش کے پاس جاؤ گے تو یا تو اس سے کچھ عطر خریدو گے اور اگر نہ بھی خریدا تو عطر کی خوشبو سے لازمی لطف اندوز ہو گے اور اگر تم لوہار کے پاس جاؤ گے اور وہ دھونکنی دوہ رہا ہو تو خدشہ ہے کہ آگ کے چنگارے اڑ کر تم پر گریں اور تمھارے کپڑے جل جائیں اور اگر یہ بھی نہ ہو تو دھوئیں اور بدبو سے تمھارا پالا پڑے گا ہی۔

اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ بچوں کی دوستی ان کے ہم جنس بچوں کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ اگر اپنے سے بڑے دوست بنائے گا تو ممکن ہے کہ بے راہ روی کا شکار ہو جائیں۔ اسی طرح صحبت اختیار کرتے ہوئے اس بات کا بھی دھیان رکھا جائے کہ بچے انہی کے سماجی رتبے کے ہوں۔ اگر اپنے سے اوپر امیر لوگوں کی مجالس میں بیٹھیں گے تو یا تو احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے یا والدین پر دباؤ ڈال کر جو کچھ دیکھیں گے وہی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں حسد، جھوٹ، غصہ اور دیگر اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہونے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ آج کل کے بچے سمجھتے ہیں کہ وہ ہوشیار ہیں اور اپنا اچھا برا سمجھتے ہیں، برے لوگوں کی صحبت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ جبکہ یہی سوچ ان کے لیئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور برے لوگوں کی دوستی انہیں مادی اور اخلاقی لحاظ سے کہیں نہ کہیں نقصان ضرور پہنچا رہی ہوتی ہے۔ اس لیئے بری صحبت سے ہمیشہ بچنا چاہیئے اور اس سلسلے میں والدین اور اساتذہ کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہی انہیں صحیح اور غلط کی پہچان کرا سکتے ہیں۔

والدین کے باہمی اختلافات:

بچوں کی صحیح پرورش کے لیئے مضبوط بنیادوں پر خاندانی نظام کا استحکام بہت ضروری ہے۔ خاندانی نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت والفت، خوشگوار دینی ماحول اور حقوق وفرائض کا لحاظ رکھا جائے تو ایسے خاندان میں پرورش پانے والے بچے بااخلاق، ذہنی اطمنانیت اور پر اعتماد ہوتے ہیں۔ البتہ اگر ایسے گھرانہ ہو جہاں میاں بیوی کی باہم ذہنی و قلبی ہم آہنگی نہ ہونے کی بناء پر روزمرہ لڑائی جھگڑے، ایک دوسرے کو گالی گلوچ کرنا اور مار کٹائی ہو تو ایسے ماحول میں پلنے والے بچے گھر

---

(۱) شعب الایمان، أبو بکر أحمد بن الحسین، البیھقی، دار لکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۰ھ، باب الدعا الی السلام، حدیث نمبر: ۹۴۳۵، ۷/ ۵۴

سے بے زار ہوتے ہیں، جان چھڑاتے ہیں اور بیشتر نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کا زیادہ تر رجحان باہر کی دنیا میں ہوتا ہے۔ گھر میں محض سونے کے لیئے آتے ہیں۔ باہر کی دنیا میں اگر وہ غلط لوگوں کے ہاتھوں چڑھ جائیں تو ان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ اسطرح گھر کا دلبر داشتہ ماحول ان کی انفرادی واجتماعی خرابیوں کا سبب بنتا ہے۔

اسلام کے نزدیک معاشرتی فلاح و بہبود کا انحصار رشتہ ازواج کی کامیابی پر ہے۔ دین اسلام نے اس سلسلے میں لڑکے اور لڑکی کے انتخاب کے لیئے تفصیلا رہنمائی کی۔ شادی کے لیئے دونوں کی انفرادی رضامندی کا ہونا ضروری ہے نیز علم واخلاق ،خاندان برادری اور مالی حالات وغیرہ میں یکسانیت ہونا ضروری ہے۔ تاکہ میاں بیوی ذہنی اور قلبی ملاپ سے خوشگوار زندگی بسر کر سکیں۔ آج ہم رشتہ ازدواج تہ کرتے وقت قرآن وسنت کی ان تعلیمات کو فراموش کر دیتے ہیں جو بعد میں والدین میں ناچاقیوں اور لڑائی جھگڑوں کا سبب بنتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں بھی طلاق کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔ میاں بیوی کے اختلافات اور ناچاقیاں بالآخر طلاق تک پہنچ جاتے ہیں جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا أَحَلَّ اللَّهُ شَيْئًا أَبْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ))[1]

ترجمہ: طلاق اللہ تعالی کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔

میاں بیوی کے رشتہ ازدواج کا ٹوٹنا اولاد پر برے اثرات ڈالتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کے ایک بچے کے لیئے ماں اور باپ دونوں کا ساتھ ضروری ہے۔ جہاں وہ ماں کی محبت والفت کا طلب گار ہوتا ہے وہاں اس کے لیئے باپ کی شفقت، رہنمائی اور نگرانی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ طلاق کی صورت میں اگر اولاد باپ کے پاس جاتی ہے تو باپ بچوں کی مالی ضرویات کو پورا کرنے کے لیئے معاشی معاملات میں اس قدر پھنسا ہوتا ہے کہ وہ بچوں کو وقت نہیں دے پاتا اور بچے محرومیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ باپ کبھی بھی ماں کی جگہ نہیں لے سکتا اور اگر وہ دوسری شادی کرتا ہے تو بھی سوتیلی ماں حقیقی ماں کی طرح پیار نہیں دے سکتی جس کی بناء پر بچے احساس کمتری اور نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دوسری طرف باپ کے نہ ہونے کی صورت میں ماں اگر معاشی ذمہ داریوں کو اٹھاتی ہے تو وہ بچوں کو توجہ اور وقت نہیں دے پاتی۔ بچوں کی ہمہ وقت نگرانی بھی نہیں کر سکتی جس کی وجہ سے بچوں کے آوارہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اور اگر معاشی طور پر خوشحالی ہو بھی تو ماں باپ کی کمی پوری کرنے کے لیئے بہت زیادہ لاڈ پیار اور ناز اٹھاتی ہے جس سے بھی بچے بگڑتے ہیں۔ لہذا دونوں صورتوں میں دیکھا جائے تو ماں باپ کی آپس کی ناچاقیاں بچے کی شخصیت کو مجروح کرتی ہیں۔ اس لیئے بچوں کی بہتر تربیت کے لیئے خاندانی نظام کا استحکام بہت ضروری ہے تاکہ گھر میں بچوں کو خوشگوار ماحول میسر ہو اور وہ ان کے لیئے جنت ہو۔

---

(۱) سنن أبي داود، کتاب الطلاق، باب في کراھیۃ الطلاق، حدیث نمبر: ۲۱۷۷، ۲/ ۲۵۴

غیر موزوں رسالے اور کتابیں:

بچوں کی شخصیت کو سنوارنے میں کتابوں، رسالوں اور اخبارات وغیرہ کی تدریس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ عمر کے لحاظ سے کتابوں کے انتخابات اور دلچسپیوں میں بدلاؤ آتا رہتا ہے۔ بچپن کے دور میں بچے کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں اور جوانی کی عمر میں رسالوں اور ناول کی طرف رجحان ہوتا جاتا ہے۔ اگر والدین اور اساتذہ بچوں کے تعلیمی رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے درست تدریسی مواد مہیا کرتے رہیں تو بچے تعمیری راستوں پر گامزن ہوتے ہیں۔ البتہ دوسری جانب بازاروں اور لائبریریوں میں ایسی کتابیں بھی میسر ہوتی ہیں جو نسل نو کی اخلاقی تنزلی کا سبب ہوتی ہیں۔ جیسا کہ نوجوانوں کے لیئے عشق و محبت پر مبنی بہت سے ایسے ناول بھی بازاروں میں پائے جاتے ہیں جو ان کے جذبات کو ابھارتے اور بے حیائی اور برائی کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ ان ناول کی نوجوانوں کو ایسی لت پڑتی ہے کہ وہ تمام تر تعلیمی اور معاشرتی سرگرمیوں سے ہٹ کر اپنا قیمتی وقت انہیں پڑھنے میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ نوجوانوں کو زندگی کی حقیقتوں سے دور لے جاتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کو اس بات کا بہت دھیان رکھنا چاہیئے کہ بچے کس طرح کی تدریس کر رہے ہیں۔ انہیں سکولوں کے ساتھ ساتھ گھروں میں بھی لائبریریوں کا انعقاد کرنا چاہیئے اور بچوں کی عمر اور میلانات ور جحانات کے مطابق بہترین تدریسی مواد مہیا کرنا چاہیئے تاکہ بچے اپنا فارغ وقت ضائع نہ کریں اور اپنے کردار کو اعلی اخلاقی قدروں سے مزین کریں۔

عصر حاضر کے نوجوانوں میں اخلاقی تنزلی کے ان اسباب کو دور کرنے کے لیئے اساتذہ اور والدین کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔ نوجوانوں کی اخلاقی وروحانی تربیت میں ہی معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ مسلمان اپنے بلند و بالا اخلاقیات سے ہی دنیا میں عزت و مقام حاصل کر سکتے ہیں اور دین اسلام کو پھیلا سکتے ہیں۔

فصل چہارم

مروجہ نظام تعلیم کے مسائل اور اخلاقیات

فصل چہارم:

مروجہ نظام تعلیم کے مسائل اور اخلاقیات

کسی بھی ملک کے نظام تعلیم کا مقصد معاشرے کے طے کردہ اصول واقدار اور نظریہ حیات کے مطابق افراد کی تعلیم وتربیت کرنا ہے۔ اگر نظام تعلیم اپنے وضع کردہ مقاصد کو پورا کر رہا ہے تو یہ کامیاب نظام تعلیم ہے اور اگر اس کے ذریعے بڑی حد تک مقاصد پورے نہیں ہو رہے تو یہ بحران کا شکار ہے۔ اب اگر پاکستان کا نظام تعلیم دیکھا جائے تو اس ملک میں رہنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور اپنے ملک میں بسنے والے افراد کی تربیت اسلامی اصول وضوابط اور اخلاقی قدروں کے تحت کرنا چاہتا ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی اخلاقی اقدار کی تکمیل اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنا تھا۔ جبکہ موجودہ دور میں اس کا شمار کرپٹ ترین معاشروں میں ہوتا ہے، افراد معاشرہ بداخلاقیوں اور برائیوں کا شکار ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دور حاضر کا نظام تعلیم اپنے تعلیمی مقاصد پورے کرنے میں ناکام ہے اور اسے اساسی تبدیلیوں اور اصلاح کی ضرورت ہے۔

تازہ ترین سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ہمارے ہاں شرح خواندگی ۵۸ فیصد ہے۔ قومی آمدنی کا صرف ۲.۳ فیصد تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ۱۴ کروڑ افراد کے لیئے پبلک سیکٹر میں صرف ۲۷ یونیورسٹیاں ہیں[1]۔ تعلیمی معیار کی حالت یہ ہے کہ ہماری اعلی سطح کی ڈگریوں کو بیرون ممالک میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور وہ انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ بی اے پاس نوجوان صحیح سے درخواست تک نہیں لکھ سکتے، اعلی ڈگریوں کے حصول کے باوجود ہم علوم وفنون میں مہارت نہیں حاصل کر پا رہے۔ ملک کے افراد تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تہذیب وآداب سے ناآشنا ہیں۔ پڑھے لکھے اور جاہل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

پاکستان کے نظام تعلیم سے نہ تو صحیح معنوں میں افراد کی سیرت وکردار کی تشکیل کا انتظام کیا جارہا ہے اور نہ ہی قومی اور ریاستی تقاضوں کے مطابق تعلیم دی جارہی ہے۔ تعلیمی نظام بہت سے مسائل کا شکار ہے۔ نظریاتی افکار اور اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالا جارہا ہے۔ تعلیمی نظام میں پائے جانے والے چند مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سیکولر نظام تعلیم

عصر حاضر کے نظام تعلیم پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا فتنہ سیکولرزم ہے۔ جس کے نزدیک مذہب ایک پرائیویٹ اور انفرادی مسئلہ ہے۔ اس کو اجتماعی اور قومی معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ بلکہ انسان اپنی اجتماعی زندگی

1- www.finance.gov.pk (Pakistan economic survey-Education 2016-17)

میں آزاد ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ جدیدیت اور لبرلزم سے کام لے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حکمران بھی لادینیت اور سیکولرزم کی اطاعت کرتے ہوئے پردے، داڑھی اور اسلامی حدود و قوانین کے خلاف مضحکہ خیز بیان دیئے جارہے ہیں۔ میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے مسلمانوں کو بے حیائی اور برائی کی طرف راغب کیا جارہا ہے۔ یہ سب سیکولرزم اور لبرلزم کے نام پر ہو رہا ہے۔ جس کا سب سے بڑا علمبردار امریکہ ہے جو مسلم امت کو تو سیکولرزم کی تلقین کرتا ہے جبکہ خود وہاں کی قیادت کٹر مذہبی ہوتی جارہی ہے۔ وہاں کے زیادہ تر لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیئے انہیں مذہبی اداروں میں بھیج رہے ہیں۔ دوسری جانب امریکہ پاکستان کے نصاب تعلیم سے اسلام کو نکلوانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے دلوں سے دین اسلام کا اکرام و اہمیت ختم کرنا ہے۔ یہاں تک کہ پھر اسلام کو ان کی عملی زندگی میں کوئی عمل دخل نہ رہے۔ وہ ایسے سطحی مسلمان ہوں جو نماز روزہ تو کریں مگر دیگر اجتماعی معاملات میں مذہب کا نام تک نہ لیں۔ لبرلزم کی رو سے مذہب، معاشرتی ضابطے اور اخلاق کو انسان کی آزادی میں رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیئے نظام تعلیم میں کسی مخصوص مذہب اور ضابطہ اخلاق کی تعلیم نہیں دی جانی چاہیئے بلکہ انسان کو آزادی ہے کہ وہ اپنے لیئے کوئی بھی ضابطہ اخلاق وضع کر سکتا ہے اور مذہبی عقیدہ رکھنے میں غیر جانبدار رہے اور اس بارے میں اپنا نقطہ نظر خود وضع کرنے میں کوئی پابندی نہیں۔

مغرب کے فلسفہ سیکولرزم اور لبرلزم کے تحت انسان کی سیرت و کردار کو تشکیل دینے کے لیئے کسی مذہبی ضابطے کی ضرورت نہیں بلکہ ایک مادی معاشرے کے تحفظ اور بقائے ذات (self-preservation) کے لیئے انسان کو چند میکانکی اخلاقی صفات کا حامل ہونا چاہیئے، جیسا کہ مستقل مزاجی، محنت جرأت، جسارت اور جدد وغیرہ۔ ان اخلاقی صفات کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اچھے انسان کی تشکیل سیرت و کردار نہیں بلکہ اچھے شہری تیار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فلسفہ اخلاق میں کوئی مستقل معیار خیر و شر نہیں ہوتا بلکہ بہتر شہری ہونے کی حیثیت سے چند معاشرتی ضوابط متعین کر لیئے جاتے ہیں[1]۔ آج مسلم امت سیکولرزم کی لپیٹ میں آتے ہوئے، اسلام کے مقصد حیات اور ضابطہ زندگی کو بھولے ہوئے ہے۔ ہر شخص اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی عام ہو چکی ہے۔ انسان ان اخلاقی قدروں کو فراموش کیئے ہوئے ہے جس میں پورے معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ لبرلزم نے انسان کی سوچ کو ذاتی تحفظ و بقا اور مفاد تک محدود کر دیا ہے۔

تعلیمی ثنویت

پاکستان کے نظام تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں دینی اور دنیاوی تعلیم کے دو متوازی نظام ہائے تعلیم جو کہ ایک دوسرے کے ضد ہیں بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ ایک طرف پرائیویٹ دینی مدارس پائے جاتے ہیں جن میں صرف دینی

---

(۱) تعلیم و تدریس، ص: ۱۴۴-۱۴۵

علوم پڑھائے جاتے ہیں اور علوم معاصر کا کوئی ذکر نہیں ملتا جن کی ریاست اور معاشرے کو ضرورت ہے۔ان مدارس میں پڑھنے والے طلباء کی دینی علوم میں بھی تدریس کی یہ نوعیت ہے کہ سال لہاسال پڑھنے کے باوجود اجتہاد اور تفقہ کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، عربی تک وہ بول اور لکھ نہیں سکتے۔ قرآنی تعلیمات کو ان کے تدریسی ڈھانچے میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ان مدارس سے خارج ہونے والے طلباء محدود سوچ کے مالک ہوتے ہیں اور ذریعہ معاش کے لیئے انہیں کوئی خاطر خواہ حیثیت نہیں دی جاتی۔ جس کی بناء پر زیادہ تر بے روزگار رہتے ہیں یا مساجد اور مدارس میں درس وتدریس کے ذریعے بامشکل گزر بسر کرتے ہیں۔ دوسری طرف حکومت کی سرکردگی میں قائم کردہ سینکڑوں سکول،کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جن میں جدید علوم تو پڑھائے جاتے ہیں لیکن دینی علوم کا کوئی معقول انتظام نہیں ملتا۔ان اداروں میں دنیاوی تعلیم اور علوم معاصر ہی پڑھائے جاتے ہیں۔اس قسم کے نظام تعلیم کو مذہب اسلام کا رنگ دینے کے لیئے اسلامیات کے مضمون پر مبنی مختصر سی کتاب نصاب میں شامل کر دی جاتی ہے جو کہ طلباء کی عمر اور دینی تعلم کے لحاظ سے ناکافی ہوتی ہے۔ان دو الگ تھلگ نظام تعلیم سے دنیا کو یہ نظریہ دیا جارہا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ نظام زندگی ہیں ان میں ملاپ نہیں ہو سکتا۔اس بارے میں خورشید احمد کہتے ہیں:

> "یہ اس قوم کی بڑی بد قسمتی ہے جس نے دنیا کو یہ نیا نظریہ دیا کہ دین اور دنیا کہ درمیان کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ جس کے نبی ﷺ نے یہ کہا تھا کہ ساری زمین میرے لیئے مسجد ہے۔ جہاں یہ انقلابی تصور مذہب انسانیت کو دیا گیا کہ محض نماز اور روزہ مذہبی عمل نہیں۔روزی کمانا اگر وہ حلال روزی ہے، مشینیں بنانا، لشکر کشی کرنا، خندقیں کھودنا، ایجادات واختراعات کرنا اگر یہ سب خدا کہ حکم کو ماننے کے احساس کے ساتھ ہو، تو یہ عبادت ہے"[1]۔

جس دین نے یہ انقلابی تصور زندگی دیا ہو، اس کے پیروکار دو متضاد نظام تعلیم پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ان دونوں قسم کے نظام تعلیم میں طلباء کی کردار سازی پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔اسلامی تشخص کو مجروح کیا جارہا ہے۔عصر حاضر میں دین اور دنیا دونوں سے باخبر، متوازن شخصیت کے مالک مسلمان پیدا نہیں ہو رہے۔دینی مدارس میں پڑھنے والے دنیا سے باخبر ہیں اور دنیاوی اداروں میں پڑھنے والے دین اسلام کے مبادیات اور اس کے تقاضوں سے لاعلم ہیں۔جب کہ انہیں نوجوانوں کے ہاتھ معاشرے کا نظم ونسق اور فلاح وبہبود ہے۔

---

(۱) نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید (تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)، ص:۳۷

تعلیم کا معیار (غیر ملکی زبان)

اللہ تعالی نے انسان کو زبان کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور بیان کرنے کی طاقت سے نوازا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾[1]

ترجمہ: اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا

اس آیت میں انسان کی قوت گویائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا عطیہ خداوندی ہے جو انسان کو نباتات اور حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔ کسی بھی قوم کی علمی، ثقافتی اور تہذیبی ترقیات زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ زبان محض اظہار خیال اور ایک دوسرے سے تعلق قائم کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ یہ قوم کے نظریات وافکار، تہذیب وثقافت اور دینی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی امین بھی ہوتی ہے۔ ہر ملک میں جغرافیائی خطوط پر کئی علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر ان تمام زبانوں میں سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر قومی زبان ہوتی ہے۔ پاکستان میں کہنے کو تو مسلمانوں کی قومی زبان اردو ہے اور حقائق زندگی کو اسلامی تناظر میں سمجھنے کے لیئے عربی زبان کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے، اللہ کی کتاب قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل کیا گیا۔ لیکن عصر حاضر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کے لیئے مغربی زبان انگریزی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ معیار تعلیم غیر ملکی زبان انگریزی کو بنایا جارہا ہے۔ پاکستان میں مختلف اقسام کے تعلیمی ادارے پائے جاتے ہیں، کچھ انگلش میڈیم اسکول ہیں اور ان کے متوازی پبلک اسکول بھی ہیں۔ کچھ ادارے گورنمنٹ کی نگرانی میں ہیں اور کچھ پرائیویٹ بھی ہیں۔ پرائیوٹ انگلش میڈیم اور اونچی سطح کے تعلیمی اداروں میں تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیئے انگریزی زبان کو نصاب تعلیم میں اور اساتذہ و طلباء کے درمیان رابطے کے لیئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جاگیر دار اور دولت مند طبقہ اپنے بچوں کو انگلش میڈیم میں ہی پڑھاتا ہے جبکہ نچلے طبقے کے لیئے سرکاری اور پبلک سکول رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷ گریڈ سے اوپر کی آسامیوں میں سرمایہ دار، انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھنے والا طبقہ ہی حاوی رہتا ہے جبکہ نچلا طبقہ اعلی ملازمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس طرح سے ملک میں صوبائی اور لسانی تعصب پروان چڑھتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں:

"جہاں تک بنیادی تعلیم کا تعلق ہے، میٹرک اور ایف اے تک تعلیم قومی زبان میں ہونی چاہیئے۔ بنیادی تصورات اس وقت تک واضح نہیں ہوتے جب تک آپ اپنی زبان کے حوالے سے علوم کو نہ پڑھیں۔ ہمارے ہاں اسی لیئے سائنس کے

---

(۱) سورۃ الرحمن: ۵۵/۳-۴

استاد تو پیدا ہو رہے ہیں لیکن سائنس دان نہیں پیدا ہو رہے اور نہ ہوں گے۔ اس لیئے کہ سائنس کے طلبہ اور اساتذہ سائنس کی زبان میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان پر بنیادی تصورات ہی واضح نہیں اور نہ ہم نے عوام میں سائنس کا ذوق ہی پیدا کیا ہے، سائنس کی تعلیم سے پہلے لوگوں کا سائنسی مزاج ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ کر کے گویا ہم نسل کشی کر رہے ہیں اور قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم نے بچوں کو پہلی جماعت سے انگلش میڈیم میں لگا رکھا ہے۔ ہم ابتدائی تعلیم اور اعلی تعلیم دونوں کو آپس میں الجھا رہے ہیں۔ ان دو چیزوں میں فرق کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ملک میں دو متوازی نسلیں پیدا ہوں گی : عمومی یونیورسٹیوں میں پاس ہونے والی الگ نسل اور انگریزی میڈیم سے آنے والی الگ نسل "[1]۔

ذریعہ تعلیم کی عدم یکسانیت نے معاشرے میں طبقاتی تفاوت پیدا کیا ہوا ہے۔ غریب کا بچہ اردو ذریعہ تعلیم سے آرہا ہے جبکہ امیروں کے بچے انگریزی ذریعہ تعلیم کے حاملین ہیں اور یہی آگے چل کر ملک میں اعلی عہدوں پر حاکم بنے بیٹھے ہیں ۔ دوسری طرف نچلے طبقے کے افراد چھوٹی چھوٹی نوکریوں کے حصول کے لیئے ہی کھپ جاتے ہیں۔ ملک میں یکساں ذریعہ تعلیم ہی اتحاد و یکجہتی کا ضامن ہے۔ جبکہ مختلف ذریعہ ہائے تعلیم کی موجودگی ملک میں تعلیم کے معیار کو بھی پست کرتی ہے اور عوام الناس کے مابین انتشار و افتراق بھی برپا کرتی ہے۔ لہذا دستوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ذریعہ تعلیم اردو ہی کو بنانا چاہیے تا کہ معیار تعلیم کو یکساں تقاضوں پر بلند کیا جا سکے۔ ذریعہ تعلیم غیر ملکی زبان ہونے کی بناء پر انسان ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا ہے۔ خود سوچنے کے لائق نہیں رہا بلکہ تقلیدی ذہن پیدا ہو رہے ہیں۔ جب کہ تعلیم ایسی قوت ہے جو ذہنوں کو جلا بخشتی ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ اب تو تعلیم محض معلومات نقل کرنے کا ذریعہ ہی رہ گئی ہے۔ علوم کو سمجھنے کی بجائے رٹنے کا رواج آگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم و فنون میں مہارت حاصل نہیں ہو رہی صرف نام کی ڈگریاں حاصل کی جا رہی ہیں۔

انگریزی زبان کا تسلط معاشرے میں ثقافتی تبدیلی رونما کرتا ہے۔ اس کے ذریعے سے مغربی طور و اطوار اور مغربی تہذیب و تمدن رواج پا رہے ہیں۔ مسلمان اس سے اس قدر مرعوب ہو رہے ہیں کہ نصابات، درسی کتب اور جملہ علوم کو انگریزی زبان میں مرتب کیا جانا قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ اردو، عربی اور فارسی زبان کو دور قدیم کی زبانیں قرار دیا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلمان اپنے گراں قدر تعلیمی ورثے اور آباؤ اجداد کے شاندار ماضی سے محروم ہو گئے ہیں۔ مسلمان جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، خلفائے راشدین اور بزرگان دین جنہوں نے اپنے دور میں بہت سے کارنامے سرانجام دیئے، ان سب سے لاتعلق ہو گئے ہیں۔ جب کہ انہیں کے سیرت و کردار اور طرز حیات ہی میں مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہیں وہ کبھی بھی اپنے مستقبل میں مضبوطی اور پختگی سے قدم جما نہیں سکتیں۔ مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت اور اخلاقی قدروں سے دور، مغربی تہذیب سے مرعوب ہونے کی بناء پر

---

(۱) تعلیم کے بنیادی مباحث، وحید قریشی، انسٹیٹیوٹ آف پالیسز اسٹڈیز اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۳۰

، تعلیم یافتہ طبقہ ہر وہ چیز جو مغرب سے وابستہ ہے باعث ترقی سمجھتا ہے اور وہ چیز جو اپنے وطن کی ہے ناقابل اعتبار ٹھہرائی جاتی ہے۔ یورپین ممالک نے زبان کو ہتھیار بناتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے قدیم تعلیمی ورثے اور درخشاں تاریخ سے جدا کر کے تنزلی کی جانب گامزن کر دیا ہے۔ جبکہ خود انہوں نے مسلمان دانشوروں، مفکرین کے گراں قدر کارناموں اور کتب سے خوب استفادہ کرتے ہوئے ترقی کی اعلی منازل تک پہنچ گئے ہیں اور مسلمان تعلیمی، دینی اور اخلاقی لحاظ سے پسماندگی کا شکار ہو گئے۔ آج مسلمانوں سے زیادہ دوسری اقوام کو سلیقہ شعار اور مہذب سمجھا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام تعلیم:

عصر حاضر کا نظام تعلیم تجارتی اور سرمایہ دارانہ مقاصد پر مبنی ہے۔ عالمی استعمار تعلیم کو مغربی ماڈل کے اصول پر قائم کرنے کے لیئے کام کر رہا ہے۔ مغربی مقاصد کی رو سے تعلیم کا مقصد سرمایہ کی خدمت ہے۔ تمام تر تعلیم کا تنظیمی ڈھانچہ (job market) کے لیئے ہے۔ جس میں تعلیم کا حصول صرف روزگار حاصل کرنے کے ہے۔ ایک تعلیم یافتہ انسان capital کی مانند ہے جو کہ مستقبل میں مزید سرمایہ پیدا کرنے کے لیئے ایک قیمتی آلہ کار کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا کہ سرمایہ دارانہ نظام تعلیم میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انسان کی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔ اس طرح سے مقامی سرمایہ داری عالمی مارکیٹ پیدا کرے گی اور پھر دونوں کے مابین مسابقت ہو گی اور دیکھا جائے گا کہ سرمایہ کو بڑھانے کے لیئے کس قسم کی مزید تعلیم مطلوب ہے۔ چنانچہ ایسے مضامین کو شامل نصاب کیا جائے گا جو بہتر روزگار مہیا کر سکیں اور عالمی سطح پر سرمایہ کو بڑھائیں۔ اس نظریہ تعلیم سے تعلیم کا تعلق شخصیت کی تعمیر اور اخلاقی و روحانی تربیت سے ختم ہو گیا اور یہ روزگار کمانے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ اس سرمایہ دارانہ نظام تعلیم میں انسان کو بطور آلہ کار کے استعمال کیا جانے لگا۔ عام آدمی قومی تشخص و تحفظ سے بے نیاز صرف ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ جب کہ تعلیم کی اصل اسلامی و اخلاقی روح مفقود نظر آتی ہے۔ تعلیم کوئی تجارتی سامان نہیں بلکہ اس کے حقیقی مقاصد و مطالب کچھ اور ہیں۔

"بحیثیت مجموعی تعلیم کا مطلب ہے تہذیب نفس اور ذات کو خوب سے خوب تر بنانے کی کاوش۔ لیکن اس تہذیب نفس کی اساس، اسلامی نظریہ حیات ہی ہے۔ اس تناظر میں اسلامی تعلیم کا اصل نصب العین یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اسلامی عقیدے اور اسلامی شریعت کی بنیاد پر منظم کرے اور انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی، جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے کائنات میں اس طرح تصرف کے قابل بنائے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ، رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اخروی فوز و فلاح حاصل ہو"[1]۔

---

(۱) تعلیم و تدریس، ص:۲۲

جبکہ موجودہ دور کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا مقصد انسان کو اسلامی و اخلاقی قدروں سے روشناس کرانا نہیں بلکہ تعلیمی میدان مارکیٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ کا حصول ہے۔ عالمی سرمایہ داری تعلیمی میدان میں پرائیویٹائزیشن کا اصول لاگو کرنے کو کوششوں میں ہے۔ ریاستوں پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ پبلک سیکٹر کے تعلیمی اخراجات کم کیئے جائیں۔ سرکاری اداروں میں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیئے اگر گرانٹس بند کر دی جائیں تو تعلیمی ادارہ وسائل کی کمی کا شکار ہو گا اور تعلیمی کارکردگی متاثر ہو گی۔ بالآخر ادارے کو کسی کارپوریشن، کمپنی یا سرمایہ دار کے ہاتھوں بیچ دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پرائیوٹ کمپنی تعلیمی ادارے کو سرمایہ کے حصول کے لیئے استعمال کرے گی۔ فیسیں بڑھا دی جائیں گی۔ تعلیم مہنگی ہونے کی صورت میں عام آدمی کے لیئے حصول تعلیم مشکل ہو جائے گا۔ تعلیم کے مواقع کم ہونے کی صورت میں ہر آدمی کی رسائی تعلیم تک ناممکن ہو جائے گی جس سے غربت میں بھی اضافہ ہو گا۔ صرف سرمایہ داروں اور مقتدر طبقات کے بچے ہی تعلیمی میدان میں سرفہرست رہیں گے۔ غریب طبقے کے لوگ اس سے محروم ہو جائیں گے۔ اس طرح سے حاکم ہمیشہ حاکم اور محکوم ہمیشہ محکوم رہے گا[1]۔

نظام تعلیم کی معاشرت اور معیشت سے لاتعلقی:

نظام تعلیم کا سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس کا تعلق معاشی اور معاشرتی مسائل سے منقطع ہے۔ طلباء دور حاضر کے بڑھتے ہوئے معاشی مسائل اور جدید دور کے تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ تعلیمی نظام میں علوم و معارف اور مضامین کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ ان کا تعلق پیش آمدہ معاشی مسائل سے ہے یا نہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں ریسرچ کراتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں اور مسائل کو مد نظر نہیں رکھا جاتا۔ محض سند کے حصول کے لیئے تحقیق کی جاتی ہے۔ جبکہ تحقیق کا مقصد نئے نئے موضوعات پر روشنی ڈالنا اور جدید دور کے مسائل کا حل ہونا چاہیئے۔ تعلیم افراد معاشرہ کو اس لائق بناتی ہے کہ وہ اس کی صنعتی، تکنیکی، سائنسی، فنی اور معاشی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ طلباء تعلیم کے حصول کے بعد معاشرے کے اچھے شہری ہونے کے ساتھ ساتھ بہتر روزگار کما سکیں۔ مگر اس دور کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف معاشرے کی صنعتی و فنی ترقی کے لیئے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں اور دوسری طرف اعلی تعلیم یافتہ ڈگری اٹھائے ہوئے بہت سے ایسے نوجوان بے روزگار ملازمت کے حصول کے لیئے مارے مارے پھرتے ہیں اور معیشت میں اپنا مقام نہیں پاسکتے۔ جس کے نتیجے میں افراد معاشرہ اپنی زندگیوں سے بے زار اور مایوس ہو کر بہت سی اخلاقی و معاشرتی برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ، چوری اور لوٹ مار عام ہو گیا ہے۔ انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیئے کسی حد تک بھی جاسکتا ہے۔ ان سب مسائل کی بنیادی وجہ تعلیم کی معاشی و معاشرتی مسائل سے لاتعلقی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے

---

(۱) تعلیم اور جدید تہذیبی چیلنج، خالد علوی، دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص:۳۱-۳۳

کہ نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے اور اسے معاشرے اور معیشت سے مربوط کیا جائے تاکہ دور حاضر کے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے اور افراد معاشرہ کی بہترین شہری کے طور پر تعلیم وتربیت کی جاسکے۔

نظام تعلیم پر مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ:

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔یہاں پر رہنے والے مسلمانوں کے لیئے تعلیم کی اساس اسلامی نظریہ حیات ہے۔ تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو دینی واخلاقی فریضوں اور زندگی گزارنے کے طریقوں سے روشناس کرانا ہے۔ جبکہ عصر حاضر میں دیکھا جائے تو نظام تعلیم پر مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ مغربی طرز فکر، آداب واطوار، رسوم ورواج اور لباس کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ مغربی مفکرین مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ سوچ ڈالنے کی تگ ودو میں لگے ہیں کہ اسلام ایک قدیم مذہب ہے۔ جدید دور کے ساتھ عرب کی بدویانہ تہذیب نہیں چل سکتی بلکہ اس دور کا تقاضا یہ ہے کہ مغربی تہذیب وثقافت کو اپنایا جائے۔ جبکہ اصلاً مغربی اصول وافکار انسان کو تنگ نظر اور متعصب بناتے ہیں۔ وطنی اور نسلی امتیازات پیدا کر کے قوموں کو ایک دوسرے کا دشمن بناتے ہیں۔ انسانوں کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اپنے ذاتی مفادات اور صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیئے مخصوص کریں۔ خود کو دوسری قوموں کی نسبت زیادہ طاقتور بنائیں اور دوسری اقوام ان سے پست اور کمزور ہوں۔ قوم پرستی انسان کو مفاد پرست بناتی ہے انسان پوری انسانیت کے مفادات کو اپنے قوم کے مفادات پر قربان کرتا ہے۔ جس کے برعکس اسلامی تعلیمات کے تناظر میں انسان کے حقوق کی بنیاد اخلاق پر قائم کی گئی ہے۔ انسانوں کے درمیان اخلاقی وروحانی رشتے سے انہیں وسیع پیمانے پر ایک دوسرے کا معاون اور خیر خواہ بناتا ہے۔ شریعت الٰہی کی رو سے ہر فرد، ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی صحیح نشوونما کرتے ہوئے، ترقی کرنے کے مکمل مواقع ملنے چاہیئے کیونکہ مجموعی حیثیت سے پوری انسانیت کی ترقی کا دارومدار ایک ایک قوم کی ترقی پر منحصر ہے۔ اسلام قوم پروری کے خلاف نہیں بلکہ وہ ایسی قوم پرستی کی تائید کرتا ہے جو پوری انسانیت کی جانب ہمدردی وخیر خواہی لیئے ہوئے بڑھے[1]۔

آج ہم مغربی ثقافت میں اس قدر جکڑے جاچکے ہیں کہ ہمارا عدالتی نظام تک اسلامی نہ ہوسکا، معاشی نظام سود در سود کے جال میں پھنس رہا ہے، قرضوں کے دباؤ تلے ملک میں بے روزگاری اور مہنگائی بڑھتی جارہی ہے، دین سے دوری کی بناء پر معاشرہ فسادات کا شکار ہے، ظلم وستم اور قتل وغارت عام ہوچکا ہے۔ عورتوں کو آزادی کے نام پر مساوی حقوق کا جھانسہ دیتے ہوئے گھر سے باہر نکال کر طلب معاش کا بوجھ اس کے کاندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خاندانی شیرازہ بکھرتا نظر آتا ہے اور نسوانی تقدس اور احترام کا جنازہ نکل گیا ہے۔ مسلم معاشرے کے افراد مغربی تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہوگئے کہ ان کا طرز فکر، طرز عمل اور اخلاقی اقدار مغربی سانچے میں ڈھل گئے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر مغربی ماڈل پر ہونے لگی

---

(۱) امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل، ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ معارف اسلامیہ، منصورہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۲۸-۲۹

۔دوسرے الفاظ میں وہ مغربی ممالک کے لیئے مفید کارکن بن گئے، اپنے دین اسلام سے باغی ہو گئے اور مسلمانوں کے لیئے کام کے نہ رہے۔ اعداد و شمار کے مطابق دیکھا جائے تو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۷ء تک پاکستان میں ۷۹،۲۲۹ ڈاکٹر بنے۔ جن میں سے ۲۲،۲۲۴ ڈاکٹر باہر کے یورپین ممالک میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح ۱۶۸،۶۸۶ انجینئر تیار ہوئے جن میں سے ۱۷،۵۱۸ بیرون ملک اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۳۰۰۰ کمپیوٹر کے ماہرین تیار ہوئے حن میں سے ۷،۳۲۱ نے اپنی آرام گاہ یورپ میں بنالی[1]۔ المیہ یہ ہے کہ پاکستان اپنے ماہرین کی خدمات سے محروم رہا اور انہوں نے اپنی ذاتی مفاد کی خاطر بیرون ممالک میں خدمات انجام دینے کو ترجیح دی۔ پاکستان میں ہمیشہ ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دانوں کی کمی رہی ہے۔

مغربی مفکرین اور یورپین ممالک کی سازشوں کے مقابلے میں عوام الناس میں سے جب ہی کوئی اپنے دینی و وطنی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا یا ملک کو نظریاتی اور تعلیمی لحاظ سے راہ راست پر لانے کی بات کی گئی تو اسے دہشت گرد، بنیاد پرست اور تہذیب دشمن کہہ کر قابل گرفت کیا جاتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو جمہوری طرز حکومت کی بناء پر حکمران بدلتے رہتے ہیں مگر وہی زیادہ وقت برسر اقتدار رہتا ہے جو ان مغربی آقاؤں کا حامی و معاون ہوتا ہے۔ اگر کوئی حکمران اسلامی جمہوریہ پاکستان ہونے کی حیثیت سے اس کے ملی و دینی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے اور مغربی آقاؤں کے مفادات کو پورا کرنے میں ذرا سی بھی سرتابی کرے تو اس کی حکومت کا تختہ جلد ہی الٹ دیا جاتا ہے۔

مغربی افکار و ثقافت کی بجائے اسلامی تہذیب و تمدن کے بقا و تحفظ میں ہی مسلم معاشرے کا استحکام ممکن ہے۔ اسلامی تہذیب کو فروغ دینے کا انحصار دو چیزوں پر ہے ایک یہ کہ نظام تعلیم ایسا ہو کہ جو صحیح اسلامی طرز فکر و حیات کو مسلمانوں کے ذہنوں میں پیوست کرے اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے سوچیں اور زندگی کے ہر مرحلے پر اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق درست راستے کا انتخاب کریں۔ دوسرا یہ کہ اجتماعی زندگی میں عملاً اسلامی تہذیب کا نفاذ ہو اور ایسا اسلامی ماحول معاشرے میں قائم ہو کہ مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر اپنی زندگی بسر کریں۔

انتظامی اسباب:

پاکستان میں حکومتی سطح پر بہت سے ایسے اسباب پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے تعلیمی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دیکھا جائے تو حکومت نے سطحی سیاسی مطالبات کے پیش نظر تعلیم کا محکمہ مرکز کی بجائے صوبوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے یکساں تعلیمی پالیسز ملک میں نافذ نہیں ہو رہیں اور نصاب تعلیم اسلام اور نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ نہیں رہا۔ قومی آمدنی کا نہایت حقیر حصہ تعلیم کے لیئے وقف کیا جاتا ہے اور قومی سطح پر فنڈز بھی مہیا نہیں کیے جاتے۔ جس کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں سہولیات میسر نہیں ہوتیں اور اساتذہ معاشی فارغ البالی اور معاشرے میں عزت و تکریم سے محروم رہتے

---

(۱) استاد ملت کا محافظ، ص:۱۷

ہیں۔ انہیں زندگی کی بنیادی ضروریات تک میسر نہیں آتیں جو ہر مہذب قوم انہیں مہیا کرتی ہے۔ اسی لیئے ماہرین تعلیم، اساتذہ اور علماء دین کوئی خصوصی کردار ادا نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ اسلامی اصولوں پر افراد کی شخصیت و کردار کی تعمیر نہیں ہو رہی اور معاشرہ اخلاقی فسادات کا شکار ہے۔ اساتذہ نے تعلیمی میدان کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ طلباء کو اسکول میں نہ پڑھا کر انہیں ٹیوشن پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تا کہ ذریعہ آمدنی بن سکے۔ اخلاقی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور ہر طرف مادہ پرستی کا دور ہے۔ معیار زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے راتوں رات امیر بننے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور حرص و لالچ کا بازار گرم ہے۔ ہر گلی کوچے میں تعلیمی ادارے کھولے جا رہے ہیں جن میں نیم تعلیم یافتہ اساتذہ کو بہت تھوڑی تنخواہ پر رکھا لیا جاتا ہے اور طلباء و اساتذہ کو سہولتیں بھی میسر نہیں ہوتیں۔ تعلیمی اداروں کے انتظامی افسران پیسے کے حصول کے لیئے جعلی ڈگریاں بیچنے کا کاروبار کرتے ہیں، رشوت لے کر طلباء کو تعلیمی اداروں میں داخلے دیئے جاتے ہیں اور امتحانات میں نقل کروائی جاتی ہے۔ جب تعلیمی میدان کی یہ حالت ہو گی تو معاشرہ اخلاقی پستی کا شکار ہو گا۔ حکومتی سطح پر درست تعلیمی پالیسیز، انتظامات اور اچھی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے بہت سارے تعلیمی و معاشرتی مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

باب پنجم

نظام تعلیم میں اخلاقی اقدار کو سمونے کے نبوی اقدامات

فصل اول: آنحضرت ﷺ کا طریقہ تعلیم وتربیت

فصل دوم: تربیت اخلاق اور منہاج نبوی

فصل سوم: نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کا فروغ اسوہ سیرت کی روشنی میں

فصل اول

آنحضرت ﷺ کا طریقہ تعلیم وتربیت

فصل اول:

آنحضرت ﷺ کا طریقہ تعلیم وتربیت

کسی بھی نظام تعلیم کی افادیت، ثمرات ونتائج کا انحصار اس کے نصب العین پر ہوتا ہے۔ اسی نصب العین کے حصول کے لیئے مختلف طریقہ ہائے تدریس اختیار کیئے جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم وتدریس کا نصب العین اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے روشناس کرانا اور متوازن ومعتدل شخصیت کی تعمیر ہے۔ دین اسلام کا پیغام صرف عدل پر مبنی ہے اور یہ وہ مقصد تعلیم ہے جو اس کو باقی مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلام دنیا وآخرت میں اعتدال پر زور دیتا ہے جبکہ دوسرے مذاہب یہودیت، ہندومت اور عیسائیت وغیرہ افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ دنیا کو بالکل چھوڑ دینے کی تعلیم دیتے یا دین میں غلو اختیار کیئے ہوئے ہیں۔ البتہ اسلام خواہشات کی پیروی یا اسلامی احکامات کو اپنانے میں حد سے تجاوز کرنے کے برعکس عدل وتوازن کے ساتھ چلنے کی تربیت دیتا ہے۔ خواہش پرستی سے متعلق ارشاد باری تعالی ہے:

(أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ)[1]

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ذاتی خواہش کو الہ بنایا ہوا ہے۔

خواہش کو معبود بنالینے سے مراد یہ ہے کہ انسان کا اللہ کے احکامات کے مقابلے میں اپنے نفس کی خواہش کے اپنانے کو ترجیح دینا اور تعلیمات اسلام کو چھوڑتے چلے جانا یہاں تک کہ اپنی خواہشوں کا غلام بن جانا۔ ایسے شخص کے دل سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی وقعت ختم ہوتی چلی جاتی ہے، سیدھے راستے پر واپسی کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں اور وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے ہر اس فکر کی جو زیادہ سختی یا غلو کی طرف لے کر جائے مخالفت کی اور عدل وتوازن پر زور دیا۔ جیسا کہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا واقعہ آتا ہے جنہوں نے زیادہ عبادت وریاضت کا اہتمام کرنے کا عزم کیا، ایک صحابی نے ارادہ کیا کہ وہ کبھی روزہ نہیں چھوڑے گا اور ہمیشہ روزے رکھے گا، دوسرے نے اپنے اوپر ساری رات عبادت کرنے کو لازم کر لیا کہ وہ سوئے گا نہیں اور تیسرے نے کہا کہ وہ ساری زندگی کنوارہ رہے گا اور کبھی بھی شادی نہیں کرے گا۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عبادات ومعاملات میں عادلانہ روش اختیار کرنے کی تعلیم آپ ﷺ نے اس طرح سے دی:

---

(۱) سورۃ الفرقان:۲۵/۴۳

((إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي))[1]

ترجمہ: میں تم سے زیادہ اللہ تعالی سے ڈرنے والا ہوں، زیادہ پرہیز گار ہوں لیکن روزے رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں، رات کو عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو میری سنت سے منہ پھیرے گا تو وہ مجھ سے نہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت دین ودنیا دونوں میں اعتدال کی روش اختیار کرنے پر کی۔ اپنے نفس کی غلامی اور احکامات الٰہی میں حد سے تجاوز کرنے کو منع فرمایا۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے آپ ﷺ نے تعلم کے دوران مختلف طریقہ ہائے تدریس اختیار کیئے۔

طریقہ تدریس کسی بھی علم کو مؤثر انداز میں دوسرے تک پہچانے کے لیئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہر علم اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسرے سے الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اسی لیئے اس کو ذہن نشین کرانے کے لیئے انہی خطوط پر اس کی تدریس کی جاتی ہے جو دوسرے کے سمجھنے کے لیئے آسان ہو۔ چنانچہ مختلف مضامین کے اعتبار سے مختلف طریقہ ہائے تدریس اپنائے جاتے ہیں۔ عصر حاضر کے ترقیاتی دور، جس میں فن تعلیم وتدریس کو ایک باقاعدہ علم کے طور پر سراہا گیا اور ملت کے محافظین کو اس کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے، نبی اکرم ﷺ اس کی اہمیت وافادیت سے آج سے چودہ سو سال پہلے ہی باخوبی واقف تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے تعلیمی نصب العین کے حصول کے لیئے وقت اور حالات کے تقاضوں، موقع کی مناسبت اور سننے والوں کے میلانات ورجحانات کو سمجھتے ہوئے تدریس کے مختلف طرق اختیار کیئے اور دین اسلام کو لوگوں کی زندگیوں میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں آپ ﷺ کے اخذ کردہ طریقہ ہائے تعلیم وتدریس کی خصوصیات کو تفصیلا ذکر کیا جاتا ہے۔

سوال وجواب کا طریقہ:

سوال وجواب ایسا طریقہ تدریس ہے جس کی افادیت سے تعلیم وتدریس سے وابستہ لوگ باخوبی واقف ہیں۔ عصر حاضر میں بھی کسی بھی معلومات کو ذہن نشین کرانے کے لیئے یہ طریقہ تدریس باقیوں کی نسبت زیادہ مؤثر ثابت ہوا ہے۔ تعلیمات اسلام کا ایک وافر حصہ اسی طریقے کی بدولت ہم تک پہنچا۔ عہد نبوی ﷺ میں اس طریقہ تدریس کے دو پہلو تھے۔ سوال وجواب کی ایک وہ قسم تھی جو مخالفین یا مبتدیوں کی جانب سے کیئے جاتے تھے۔ ایسے سوالات کا جواب دینے کے لیئے نبی اکرم ﷺ اکثر مصلحتاً خاموشی اختیار کرتے اور اللہ سبحانہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ آیات کا انتظار کرتے۔ یہ آیات قرآن مجید میں يَسْأَلُونَكَ سے شروع ہوتی ہیں۔ جیسا کہ شراب کے بارے میں ارشاد باری تعالی ہے:

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب: الترغیب فی النکاح، رقم الحدیث: ۵۰۶۳، ۷/ ۲

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا﴾[1]

ترجمہ: وہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہیے کہ ان دونوں کاموں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ ان کے نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔

اسی طرح قیامت، مال غنیمت، روح، حلال و حرام اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق سوالات پوچھنے پر آیات کا نزول ہوا۔ اس کے علاوہ ان سوالات کے جوابات میں احادیث مبارکہ بھی پائی جاتی ہیں جن میں انسان کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی وغیرہ سے متعلق معلومات پائی جاتی ہے۔ ان اقوال النبی ﷺ کے اکثر محرکات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذوق وشوق اور دین سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا وہ جذبہ کار فرما تھا کہ جس کی بدولت آج زندگی کہ ہر شعبہ سے متعلق معلومات ملتی ہے[2]۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں رہتے ہوئے استفہام و تفہیم سے دین کے بے انتہا پہلوؤں کو اجاگر کیا، آپ ﷺ نے ہر سوال کا صحیح جواب دیتے ہوئے ان کی بھرپور رہنمائی کی۔

جیسا کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا، ذیل میں حدیث تفصیلا ذکر کی جاتی ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قِيلَ لِرَسُولِ اللَّهِ – صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ –: أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: "كُلُّ مَخْمُومِ الْقَلْبِ، صَدُوقِ اللِّسَانِ". قَالُوا: صَدُوقُ اللِّسَانِ نَعْرِفُهُ، فَمَا مَخْمُومُ الْقَلْبِ؟ قَالَ: "هُوَ التَّقِيُّ النَّقِيُّ، لَا إِثْمَ فِيهِ، وَلَا بَغْيَ، وَلَا غِلَّ، وَلَا حَسَدَ))[3]

ترجمہ: سیدنا عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ افضل کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر صاف دل زبان کا سچا۔ لوگوں نے کہا زبان کے سچے کو تو ہم پہچانتے ہیں لیکن صاف دل کون ہے؟ فرمایا: وہ پرہیز گار، پاک صاف جس کے دل میں گناہ نہ ہو، نہ بغاوت ہو، نہ بغض ہو، نہ حسد ہو۔

---

(۱) سورۃ البقرہ: ۲/۲۱۹

(۲) عہد نبوی کا نظام تعلیم (ایک تاریخی و تحقیقی مطالعہ)، عابد خان، عوامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۸ء، ص: ۱۰۵-۱۰۶

(۳) سنن ابن ماجہ، أبو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی، (تحقیق: شعیب الأرنؤوط)، دار الرسالہ العالمیہ، ابواب الزہد، باب الورع والتقوی، رقم الحدیث: ۴۲۱۶، ۵/۲۹۹

سوال وجواب کی دوسری قسم جس میں نبی اکرم ﷺ خود سوال پوچھتے اور دوسروں کو خندہ پیشانی سے سوچنے کا موقع دینے کہ بعد خود ہی جواب دیتے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں کو متوجہ کرنا، ان کے تجسس کو ابھارنا، انہیں ذہنی طور پر آمادہ کرنا اور معلومات فراہم کرنا ہوتا تھا۔ تعلیم وتدریس کے دوران یہ تکنیک طلباء کی دلچسپی وانہماک حاصل کرنے کے لیئے بہت موزوں ہے کیونکہ جب تک وہ موضوع کی جانب راغب نہ ہوں اور توجہ نہ دیں، معلم کی تدریسی کوششیں نتیجہ خیز نہیں ہوسکتیں۔ آپ ﷺ کا سوال:

((قال رسول الله " ألا أخبركم بأفضل من درجة الصيام والصلاة والصدقة ؟ " قالوا بلى يارسول الله قال " إصلاح ذات البين وفساد ذات البيت الحالقة)) "[1]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں روزہ، نماز اور صدقہ کا اعلی وافضل درجہ نہ بتلاؤں؟ صحابہ (رض) نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ ﷺ۔ فرمایا کہ جھگڑے والوں میں صلح کرانا اور جھگڑے والوں میں (مزید) فساد کرانا (لگائی بجھائی کرکے) ان تمام اعمال کو غارت کردیتا ہے۔

آپ ﷺ نہایت جامع، مختصر اور آسان الفاظ پر مشتمل سوال پوچھتے۔ سوال پوچھنے کا انداز اس طرح سے ہوتا کہ سننے والا پوری طرح متوجہ ہوجاتا اور جواب ڈھونڈنے کے لیئے پورا زور لگادیتا۔ آپ ﷺ دوسروں کو بھی سوال پوچھنے کا پورا موقع اور آزادی دیتے۔ البتہ ایسے سوالات جو بے معنی ہوں ان سے مناسب انداز سے منع فرماتے تھے اور غیر متعلق سوال کا جواب بات کے اختتام پر الگ سے دیتے تھے۔

فطری ونفسیاتی پہلوؤں کا خیال رکھنا:

تعلیم وتدریس کے دوران مبتدیوں کی ذہنی استعداد، فطری میلانات اور رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ طلباء کی نفسیاتی کیفیات کے مطابق تدریسی طریق کار اختیار کیا جائے تو ہی مؤثر نتائج مرتب ہوسکتے ہیں۔ موجودہ ترقیاتی دور میں تعلیم نفسیات کی ایک باقاعدہ علم کے طور پر معلمین کو تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے تدریسی مراحل میں اس سے رہنمائی حاصل کرسکیں۔ جب کہ عہد نبوی میں بھی آپ ﷺ اس سے باخوبی واقف تھے اور دوران تدریس سامعین کے فطری میلانات اور نفسیات کو سمجھتے ہوئے، حالات وکیفیات کے مطابق اپنا پیغام نہایت حکمت دانائی سے دوسروں تک پہنچاتے۔ انسان فطری طور پر آسان فہم اور خوش کن بات کو پسند فرماتا ہے، پیچیدہ کلام کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے اور مصائب ومشکلات سے بچتا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے اس ضمن میں فرمایا:

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی إصلاح ذات البین، رقم الحدیث:۴۹۱۹، ۲/۶۹۷

((یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا))[1]

ترجمہ: آسانیاں بہم پہنچاؤ، شدائد میں مبتلا نہ کرو، خوشخبری دو، متنفر نہ کرو۔

نبی اکرم ﷺ سننے والے کی ذہنی استعداد کے مطابق الفاظ کا چناؤ نہایت سادہ اور آسان فہم کرتے تاکہ سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہو اور کم سے کم ادراک رکھنے والے کو بھی سمجھ آسکے۔ آپ ﷺ ذہنی آمادگی اور رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے کلام کرتے۔ انسان ذہنی طور پر کبھی تو بات سننے کے لیئے تیار ہوتا ہے اور کبھی نہیں اور جب کسی کو بات سننے پر مجبور کیا جائے تو اس کا دل ودماغ اثر انداز ہونا تو دور قبول کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے تعلیمی ماحول اور ذہنی فضا کی موجودگی کو طلباء کے لیئے ضروری سمجھا جیسا کہ آپ ﷺ زیادہ تر فجر کی نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے کیونکہ صبح کے وقت انسان قوی ذہن اور مستعد ہوتا ہے۔ نیز آپ ﷺ ہمیشہ لوگوں کو مایوسی اور بددلی سے نکال کر امید کی راہیں ہموار کرتے۔ مایوسی کفر ہے، معلم کو بھی کبھی اصلاح وتربیت کرتے ہوئے ناامید نہیں ہونا چاہیئے بلکہ خلوص دل سے اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے۔

آپ ﷺ کا انداز تعلیم حالات وواقعات کے مطابق بدلتا رہتا تھا۔ کبھی طویل خطبہ ارشاد فرماتے اور کبھی اختصار سے کام لیتے کہ لوگوں پر بوجھل نہ ہو۔ اسی طرح انسان فطرتاً بہت زیادہ پند ونصائح سے تنگ پڑ جاتا ہے، لگاتار وعظ ونصیحت انسان پر بے اثر ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ ان فطری تقاضوں سے باخوبی آشنا تھے اور اس کا بہت زیادہ خیال کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ جب محسوس کرتے کہ لوگ اکتاہٹ محسوس کرنے لگے یا ان کی توجہ بھٹکنے لگی تو بس جتنا بیان کر چکے ہوتے اسی پر اکتفا کرتے یا موضوع بدل دیتے۔ آپ ﷺ تدریس کے دوران دوسروں کے مزاج، عمر اور طبیعت کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ لوگوں کو ان باتوں کی طرف لاتے جن سے اللہ تعالی کی رضا کا حصول ممکن ہو اور ان باتوں سے منع فرماتے جو اللہ ناپسند فرماتا۔ احکامات الٰہی سمجھانے کے لیئے آپ ﷺ کے کلام میں ایسے اشارات بھی پائے جاتے تھے جو بلند عقل وفہم رکھنے والے سمجھ سکتے تھے، البتہ آپ ﷺ نے ہمیشہ پیچیدگیوں سے اعتراز کیا اور نفسیاتی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے سیدھی اور آسان بات کہی۔

بیانیہ یا اخباری اطلاعی طریقہ کار:

نبی اکرم ﷺ تعلم وتدریس کے دوران جب کوئی واقعہ سنانا ہو یا کسی کے بارے میں بتانا ہو تو اطلاعی طریقہ کار استعمال کرتے تھے، جو کہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہوتا تھا:

---

(۱) الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ماکان النبي صلی اللہ علیہ وسلم یتخولھم بالموعظۃ والعلم کی لاینفروا، رقم الحدیث:۶۹، ۱/۳۸

۱) واقعہ بیان کرتے وقت ایسی منظر کشی کرتے کہ گویا ان دیکھیں حقیقتیں آنکھوں کے سامنے واضح ہو رہی ہوں۔

۲) کسی بات کو سمجھانے کے لیئے عملی زندگی سے مثال پیش کرتے یا کسی جانی پہچانی چیز سے تشبیہ دیتے یا حسب ضرورت کر کے دکھا دیتے تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

۳) آپ ﷺ اپنے کلام سے جس طرح کا تاثر پیش کرنا چاہتے تھے، وہ کیفیت پہلے خود محسوس کرتے اور اپنے اوپر لاگو کرتے کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر انگیزی رکھتی ہے۔ نیز آپ ﷺ کی حرکات و سکنات اور چہرے کے جذبات و رنگت سے سامعین کو باخوبی واضح ہو جاتا۔

۴) بعض اوقات آپ ﷺ اپنا مدعا ریت پر نشانات بنا کر واضح کرتے تھے[۱]۔

عملی نمونہ پیش کرنا:

یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ تعلم و تدریس کے مراحل میں طلباء اپنے معلم کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ طلباء کی تعمیر سیرت میں معلم کے اپنے کردار و اوصاف کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ معلم کا عکس طالب علم کی زندگی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ اسی لیئے معلم کی شخصیت ایسی معیاری ہونی چاہیئے جو دوسروں کے لیے قابل اتباع ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات گرامی کو دوسروں کے لیئے عملی نمونہ بنا کر پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[۲]

ترجمہ: (مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے

نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی عقیدہ کی پختگی کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر پہلو خصوصا معاشرتی و اخلاقی تعلیم کے لیئے اکمل و اعلیٰ نمونہ بنی۔ لوگ آپ ﷺ کے کردار و اخلاقیات سے متاثر ہوئے اور دین اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے اسطرح اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ))[۳]

ترجمہ: حضور اکرم ﷺ کا اخلاق تو عین قرآن ہے۔

---

(۱) فن تعلیم و تربیت، افضل حسین، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، ڈھاکہ، ۱۹۷۰ء، ص: ۶۳-۶۴

(۲) سورۃ الاحزاب: ۳۳/۲۱

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب فی المحبتین، رقم الحدیث: ۱۹۰۲، ۱/۶۱۳

گویا آپ ﷺ اللہ اور اس کی کی کتاب کی تعلیمات سے صرف آگاہ نہیں کرتے تھے بلکہ آپ ﷺ تو خود اس کتاب کا عملی نمونہ تھے۔ اصلا یہ وہ اصول ہے جو معلم کو ممتاز و موثر بناتا ہے اور اعلی اخلاقی قدروں کا عملی جامہ پہناتا ہے۔ آپ ﷺ کی شخصیت میں پائے جانے والے اوصاف حمیدہ کو ہر معلم کو اپنی زندگی میں ڈھالنا چاہیئے تاکہ طلباء کے لیئے قابل تقلید اسوہ پیش کیا جاسکے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نرم مزاج، لہجے میں شائستگی، عفوودرگزر، تحمل وبردباری، صاحب علم وحکمت، خوش اخلاق، ملنسار، طہارت ونظافت کا خیال، غیر معمولی نظم وانضباط، احساس ذمہ داری، ایثار، قناعت، توکل علی اللہ وغیرہ جیسی اعلی صفات کے حامل تھے۔

آپ ﷺ کے نزدیک تعلیم محض چند کتابوں اور دروس کا مجمع نہیں بلکہ یہ تمام تر دینی واخلاقی نظریات وافکار کو عملی زندگی میں ڈھالنے کا نام ہے۔ تعلیم ہی سے انسان احسن طریقے سے زندگی گزارنے کے طریقے سیکھتا ہے۔ محض لفظوں، وعظ وتقاریر اور زبانی افکار سے انسان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاسکتا ہے بلکہ تعلیم وتربیت کے لیئے دین اسلام کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا ضروری ہے، زبانی کہی ہوئی بات سے عمل کرکے دکھایا جانا زیادہ تاثیر رکھتا ہے[1]۔ آپ ﷺ جو کہتے کہتے اس پر عمل کرکے دکھاتے، ظاہر وباطن یکساں تھا۔ لہذا ایک معلم کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾[2]

ترجمہ: اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے طریقہ تعلیم کی یہ خصوصیت تھی کہ انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا اور تربیت انسانی کے لیئے سب سے پہلے خود اپنی ذات کو دوسروں کے لیئے اسوہ حسنہ کے طور پیش کیا۔ صرف عقائد ونظریات کی درستگی نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو عادات واطوار، اخلاقیات وغیرہ کی اصلاح وتربیت اور نوجوانوں میں اسلامی تعلیمات کا نفاذ کرنا بھی مقصود ہے۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں میں معلمین اپنی عملی زندگیوں سے شعائر اسلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے تربیتی پہلوؤں پر زور دیں گے۔

---

(۱) نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید (تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۷۸ء، ص:۱۹-۲۰

(۲) سورۃ الصف:۶۱/۲

لطیف ذوق مزاح:

ایک معلم کے لیئے خوشگوار ماحول اور مؤثر انداذ بیان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ لطیف ذوق مزاح رکھتا ہو۔ نبی اکرم ﷺ کا اسلوب تعلیم وتربیت رہا ہے کہ وہ دوران گفتگو شگفتگی اور لطیف مزاح سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے۔ آپ ﷺ کے چہرے پر ہلکی سی تبسم ہوتی۔ چہرے سے جھلکنے والی مسکراہٹ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "آپ ﷺ اپنی مبارک گفتگو سے مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے، مگر توازن اور اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا۔ مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی، نہ کسی کی دلازاری کی جاتی، نہ قہقہے لگا کر ہنسنا معمول تھا"۔ (۱)

مؤثر تدریس کے لیئے ضروری ہے کہ معلم لطیف ذوق مزاح اپنائے۔ تھوڑے سے ہنسی مزاح سے طلباء کا مزاج خوشگوار ہو جاتا ہے اور یہ انداذ بیان بہت مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ البتہ معلم کو یہ بات مد نظر رکھنی چاہیئے کہ مزاح کا مقصد کسی پر چوٹ لگانا نہیں بلکہ محض انداذ بیان کی شگفتگی ہے نیز مزاح میں صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھٹنا چاہیئے۔ ایک ہی طرح کے اسلوب تدریس سے طلباء اکتا جاتے ہیں اور موضوع میں دلچسپی بھی ختم ہوتی چلی جاتی ہے اس لیئے دوران تدریس معلم کا شگفتہ انداذ بیان طلباء کو چست بھی رکھتا ہے اور موضوع بحث میں محور کیئے رکھتا ہے۔

تقریری یا خطابت کا طریقہ:

فن تعلیم وتدریس کے تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریری یا خطابت کا طریقہ قدیم ترین طریقہ تدریس ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج کے ترقیاتی دور میں بھی اعلی تعلیمی اداروں میں فن تعلیم وتدریس سے وابستہ افراد کو لیکچرار یا خطیب ہی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے تدریسی دورانیہ میں اس طریقے کے علاوہ اور بھی تکنیکوں کا استعمال کرتے ہیں۔ فطری طور پر دیکھا جائے تو کسی بھی نوع کی قیادت کے لیئے چاہے اس کا تعلق سیاسی قیادت سے ہو مذہبی یا روحانی، اس کے لیئے ایک اچھے مقرر یا خطیب کے اوصاف کا پائے جانا ضروری ہیں۔ جب تک وہ اپنے پیغام کو احسن طریقے سے دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھے گا کبھی بھی اس کی بات اہمیت وافادیت نہیں رکھے گی اور اثر انداذ نہیں ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی نشوونما ایسے قبائل میں کی، جو فصاحت وبلاغت کا سرچشمہ، شیریں زبان اور خوش بیان تھے۔ آپ ﷺ کا اس بارے میں ارشاد گرامی ہے:

---

(۱) تعلیم وتدریس (مباحث ومسائل)، مشتاق الرحمن صدیقی، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص:۱۶۸

((أنا أفصح العرب، بيد أني من قريش، ونشأت في بني سعد))[1]

ترجمہ: میں عرب میں سے فصیح تر ہوں، میں قریشی ہوں اور میں نے بنو سعد میں پرورش پائی۔

آپ ﷺ داعی اسلام تھے، لوگوں کو تعلیمات اسلام سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری آپ ﷺ کی تھی، آپ ﷺ کے انداز گفتگو کو اگر کوئی عنوان دیا جائے تو وہ قرآن مجید کی یہ آیت ہو گی:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾[2]

ترجمہ: اور لوگوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ بات کیا کرو۔

آپ ﷺ اس آیت مبارکہ کی مکمل تفسیر تھے۔ شیریں کلام، حکمت و دانائی اور تدبر و تفکر سے لوگوں کو دعوت اسلام دی۔ بعثت سے لے کر خطبہ حجۃ الوداع تک متعدد مقامات پر، موقع و محل کی مناسبت سے آپ ﷺ نے فصیح و بلیغ زبان میں لوگوں سے خطاب کیا۔ دوران خطاب آپ ﷺ کے طرز بیان میں وقت اور حیثیت کے اعتبار سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی تھیں۔ کہیں پر آپ ﷺ بحیثیت امیر الجیش مقرر ہوتے، کہیں فاتح، کہیں واعظ اور قاضی وغیرہ ہوتے۔ ان مختلف حیثیتوں کے پیش نظر جو تبدیلی آپ ﷺ کے طرز بیان میں پائی جاتی وہ عین وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوتی۔ ایک مرتبہ قبیلہ نہد کے لوگ آپ ﷺ کے پاس ملاقات کے لیئے آئے، بات چیت کے بعد بے اختیار پکار اٹھے کہ جس سرزمین میں آپ ﷺ پیدا ہوئے وہیں ہم بھی پیدا ہوئے ہیں، جو آپ ﷺ کی زبان ہے وہی ہماری بھی ہے مگر ہماری بات میں وہ بات نہیں جو آپ ﷺ کی بات میں ہے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((إن الله عز وجل أدبنى فأحسن أدبى))[3]

ترجمہ: میری تربیت خالق کائنات نے خود کی ہے اور مجھے بولنا خود سکھایا ہے۔

تقریری طریقہ تدریس کا استعمال آپ ﷺ نے مختلف انداز بیان سے کیا جو کہ درج ذیل خوبیوں سے متصف تھا:

۱) خطبے میں جامع و واشگاف الفاظ اور واضح جملوں کے ساتھ بلاغت و فصاحت کا امتزاج بھی نظر آتا ہے۔

۲) سامعین کی ذہنی آمادگی اور دلچسپی کے حصول کے لیئے تمثیلات و تشبیہات کا استعمال بھی کیا۔ جیسا نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

---

(۱) دلائل النبوۃ و معرفۃ أحوال صاحب الشریعۃ، أبو بکر البیھقی، أحمد بن الحسین بن علی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبعہ الأولی، ۱۴۰۵ھ، ۳/۴۳۲

(۲) سورۃ البقرہ: ۲/۸۳

(۳) المواھب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ، شھاب الدین، أحمد بن محمد بن أبی بکر، المکتبہ التوفیقیہ، القاھرۃ، مصر، ۲/۲۲

((إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ))[1]

ترجمہ: حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اسطرح بھسم کر جاتا ہے جسطرح آگ لکڑی کو بھسم کر ڈالتی ہے۔

اسی طرح اس تمثیلی، لطیف اور فصیح و بلیغ انداز بیان کی ایک اور مثال ہے۔ قول النبی ﷺ:

((فَضْلُ العَالِمِ عَلَى العَابِدِ، كَفَضْلِ القَمَرِ عَلَى سَائِرِ الكَوَاكِبِ))[2]

ترجمہ: عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جسطرح ستاروں پر چاند کی فضیلت۔

یہ انداز بیان سننے والے کے ذہن میں ایسے مظہر کو ابھارتا ہے جن سے ہم اپنے تجربات کی رو سے باخوبی واقف ہوتے ہیں، اس طرح اصل نکتے کا فہم بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔

۳) آپ ﷺ کا کلام مختصر اور جامع الفاظ پر مبنی ہوتا ہے مگر اپنے اندر بہت ساری توضیحات و تشریحات رکھتا ہے۔ جس کی مثال خطبہ حجتہ الوداع میں ملتی ہے، جو کہ زندگی کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے یہاں تک کہ اسے انسانی زندگی کا چارٹر کہنا مناسب ہوگا۔ آپ ﷺ کی منفرد شان یہ ہے کہ آپ ﷺ کو "جوامع الکلم" عطا کیئے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الكَلِمِ))[3]

ترجمہ: مجھے جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔

یہ کلام خصوصی عطیات ربانی ہیں۔ یہ مختصر ترین کلمے ہیں مگر معنی کے لحاظ سے وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ معنی پیش کرتے ہیں۔

۴) آپ ﷺ کی تقریر میں ولولہ، جوش و خروش، لطافت، موقع و محل کی مناسبت سے آواز میں اتار چڑھاؤ اور ایسی کشش پائی جاتی تھی کہ سننے والا مزید سننے کی تمنا کرتا۔

۵) کسی بات کو ذہن نشین کرانا ہو تو تکرار سے کام لیتے اور بار بار دہراتے یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے آپس میں مذاکرے کرتے تاکہ مکمل ذہن نشین کر لی جائے۔

---

(۱) سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب فی الحسد، رقم الحدیث: ۴۹۰۵، ۴/۴۲۷

(۲) الجامع الکبیر، أبو عیسی محمد بن عیسی، الترمذی، (تحقیق: بشار عواد معروف)، دار الغرب الإسلامی، بیروت، ۱۹۹۸م، أبواب العلم، بَابُ مَاجَاءَ فِي فَضْلِ الفِقْهِ عَلَى العِبَادَةِ، رقم الحدیث: ۲۶۸۲، ۴/۳۴۶

(۳) الجامع الصحیح، کتاب التعبیر، باب المفاتیح فی الید، رقم الحدیث: ۷۰۱۳، ۹/۳۶

یہی طریقہ خطابت کی وہ صفات ہیں جنہیں کسی بھی معلم کو دوران تدریس اپنانا چاہیئے تا کہ وہ سامعین کے لیئے سود مند ثابت ہو۔ آپ ﷺ کے خطاب میں اس قدر اثر انگیزی پائی جاتی تھی کہ سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ یہ اسی حسن کلام کا اثر تھا کہ قلیل مدت میں عرب جیسی گمراہ اور جاہل قوم اسلام کی روشنی سے منور ہو گئی۔ معلم کے لیئے موثر تدریس کا طریقہ نبی اکرم ﷺ کی پیروی میں ہی پوشیدہ ہے۔ جنہوں نے افراد کی تربیت بندگیٔ الٰہی کے اصول پر کی۔ آپ ﷺ کی تعلیم و تدریس سے کفر کے اندھیرے چھٹ گئے اور پورے عرب میں اسلام کا بول بالا ہوا۔

فصل دوم

تربیت اخلاق اور منہاج نبوی

فصل دوم:

تربیت اخلاق اور منہاج نبوی

تربیت اخلاق سے مراد انسان کی ایسی باطنی صلاحیتوں کو پرورش دینا ہے، جن سے پسندیدہ اخلاقی صفات، عادات وخصائل کا حصول ممکن ہو۔ انسان نیک اعمال کی طرف راغب ہو اور برائی سے اجتناب کرے۔

معاشرے کی فلاح وبہبود کے لئے افراد ملت کی اخلاقی تربیت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ صالح معاشرہ کا قیام ہی اعلی اخلاقی قدروں کی بدولت ممکن ہے۔ اس کے لیئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو صاحب ایمان، اخلاق اور عمل صالح کے پیکر ہوں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنَهُمْ خُلُقًا))[1]

ترجمہ: مومنین میں کامل درجہ ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

ایک مومن کے کامل ایمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ اخلاق حسنہ سے متصف ہو۔ ایمان کی مضبوطی کے لیئے اچھے اخلاق کا ہونا ضروری ہے اور مضبوط ایمان ہی سے عبادات مقبول ہیں۔ اگر کوئی انسان اخلاق حسنہ کا مالک نہیں مگر عبادت گزار ہے تو اس کی عبادات اللہ کے نزدیک بے روح جسد کی طرح ہیں۔ ایمان، عبادات اور اخلاق تینوں کا بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی لیئے دنیا میں تمام مذاہب کی بنیاد اخلاق حسنہ پر رکھی گئی۔ تمام انبیاء نے اپنی امت کو اس کی تربیت دی، ان کی بعثت کا مقصد لوگوں کو برائیوں سے نکالنا، نیکی کی طرف مائل کرنا اور بہترین اخلاقی وروحانی تربیت ہے۔ انبیاء ورسل کی آخری کڑی نبی آخر الزمان ﷺ ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾[2]

ترجمہ: (اے محمد) آپ عظیم الشان اخلاق کریمہ سے متصف ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ان تمام صفات حسنہ سے متصف تھی جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ آپ ﷺ کتاب الہی کا عملی نمونہ تھے۔ قرآنی آیات کو انسانی پیکر میں ڈھالنے والی ذات آپ ﷺ کی تھی۔ آپ ﷺ علمی قرآن کی عملی تصویر ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے پورے نظام تعلیم وتربیت کی بنیاد قرآن مجید پر رکھی۔ اس ٹھوس بنیاد کے زیر اثر تربیت پانے والے افراد کے نہ صرف فکر ونظر میں اسلامی شعائر پائے جاتے ہیں بلکہ عملا بھی انہوں نے اسلامی قواعد وضوابط کو اپنی زندگیوں

---

(۱) السنن الکبری، کتاب عشرۃ النساء، باب لُطفُ الرَّجُلِ أَهْلَهُ، رقم الحدیث:۹۱۰۹، ۸/۲۵۶

(۲) سورۃ القلم:۶۸/۴

میں ڈھالا۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاق کریمہ ہی آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت وحقانیت کے لیئے کافی ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت کی غرض وغایت بھی اشرف المخلوقات کی تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس ہے۔ قولہ تعالی:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾[1]

ترجمہ: وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کریں اور ان کو پاکیزہ بنائیں اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں۔

اس آیت میں آپ ﷺ کی بعثت کے مقاصد بتائے گے ہیں کہ اللہ کی آیات کو پڑھ کر سنانا، لوگوں کو کفروشرک، برے عادات وخصائل سے پاک کرنا یعنی باطنی وظاہری پاکیزگی اور کتاب ودانش کی باتیں بتانا ہیں۔ آپ ﷺ اس دنیا میں اللہ کے بندوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے اور اخلاقی وروحانی تربیت کے لیئے مبعوث ہوئے ہیں۔ ارشاد گرامی ہے:

((إِنَّمَا بُعِثْتُ لأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلاَقِ))[2]

ترجمہ: میں اسی لیئے بھیجا گیاہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں۔

آپ ﷺ مکارم اخلاق کے جامع تھے، ایسے اخلاق کے مالک کہ جن میں فطرت انسانی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جلال اور جمال دونوں طرح کی صفات کا امتزاج پایا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کے اخلاق حمیدہ نے لوگوں کے دلوں کو ایسا مسخر کر لیا کہ عرب جیسی غیر منظم وغیر مہذب قوم تہذیب وتمدن سے آراستہ ہوگئی۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل لوگ بت پرستی کا شکار تھے، مختلف انواع کے بتوں کو الہ بنایاہوا تھااور بہت ساری معاشرتی و اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے۔ قتل وغارت، شراب نوشی، بغض، غرور وتکبر، لالچ، عداوت اور حسد جیسی برائیاں ان کی عادت اور جبلت کا حصہ بن چکی تھیں۔ خرافات وتوہمات کا رواج عام تھا۔ لڑکیوں کی پیدائش پر انہیں زندہ دفن کر دینا غیرت کا تقاضا ہوتا تھا۔ عورت ذات کے وجود کو باعث ننگ وعیب جانا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد، آپ ﷺ نے عرب لوگوں کو جاہلیت کے اندھیرے سے نکالا، دین اسلام کی روشنی سے منور کیااور تمام تر اخلاق رذیلہ کا انسداد کیا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کی تعلیم وتربیت اخلاق کے لیئے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ عرب جیسی جاہل قوم علم ودانش اور تہذیب وشائستگی کا پیکر بن گئی۔ ان میں سے چند اہم اقدامات کا ذکر حسب ذیل کیا جاتاہے۔

---

(۱) سورۃ الجمعہ: ۶۲/ ۲

(۲) سنن البیھقی الکبری، أبو بکر البیھقی، أحمد بن الحسین بن علی، (تحقیق: محمد عبد القادر عطا)، مکتبہ دار الباز، مکہ المکرمہ، ۱۹۹۴ء، کتاب الشھادات، باب بیان مکارم الأخلاق ومعالیھا، رقم الحدیث: ۲۰۵۷۱، ۱۰/ ۱۹۱

نصب العین کی درستگی:

کسی بھی انسان کی اخلاقی تربیت کے لیئے سب سے پہلے اس کی زندگی کے نصب العین کی درستگی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ انسان کی عقل، ارادہ، نفس اور جذبات وخواہشات سب اخلاقی نصب العین کے مطیع وماتحت ہوتے ہیں۔ تمام تر اخلاقی اوصاف اور اعمال نصب العین کی پیداوار ہوتے ہیں۔ انسان اپنے سوچ وارادہ سے اپنے مقصد کا تعین کرتا ہے کہ اس نے اپنی انفرادی جذبات وخواہشات پر معاشرتی مطالبات وضروریات کو کس قدر ترجیح دینی ہے یا اپنی خواہشات کی غلامی کرنی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کا مقصد ذاتی مفاد پر مبنی ہے تو اسکے اخلاقی اقدار میں پرستش بذات کا رنگ نظر آئے گا اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں بھی وہ اس بات کو مد نظر رکھتا ہے کہ دوسرا شخص میرے مفاد میں کس حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ذاتی مفاد پرست انسان دوسرے کو ایک آلہ کار یا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف جس شخص کا نصب العین ذاتی خواہشات واغراض سے ہٹ کر اجتماعی زندگی کی فلاح وبہبود سے وابستہ ہو تو ایسا شخص دوسرے لوگوں سے معاملات میں معاشرتی اقدار وغایات کو بھی مد نظر رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی مستقل ہستی سمجھتے ہوئے اخلاقی قدروں کا لحاظ رکھتا ہے۔

عصر حاضر میں دیکھا جائے تو اخلاقی نظام ہر قوم کے اندر پایا جاتا ہے۔ جو قومیں مذہبی تعلیمات کو اہمیت نہیں دیتی ان میں بھی اخلاقی بلندی پائی جاتی ہے مگر دین اسلام کے پیدا کردہ اخلاق اور قوم پرستی کے پیدا کردہ اخلاق میں فرق ہوتا ہے۔ جس کا سبب ان کے نصب العین ہیں۔ جیسا کہ قوم پرستانہ طرز اخلاق کا مقصد ایک مخصوص قوم کے مفاد کا تحفظ وبرتری تک محدود ہوتا ہے۔ دوسری اقوام کے مفادات سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی اور اگر کسی قوم کی ترقی ان کے لیئے باعث خطرہ ہو تو یہ اس کو بالکل نسیت ونابود کرنے کے در پر آجاتی ہے۔ ان کے نظام اخلاق کا پورا زور قوم کی مادی، سیاسی اور معاشی ترقی پر ہوتا ہے اس لیئے یہ ان عوامل کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جن سے قومی عظمت وترقی وابستہ ہوتی ہے اور ان اعمال کو قابل ملامت قرار نہیں دیا جاتا جو قومی ترقی میں خلل پیدا نہیں کرتے، خواہ وہ انسانی نقطہ نظر سے کتنے ہی بدترین کیوں نہ ہوں جیسا کہ زنا، ماں باپ کے حقوق کو پامال کرنا، شراب نوشی وغیرہ قومی اخلاق کی رو سے اتنا بڑا جرم نہیں کیونکہ ان سے قوم کے مفادات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس اگر دیکھا جائے تو مذہب اسلام تمام انسانیت کی خوشحالی، عزت واکرام اور اجتماعی تحفظ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ نے نسلی وقومی تعصبات کو ختم کیا۔ لوگوں کے اندر اخوت ومساوات کا جذبہ پیدا کیا۔ انفرادی اغراض ومفادات پر اجتماعی مفادات کو ترجیح دی۔ ہر اس عمل کو قابل مذمت قرار دیا جس سے شرف انسانیت پامال ہوتا ہو۔ قومی ترقی کی بجائے پوری انسانیت کی عظمت وبرتری، وقار آدمیت اور اخلاقی قدروں کی فرماں روائی کو پروان چڑھایا۔ آپ ﷺ نے عالمگیر انسانی معاشرے کو تشکیل دیا، جس میں تمام قوموں کے درست مقاصد، افکار اور اخلاق پر مبنی افراد شامل ہوں۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو اصل مقصد حیات سے باور کرایا۔ انسان کا زندگی گزارنے کا مقصد محض اپنے ذاتی اغراض ومفاد نہیں بلکہ تمام تر عالم انسانیت کا اکرام، خیر خواہی، فلاح وبہبود اور اجتماعی تحفظ ہے، اسی نصب العین سے رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہے۔ یہی وہ نصب العین ہے جو انسان کو خود بخود بغیر کسی خارجی دباؤ کے اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پیروی پر ابھارتا ہے۔ تہذیب النفس اور اپنے خواہشات وجذبات پر قادر بناتا ہے۔ اخلاقی قدروں کا صحیح اظہار درست نصب العین پر مبنی ہے اور درست نصب العین کے حصول کے لیئے تربیت نفس ضروری ہے۔

تربیت نفس:

اخلاقی اقدار کی اعلیٰ منازل کو تہہ کرنے کے لیئے نفس کا قابو پانا بہت ضروری ہے بلکہ کسی بھی اخلاقی عمل کی اولین شرط تربیت نفس ہے۔ نفس کی خواہشات کا اسیر انسان ہر اس اخلاقی نصب العین اور عمل کو قبول نہیں کرتا جس سے اس کی آزادی میں خلل پیدا ہو[1]۔ اخلاقی قدروں سے وہی شخص آراستہ ہو سکتا ہے جو اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خواہش کی غلامی کرنے والوں کو کفر وگمراہی کا سبب قرار دیتا ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [2]

ترجمہ: اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی نفس کی خواہشات کو ترجیح دینے والا انسان سیدھے راستے سے غافل ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے اخلاقی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیئے تربیت نفس کو لازمی قرار دیا اور اس کے لیئے تمام انسانوں کو اپنے جذبات پر قابو پانے کی تلقین کی۔ آپ ﷺ نے اپنی خواہشات پر قابو پانے کے لیئے عبادات کو احسن طریقے سے ادا کرنے پر زور دیا۔ ترک عبادت سے ہی انسان خواہشات کا غلام بنتا چلا جاتا ہے۔ نفس انسانی کی تربیت اخلاق کیے لیئے عبادت ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرنے سے انسان روحانی طور پر اس بات کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے کہ وہ مالک حقیقی کا غلام ہے اور اپنی تمناؤں، خواہشات وار اغراض کو اسی قادر ذات کے احکامات کے مطابق پابند کیئے ہوئے ہے۔ وہ خواہشات کی آزادی سے دست بردار ہوتا ہے اور اپنے نفس کو مذہبی نصب العین کے ماتحت کرتا ہے۔ قولہ تعالیٰ:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ [3]

---

(۱) اسلام کا نظریہ اخلاق، مظہر الدین صدیقی، مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ص:۴۳-۴۸

(۲) سورۃ ص :۳۸/۲۶

(۳) سورہ مریم:۱۹/۵۹

ترجمہ: پھر ان کے بعد ایسے اطاعت نہ کرنے والے پیدا ہوئے کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، سو ان کا نقصان ان کے آگے آئے گا۔

نماز ارکان اسلام میں سے اہم رکن ہے۔ اس سے انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے۔ جب انسان اس فرض کی ادائیگی سے غفلت برتتا ہے تو اس کا تعلق اللہ سے منقطع ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ خواہشات کی پیروی کرنے لگ جاتا ہے۔ ایسے انسان کے لیئے گمراہی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

دعوت وتبلیغ کا فریضہ:

اللہ تعالی نے انسان کی خلقت میں نیکی وبدی کی پہچان ودیعت کی ہوئی ہے، انسان فطرتا نیکی کو اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش کرتا ہے۔ ذات باری تعالی نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیئے اور روز قیامت اپنی حجت کو تمام کرنے کے لیئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ ان کی بعثت کا مقصد لوگوں کو دین الہی کی طرف بلانا اور ان کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اسی لڑی کا حصہ ہیں۔ جنہوں نے قوم کو حکمت ودانائی سے نیکی کے راستے پر چلنے کی دعوت دی اور برائی سے روکا تاکہ ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دیا جاسکے۔ قرآن مجید میں اس فرض قطعی کا ذکر صراحتا آیا ہے۔

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[1]

ترجمہ: اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے۔

اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض منصبی دین الہی کی طرف دعوت وتبلیغ کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فریضے کو باخوبی انجام دیا۔ لوگوں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے، دلائل وبراہین پر مبنی، نرمی ودل سوزی کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں دعوت دیتے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ زبان سے دعوت کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرز عمل بھی دوسروں کی تبلیغ کا ذریعہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حسن سیرت سے لوگوں میں اخلاقی قدروں کو پروان چڑھایا، لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات وکردار سے متاثر ہوتے اور دین اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ اسلام پورے عرب میں پھیل گیا۔

---

(۱) سورۃ النحل:۱۶/۱۲۵

آپ ﷺ نے اپنی قولی اور عملی دعوت کے ذریعے اجتماعی واخلاقی شعور بیدار کیا اور اہل عرب کو ایک شائستہ اور مہذب قوم بنایا۔ بنی نوع انسان کو ایسے نظام زندگی کی تعلیم وتربیت دی، جو اعلی اخلاقی اقدار کا محور ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اتَّقِ اللَّهِ حَيْثُمَا كُنْتَ وَأَتْبِعْ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ))(۱)

ترجمہ: تو جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈر اور برائی کے پیچھے نیکی کر۔ نیکی برائی کو مٹادے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔

آپ ﷺ کی بعثت کی ذمہ داری (دعوت وتبلیغ)، کسی خاص قوم سے وابستہ نہ تھی بلکہ پوری دنیا کے لیئے عام تھی۔ آپ ﷺ جامع اور عالمگیر پیغام حق لے کر آئے۔ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیئے اللہ تعالی نے ایسی امت عطا کی کہ جس کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نبی آخر الزمان ﷺ کی طرح دین حق کی تبلیغ دوسروں کو کریں۔ قولہ تعالی:

(كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ)(۲)

ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیئے برپا کیئے گئے ہو، نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

نبی اکرم ﷺ کے بعد دوسروں کو پیغام حق پہنچانے کا فریضہ منصبی قیامت تک آپ ﷺ کی امت پر عائد کیا گیا۔ اسی بناء پر آپ ﷺ کی امت کو "خیر امت" کا لقب دیا گیا۔ امت مسلمہ تمام امتوں سے بہترین امت ہے کیونکہ یہ نیکی کا حکم دیتی اور برائی سے روکتی ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو اسے باقی تمام امتوں پر فضیلت دیئے ہوئے ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیئے یہ ذمہ داری اب قیامت تک آپ ﷺ کی امت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے قول وعمل سے لوگوں کو برائی سے روکیں اور نیکی کا راستہ دکھائیں۔ کتنا بھی فتنوں کا زور کیوں نہ ہو اس امت میں ایک جماعت ایسی ہمیشہ باقی رہے گی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو اپنے علم وعمل سے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ معاشرے سے برائی کا خاتمہ کرے گی، خیر وبھلائی کی راہیں ہموار کرے گی اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت وکردار کو لوگوں کی زندگیوں میں ڈھالنے کے لیئے دعوت وتبلیغ کا کام ہمیشہ جاری رکھے گی۔

عصر حاضر میں امت مسلمہ اپنے فریضہ منصبی کو بھولے ہوئے ہے، ذاتی اصلاح ونفع کی دوڑ میں دوسرے انسانوں کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ جبکہ دین اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ذاتی اصلاح اور منفعت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ خود

---

(۱) سنن الترمذی، كِتَاب الْبِرِّ وَالصِّلَة عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَاب مَا جَاءَ فِي مُعَاشَرَةِ النَّاسِ، رقم الحدیث: ۱۹۱۰، ۷/ ۲۶۲

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۱۰

صالح بن کر دوسروں کو باکمال بنانے کی تعلیمات دیتا ہے۔ پہلے خود علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا، اخلاق میں اعتدال پیدا کرنا اور پھر دوسروں کی اصلاح کرنا۔ دوسروں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ ادا کرنا۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو دعوت وتبلیغ کے ذریعے ادا کیا جاسکتا ہے۔ ایک مسلمان خود کتنا ہی نیک وصالح بن جائے، اخلاق وکردار کے اعلی مقام تک پہنچ جائے لیکن جب تک کہ وہ دوسروں کو راہ حق کا پیغام نہیں پہنچائے گا بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ اگر مسلمان اس فریضے کو ادا نہیں کرتے تو اللہ ان کو خیر امت کے منصب سے محروم کر دے گا اور ساری دنیا کے وبال کا سران پر آئے گا۔

تدریج:

انسان فطری طور پر آہستگی، نرم مزاجی اور شائستگی کو پسند کرتا ہے اور یہی طریقہ تعلیم وتدریس اس کے لیئے سود مند ثابت ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے بھی انہی فطری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے عرب جیسی بد اخلاق اور غیر مہذب قوم کو اعلی اخلاقی قدروں کا پیکر بنایا۔ آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت سے ایسا اخلاقی انقلاب برپا ہوا کہ مسلمانوں کے سیرت وکردار سے متاثر ہوتے ہوئے لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی درج ذیل تصریح نہایت مناسب اور دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

((إِنَّمَا نَزَلَ أَوَّلَ مَا نَزَلَ مِنْهُ سُورَةٌ مِنَ الْمُفَصَّلِ فِيهَا ذِكْرُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الْإِسْلَامِ نَزَلَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ لَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ لَقَالُوا لَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا وَلَوْ نَزَلَ لَا تَزْنُوا لَقَالُوا لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا))[1]

ترجمہ: پہلے مفصل (سورہ حجرات سے لے کر آخر قرآن تک) کی وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت ودوزخ (ترغیب وترہیب) کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگ اسلام پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئے تو اس کے بعد حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر شراب نہ پینے کا حکم اول ہی دن نازل ہوجاتا تو لوگ یہ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اسی طرح ابتداء ہی میں زنا چھوڑنے کا حکم نازل ہوتا تو لوگ کہہ اٹھتے کہ ہم اس سے ہرگز باز نہ آئیں گے۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے تدریجی طریقہ کار ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے بھی مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیئے پہلے لوگوں کے ایمان وعقیدے کی اصلاح پر زور دیا۔ عقائد کی درستگی ہی اعمال کی اصلاح کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر کامل ایمان اور فکر آخرت ہی انسان کو بیش تر اخلاقی برائیوں سے روکے رکھتی ہے۔ آخرت میں جواب دہی کا احساس انسان کے ضمیر کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ انسان بدی سے رکتا

---

(۱) الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، رقم الحدیث: ۴۷۰۷، ۴/ ۱۹۱۰

اور نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ چنانچہ اصلاح اعمال عقائد کی درستگی اور پختگی پر منحصر ہے۔ اس کے بعد ہی مسلمان احکامات الٰہی کو دل سے قبول کرتا اور عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

اہل عرب بیشتر اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے، شراب نوشی، زناکاری، لوٹ مار وغیرہ عام تھا۔ مسلمانوں کی زندگیوں کو اخلاق فاضلہ سے منور کرنے کے لیئے آپ ﷺ نے آہستہ آہستہ تربیتی اقدامات کیئے اور یہی حکم الٰہی بھی ہے۔ جس کی مثال ہمیں حرمت شراب میں ملتی ہے کہ کس حکمت کے ساتھ اللہ تعالی نے مسلمانوں کو اس سے دور کیا۔ شراب نوشی سے متعلق آیات وارد ہوئیں، جن میں سب سے پہلے اسے اثم کبیر (گناہ کبیرہ) قرار دیا گیا پھر دوران نماز اس سے دور رہنے کا حکم دیا گیا اور پھر تیسرے حکم الٰہی میں شراب کو صراحتاً حرام قرار دیا گیا۔ یہی وہ طریقہ ہے کہ جس کو مسلمانوں کی اخلاقی وروحانی تربیت کے لیئے میں ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔

عہد نبوی ﷺ کا نظام تعلیم اور تربیت اخلاق:

نبی اکرم ﷺ نے حصول علم کو ہر مسلمان مرد وعورت کے لیئے فرض قرار دیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ))[1]

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد وعورت) پر فرض ہے۔

علم حاصل کرنا ہر مسلمان چاہے وہ مرد ہے یا عورت ان کے لیئے لازمی قرار دیا گیا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو ہر جگہ اور ہر طریقے سے علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ علم کو مومن کی گمشدہ میراث قرار دیا اور بہت سارے فضائل ذکر کیئے تاکہ لوگ علم حاصل کرنے کے لیئے ہمہ وقت کوشاں رہیں اور پھر اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اشاعت علم کی بہت زیادہ تلقین کی تاکہ علم تک ہر شخص کی رسائی ممکن ہو۔ آپ ﷺ نے فروغ تعلیم کے لیئے بہت سارے عملی اقدامات کیئے۔ جیسا کہ اسیران جنگ بدر میں جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ نظام تعلیم کو محض مدارس تک نہ محدود رکھا گیا بلکہ ہر مسجد میں بھی طلباء کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ عرب کا جب بھی کوئی قبیلہ اسلام قبول کرتا تو آپ ﷺ اس کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلم بنا کر بھیجتے۔ خواتین کی تعلیم پر بھی آپ ﷺ خصوصی زور دیتے اور ان کے لیئے آپ ﷺ نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر رکھا تھا جس میں ان کے حقوق وفرائض سے آگاہی دیتے تھے اور دیگر مسائل بیان کرتے تھے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، أبواب السنہ، بَابُ فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ، رقم الحدیث: ۲۲۴، ۱/۱۵۱

تعلیم کے حصول کے لیئے مسجد نبوی کے بلند چبوترے پر صفہ کی درسگاہ بنائی گئی جسے اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ یا یونیورسٹی کہا جاسکتا ہے۔یہاں مقامی اور دیگر علاقوں سے آئے ہوئے طلباء قیام کرتے تھے۔ آپ ﷺ خود ان کی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔عہد نبوی ﷺ کی درسگاہوں میں رائج تعلیمی نظام کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر درج ذیل کیا جاتا ہے، جن سے تعلیم کے ذریعے طلباء کیا خلاقی تربیت کے لیئے عملی اقدامات کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱. درسگاہ صفہ مسلمانوں کی تعلیم اور اخلاقی وروحانی تربیت کا مثالی مدرسہ ہے۔اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ معلم اور متعلم کے درمیان ۲۴ گھنٹے کی رفاقت تھی، طلباء کو جن اخلاقی اقدار اور سیرت وکردار کے سانچے میں ڈھلنے کی تلقین کی جاتی تھی ان کا عملی مظہر ان کی نگاہوں کے ہر وقت سامنے تھا۔ وہ قرآن میں جو کچھ پڑھتے تھے اس کی عملی صورت اسوہ حسنہ کی صورت میں پالیتے۔اس طرح الفاظ اور معانی میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہتا۔

۲. صفہ کے مدرسے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے حصول علم کو ہر شخص کے لیئے سہل بنادیا تھا۔مدرسے میں مکمل طور پر مساوات کو قائم کیا گیا۔اس پر کسی مخصوص اونچے طبقے یا گروہ کی اجارہ داری نہ رہی۔ بلکہ اس سے فیض یاب ہونے والے افراد جن کی تعداد ۶۰،۷۰ کے قریب تھی،ان میں اکثر نادار، غرباء اور بے سہارا لوگ تھے مگر وہ میدان علم میں بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ اس طرح سے حصول علم میں امیر وغریب کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور شخص کے لیئے علم تک رسائی ممکن ہوئی۔

۳. درسگاہ صفہ میں امیر وغریب سب کے لیئے تعلیم کو بلاقیمت عام کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ غریبوں کی پناہ گاہ اور معاشرے میں باوقار مقام دینے کے لیئے خوشحال افراد معاشرہ سے کفالت کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ناظم مالیات تھے جو عطیات کے ذریعے سے مصارف پورے کرتے تھے۔مدرسہ صفہ کے علاوہ ایک اودرسگاہ ر دارالقراء اور مدینہ منورہ میں ۹ مساجد تھیں جو درسگاہوں کا کام دیتی تھیں۔ان تمام درسگاہوں میں مساوی ،یکساں نصاب اور مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ حصول تعلیم کے لیئے کسی فیس کی ادائیگی نہ تھی۔ مدارس کے اخراجات چلانے کے لیئے مسلم معاشرے کے افراد مل کر اس کار خیر میں صدقات ،عطیات اور ہدیے کی صورت میں حصہ لیتے۔ہر پیشے سے منسلک فرد چاہے وہ بڑھئی ہو یا کسان ،مزدور ہو یا تیلی ،اپنی اپنی مہارت کے تحت درسگاہوں کے کام مفت سرانجام دیتے تھے۔

۴. عہد نبوی ﷺ میں رائج خود کفیل نظام تعلیم کو اظہار رائے، آزادانہ علمی تحقیق اور حریت فکر کے حقوق حاصل تھے۔ مدرسے پر کوئی اپنا تسلط قائم نہ کر سکتا تھا۔ اساتذہ کسی کے ملازمین نہ تھے بلکہ وہ بادشاہوں سے زیادہ قابل احترام تھے۔ اسی طرح طلباء کو بھی حق گوئی اور اظہار رائے کا پورا حق حاصل تھا[۱]۔

۵. اس نظام تعلیم کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ درسگاہوں کے اندر طلباء کو جن تعلیمات سے متعارف کرایا جاتا تھا معاشرہ اس کی عملی تصویر تھا۔ جن چیزوں کو مدرسے میں بطور معروف پڑھایا جاتا وہی معاشرے میں بھی معروف نظر آتی اور جس چیز کو مدارس میں منکر ٹھہرایا جاتا معاشرے میں بھی اس کو قابل نفرت جانا جاتا یعنی مدارس اور معاشرے میں کوئی تضاد نہ پایا جاتا۔

۶. نظام تعلیم اعلی ترین اخلاقی بنیادوں ایثار، ہمدردی، مساوات، اخوت، عدل وانصاف، سچائی، تعاون اور نیکی جیسی صفات پر استوار تھا کہ جن سے نصف صدی کے اندر ایسا اخلاقی انقلابی برپا ہوا کہ دنیا جنت کا نمونہ بن گئی اور لوگوں کو امن وسکون کی لذت نصیب ہوئی۔

۷. آپ ﷺ کے نظام تعلیم نے علم کو نسلی اور گروہی تعصبات سے پاک کرتے ہوئے ایک وحدت قرار دیا گیا۔ اس میں دینی اور دنیاوی علوم کی کوئی حد بندی نہ تھی بلکہ دنیا بھر کے علوم کے دروازے مسلمانوں پر کھولے گئے۔ کیمیا، فلکیات، ریاضی، منطق، ادب، فلسفہ اور ادب وغیرہ سب دین اسلام کا حصہ بنیں۔ مسلمانوں نے مختلف زبانیں فارسی، رومی، فرانسیسی، اور یونانی وغیرہ سیکھیں اور پھر انہیں عربی زبان میں منتقل کیا اور ان زبانوں کو اپنے علوم کے خزانوں سے فیض یاب کیا۔

اس دور کا المیہ یہ ہے کہ دینی اور دنیاوی علوم کی علحیدگی نے مدرسے کی وحدت اور مساوات کو ختم کر دیا ہے اور اسے دین اور دنیا کی بنیاد پر تقسیم کر دیا ہے۔ پھر دنیاوی تعلیم پر قائم مدارس نے طبقاتی نظام قائم کیا۔ امراء، متوسط اور غرباء کے لیئے الگ الگ معیار کے مدارس قائم کیئے گئے اور الگ نصاب مقرر کیا گیا۔ جس نے نہ صرف ملی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بلکہ علم کی اصل روح کو ذائل کر دیا اور حصول علم کی صلاحیت واہلیت کو معاشی حیثیت سے منسلک کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ افراد ملت تعلیم حاصل کرنے کے باوجود سیرت وکردار کے حوالے سے پسماندہ ہوتے چلے گئے اور ایک دوسرے کے درمیان مفادات کا سلسلہ ابھر آیا۔ پوری قوم تعلیم کے جداگانہ نظام کی بناء پر انتشار کا شکار ہو گئی۔

---

(۱) اخلاقیات نبوی (مقالات مذاکرہ ملی اخلاقیات نبوی)، محمد سعید، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۴۱-۳۴۴

فصل سوم

نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کا فروغ اسوہ سیرت کی روشنی میں

فصل سوم:

نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کا فروغ اسوہ سیرت کی روشنی میں

دین اسلام کا تصور تربیت بہت وسیع اور جامع ہے۔ اسلام صرف دینداری اختیار کرنے اور نماز روزہ کی پابندی کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ انسان کو زندگی میں پیش آنے والے ہر مسئلے پر ایک مخصوص رویہ رکھتا ہے۔ انسان کو اعلیٰ اخلاقی قدروں اور رویات سے مزین کرتا ہے۔ عصر حاضر کا نظام تعلیم بھی انہیں نظریات اور تربیت کا حامل ہونا چاہیئے۔ وہ انسانوں کی زندگی کو تصور اسلام میں ڈھالے اوران کے سیرت و کردار کو انہی نظریات کا پابند بنائے۔ جبکہ عالم اسلام کے تعلیمی اداروں میں اسلامی نظام تعلیم وتربیت کی کمی نظر آتی ہے۔ موجودہ دور کے تعلیمی اداروں میں دین اسلام کی بجائے مغربی نظام تعلیم کی پیروی نظر آتی ہے اور تربیت تو سرے سے مفقود ہے۔ تعلیم محض کچھ معلومات طالب علموں کو فراہم کرنے کا نام نہیں بلکہ انسان کے سیرت و کردار، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی کو سنوارنے کا نام ہے۔ نظریہ اسلام کے تحت تعلیم انسانی زندگی کا ایک جزو ہے، جس کے ذریعے ایسا عبادت گزار انسان تیار کیا جاتا ہے جس کا جینا، مرنا سب کچھ اللہ کی رضا کے حصول کے لیئے ہوتا ہے۔ تعلیم ایسی ہو جس سے دین اسلام کے تقاضوں کو سمجھنے اور اسے مکمل طور پر زندگیوں میں ڈھالنے کی تربیت وترغیب دی جائے۔ موجودہ دور میں نظریہ تعلیم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ تعلیمی نظام کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے جس سے نوجوانوں کی دینی واخلاقی تربیت کی جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے علوم ومعارف جو کہ دنیاوی زندگی سے منسلک ہیں اور معاشرتی وتمدنی ترقی کے لیئے ضروری ہیں، ان کی تدریس کا بھی باقاعدہ انتظام ہونا چاہیئے کیونکہ اسلام دین اور دنیا میں تفریق نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں تعلیمی درسگاہوں میں قرآن وحدیث کی تدریس کے ساتھ سوشل سائنسز اور نیچرل سائنسز بھی پڑھائی جاتی تھی۔ البتہ نظریہ تدریس اور طریقہ تدریس اسلامی تصور اور اصولوں پر منحصر تھا۔ اس لحاظ سے موجودہ تعلیمی نظام میں چند اصلاحات اور تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ جس کے لیئے درج ذیل تجاویز دی جاتی ہیں:

(ا) تعلیم کی اسلامائزیشن سے مراد نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید یا اسلام کے نظریات اور تقاضوں کے مطابق موجودہ نظام تعلیم کو ڈھالنا ہے۔ پاکستان کو معرض وجود میں اسلام ہی کے نام پر لایا گیا۔ اس مملکت کے قیام کا مقصد اسلام نظام زندگی اور تہذیب وتمدن کو قائم کرنا ہے۔ اس لیئے اس ملک میں اسلامی نظام تعلیم ہی رائج ہونا چاہیئے۔ تعلیم کے ذریعے سے ہی پاکستان کے موجودہ معاشرے کی حالت کو بدلا جاسکتا ہے، جس کی صورت حال یہ ہے کہ اس میں زیادہ نیم اسلامی اور غیر اسلامی روایات پائی جاتی ہیں۔ نہ گھر کے اندر دینی تربیت کا ماحول ہے نہ معاشرے میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ تعلیمی اداروں میں دینی علوم کی نسبت دوسرے علوم ومعارف کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ نظام تعلیم کو اسلامیانا رخ دینے کے لیئے صرف

اسلامیات کا پیریڈ نظام الاوقات میں شامل کر دیا جاتا ہے جو کہ ناکافی ہے۔ ایک طرف دنیوی علوم اس طریقے سے پڑھائے جاتے ہیں کہ طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ سارا کارخانہ زندگی بے خدا ہے اور خدا کے بغیر ہی چل رہا ہے اور دوسری طرف اسلامیات کے پیریڈ میں یہ درس دیا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے جو خالق کائنات ہے۔ اس طرح کے طریقہ تعلیم سے طالب علم ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے اور اس سے کس طرح سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس میں اسلامی کریکٹر پیدا ہو۔ محض اسلامیات کا پیریڈ ڈال دیا جائے اور باقی علوم و معارف کے پڑھانے کا انداز وہی رہے اور تعلیمی ڈھانچے میں اسلامی روح مفقود ہو تو اسلامی نظام تعلیم کے تقاضے نہیں پورے ہوتے۔ جیسا کہ اسلامیات کے پیریڈ میں تو پڑھایا جائے گا خالق حقیقی ذات باری تعالی ہے۔ مگر دیگر سائنسی علوم طبعی قوانین اور نیچر کو اس قدر اٹل قرار دیا جاتا ہے کہ خدا بھی ان کو بدلنے کا قادر نہیں ہوتا۔ ایسے طریقہ تدریس سے طلباء کا ذہن تضاد کا شکار ہوتا ہے۔ ایسا نظام تعلیم جو دو بالکل مختلف عناصر پر مشتمل ہو، اس سے فساد ذہنی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

طالب علم کو اسلامیات کے پیریڈ میں چند آیات واحادیث رٹا دینا اور دینی عبادات واحکامات کا تعارف کرانا، موجودہ معاشرے کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہی طالب علم ان اسباق کو پڑھ کر جب باہر نکلتا ہے تو اسے عملی زندگی میں سب کچھ غیر حقیقی نظر آتا ہے اور اسلام کے احکامات و قوانین ناقابل عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے تعلیمی نظام اور معاشرے میں ایک تفاوت نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں تعلیمی نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اسلمی نظام تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ جس دائرہ علم میں بھی کام کر رہے ہوں چاہے اس کا تعلق قرآن، حدیث یا فقہ سے ہو یا سائنس کیمیا یا فیزکس سے ہو جو فکر، ذہن، سوچ یا انداز پیدا ہو وہ اسلام سے مطابقت رکھتا ہو اور اسلامی طرز فکر کو ہر علم میں جاری وساری کیا جائے۔ اسلام معاشرے میں اپنے نظریات و تصورات کے مطابق کلی تبدیلی کا قائل ہے۔ البتہ ایسی تبدیلی کے لیئے ضروری ہے کہ معاشرے کے افراد بھی برضاورغبت اسے قبول کریں اور عمل کرنے کے لیئے آمادہ ہوں۔ جبکہ پاکستانی معاشرے کی کیفیت یہ ہے کہ حکمران اور عوام مذہب سے نظری اور جذباتی زابستگی کے باوجود اسلامی احکامات کا عملا نفاذ کرنے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں تدریج کا اصول اپنانا چاہیئے کیونکہ اچانک احکامات لاگو کرنے سے کبھی بھی مثبت نتائج رونما نہیں ہوتے۔ جب تک کہ افراد ان احکامات پر کے عملا نفاذ کا عزم وارادہ نہ رکھیں۔ افراد کے ذہن وسوچ کو تدریجا بدلا ضروری ہے۔ اچھی سوچ اور ارادہ ہی اچھے عمل کا پیش خیمہ ہے۔ تعلیم کے ذریعے سے انسان کے ذہن و افکار کو اسلامی نظریات و تصورات کے مطابق بدلا جاسکتا ہے۔ جس کے لیئے ایک نئے تعلیمی ماڈل کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعے سے طلباء میں دینی حس، محبت اور شعور بیدار ہو، پھر چاہے کوئی بھی علم پڑھا جائے سب اسلامی نظریے کے حامل ہوں گے۔ آج بھی جہاں دینی تعلیمات کی ضرورت ہے وہاں جدید علوم و معارف کی اہمیت بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ لہذا ایک ایسا تعلیمی ماڈل تشکیل دیا جانا چاہیئے جو ان دونوں کا

امتزاج ہو، جس میں دیوبند اور علی گڑھ دونوں کے روپ نظر آئیں۔ اس نئے تعلیمی ماڈل کی فکری بنیادیں درج ذیل ہونی چاہئیں:

۱. نظام تعلیم ایک ہونا چاہیئے اس میں دین اور دنیا کی ثنویت نہ ہو۔ دینی تعلیم اس طرح سے دی جائے کہ دنیا کہ تمام معاملات کو دین کے نقطہ نظر سے سمجھیں اور چلائیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید علوم کا تعارفی و تنقیدی مطالعہ بھی اس کا حصہ ہو اور اس سے فارغ التحصیل طالب علم جدید دور کے تقاضوں سے باخبر اور چیلنجز سے عہدہ بر آ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح جدید علوم کی تعلیم اسلامی تناظر میں دی جائے اور اسلامی تعلیمات بھی اس کا حصہ ہوں۔ دونوں طرح کی تعلیم میں نظریہ تعلیم اور طریقہ تدریس اسلامی تصورات وافکار کا حامل ہونا چاہیئے۔

۲. نظام تعلیم میں اسلامی تربیت اور تزکیۂ نفس کا عنصر کسی طور پر بھی کم نہ ہو۔ اسلامی فکر و تہذیب کو اجاگر کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کے عملا نفاذ کو یقینی بنایا جائے اور اس پر امت کا تفاخر بحال کیا جائے۔ مغربی فکر و تہذیب کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور اس کی بالادستی کو رد کیا جائے۔

۳. تعلیم کے ذریعے نوجوانوں میں تنقیدی و تخلیقی صلاحیت پیدا کی جائے۔ ذہنی لحاظ سے طلباء کو اس لائق بنائیں کہ وہ محض معلومات حاصل کرنے تک نہ رہ جائیں بلکہ انہیں اس لائق بنائے کہ وہ صحیح معنوں میں سوچیں، سمجھیں اور پرکھیں۔ ان میں تنقیدی نگاہ اور ذوق نظر پیدا ہو۔ اور پھر عملی حیثیت سے انہیں ہنر مند ر فراہم کی جائے تا کہ زندگی کی کشمکش میں صاحب روزگار ہو سکیں۔

۴. اس نئے نظام تعلیم میں تشکیل سیرت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ تعلیم کے ذریعے نوجوان کے اندر اسلامی طرز فکر اور اسلامی کریکٹر پیدا ہو پھر چاہے وہ انجینئر بنے، ڈاکٹر بنے یا سائنسدان۔ وہ اسلامی تناظر میں سوچے اور اسلامی جاری وساری کرے[1]۔

یہ تعلیمی ماڈل سکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک ایک نمونے کے طور پر ہونا چاہیئے۔ اس کے لیئے نیا نصاب بنانا ہو گا، اساتذہ کی تربیت کے لیئے نئے پروگرام متعین کرنا ہوں گے اور طلباء کی تعلیم کے لیئے نئے تجربات اور ڈھنگ وضع کرنا ہوں گے۔ چنانچہ اس کا قیام پرائیوٹ سیکٹر میں ہونا چاہیئے جو ملت کو بھی اس کے لیئے متحرک و منظم کریں اور تعلیمی انتظامیہ تک بھی اپنا پیغام پہنچائیں۔ تعلیمی اداروں سے رابطے قائم کریں، ان کے ساتھ مل کر عملی اصلاحی اقدامات کے لیئے ایک تنظیمی نیٹ ورک قائم کریں۔ اس سلسلے میں تین شعبے قائم کرنے چاہیئے ایک جو سکولوں کی سطح پر کام کرے، دوسرا اعلی تعلیمی سطح اور تیسرا دینی مدارس سے مل کر کام کرے۔ یہ تینوں شعبہ جات مل کر نیا نصاب مرتب کرنے میں، تربیت اساتذہ اور طلباء کے

---

(۱) نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید، ص:۳۴-۴۰

تربیتی اقدامات کے لیئے ایک دوسرے کی اعانت کر سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک ایسا تعلیمی ماڈل تیار ہو گا جو دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیمات کا حسین امتزاج اور تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی حامل ہو۔ اس نئے تعلیمی ماڈل کے قیام کے بعد شرح خواندگی کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر تعلیمی انتظامیہ اپنا پیغام اور تنظیم ہر قصبے یا گاؤں میں پہنچائے اور وہاں ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ جس کے ارکان ریٹائرڈ استاد، بے روزگار پڑھے لکھے افراد اور سول یا فوجی افراد بھی ہو سکتے ہیں جو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ یہ سب مل کر ہر قصبے میں موجود مسجد سکول چلا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر گاؤں میں کھاتے پیتے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خیر کے کاموں میں مالی اعانت کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہر قصبے یا گاؤں میں عوامی تعلیمی کمیٹیاں قائم کرنے سے شرح خواندگی بڑھ سکتی ہے، لوگ اسلامی طرز حیات سے روشناس ہو سکتے ہیں اور معاشرتی و تمدنی تقاضوں کو بھی پورا کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ایک بار یہ نیا اسلامی تعلیمی ماڈل کامیابی سے کام کرنے لگے اور اس کے عمدہ نتائج سامنے آنے لگیں تو لوگ خود بخود اس کی پیروی کریں گے۔

(ب) نصاب تعلیم میں ترامیم: یہ بات سب پر عیاں ہے کہ عصر حاضر میں تعلیمی ادارے زیادہ تر مغربی کلچر کے خادم ہیں۔ ایسی صورت میں دینیات کے مضمون کو زیادہ طاقتور کر دیا جائے اور باقی تمام شعبوں میں پوری مغربیت برقرار رہے تو اس سے بھی اسلامی نظام تعلیم کا نفاذ ممکن نہیں اور معاشرہ مغربی تہذیب و تمدن کا دلدادہ رہے گا۔ اسلامی تعلیم اور دنیوی تعلیم کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر کے ایک ہی نظام تعلیم میں یکجا کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ اسلام ایسا مذہب نہیں جو دنیا کو دنیاوالوں کے لیئے چھوڑ کر محض اعتقادات اور اخلاقیات کے دائرے تک محدود رہے بلکہ یہ ایسا مذہب ہے جو دنیا میں رہ کر اسلامی فکر و نظر کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لائحہ عمل سکھاتا ہے۔ انسان کی انفرادی، اجتماعی، معاشی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کو ایک خاص اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق ڈھالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو ایک جداگانہ حیثیت حاصل ہے اور قوم کا بقا اور تحفظ اسی پر منحصر ہے۔ پس اس حال میں نصاب تعلیم میں اسلامی دینیات کا بحیثیت ایک جداگانہ نصاب کے شمول بے معنی ہے اگر اس کا دنیوی علم و عمل سے کوئی رابطہ باقی نہیں۔ چنانچہ نصاب تعلیم میں دین اسلام کے نصاب کو اس طرح سے اتارنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کا روح رواں، فکر و شعور اور احساس و ادراک بن جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزاء کو بھی اپنے اندر جذب کر لے۔ اس اسلامی تخیل کے عملا نفاذ کے لیئے نصاب تعلیم میں درج ذیل ترامیم کرنے کی ضرورت ہے:

۱) اعلی تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔ اسلام کے ماخذ اصلیہ تک پہنچنے کے لیئے عربی زبان ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ اسلام میں بصیرت حاصل کرنے کے لیئے تعلیم یافتہ طبقے کا قرآن و سنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔ وگرنہ مسلمان ہمیشہ شارحین اور مترجمین کے محتاج

رہیں گے اور اسلام کے حقائق سے صحیح معنوں میں روشناس نہ ہو سکیں گے۔یہی وجہ ہے کہ آج جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلام کی پیچیدگیوں اور مسائل سے ناآشنا ہیں اوراسلامی مسائل میں بہت ساری غلطیاں کر رہے ہیں کیونکہ انہیں قرآن کی زبان پر عبور حاصل نہیں۔ موجودہ دور میں اگر اسلام کی نمائندگی ایسے مسلمان کرتے رہے جو خود اسلامی تعلیمات تک رسائی حاصل کرنے کے لیئے دوسروں کے محتاج ہیں، دین اسلام کے احکامات سے ناواقف ہیں اور مغربی معاشرت واخلاق اور قانون سازی پر اعتقاد رکھتے ہیں تو وہ آئندہ آنے والی نسلوں کو اسلامی طرز حیات سے دور کرتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ عربی زبان کا مسئلہ محض ایک زبان کا مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق اسلامی تعلیمی نظام کے اساسیات سے ہے، جس کے لیئے ہر حال میں نصاب تعلیم میں جگہ نکالنی ہو گی۔ عربی زبان سکھانے کے لیئے قدیم طرز تدریس کی بجائے جدید آسان طریقے اختیار کیئے جائیں تاکہ طالب علموں کو اس کے فہم وادراک میں مشکل نہ ہوں۔ اس کے لیئے ایسی کمیٹی بنائی جائے جس میں شامل ہونے والے افراد عربی زبان کے جدید علمی و عملی طریقوں پر مہارت رکھتے ہوں۔ ان کے باہمی مشاورت سے ایسا کورس تجویز کیا جائے جس میں قرآن ہی کو عربی سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح قرآن سیکھنے کے لیئے طلباء کو الگ وقت بھی نہیں نکالنا پڑے گا اور ابتداء ہی سے طلباء کی قرآن سے انسیت پیدا ہو جائے گی۔

۲) علوم اسلامیہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون میں ہر فن کی مناسبت سے اسلامی تعلیمات کو پیوست کیا جائے۔ مغربی علوم وفنون سے اسلام کو کوئی دشمنی نہیں بلکہ جہاں تک حقائق علمیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے۔ دشمنی دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ اسلام اور مغربیت میں ہے۔ جہاں تک علوم کا تعلق ہے، اکثر علوم میں اہل مغرب اپنے مخصوص تصورات، نظریات اور مفروضات رکھتے ہیں جو کہ بذات خود ثابت شدہ نہیں بلکہ ان کے وجدانیات ہیں۔ انہیں وجدانیات کے سانچے میں حقائق علمیہ کو ڈھال کر وہ ایک مخصوص نظام بنا لیتے ہیں۔ اسلام کی دشمنی انہیں وجدانیات سے ہے جس کے سانچے میں وہ حقائق علمیہ کو ڈھال کر مرتب کرتے ہیں۔ ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں:

"آپ خود ہی تو اپنے نوجوان اور خالی الذہن طلبہ کے دماغوں میں مغرب کے اساسی تصورات بٹھاتے ہیں، ان کی نظر کا فوکس مغربی زاویہ نظر کے مطابق جماتے ہیں، مغربی نفروضات کو مسلمات بناتے ہیں، استدلال و استشہاد اور تحقیق و تفحیص کے لیئے صرف وہی ایک نقطہ آغاذ ان کو دیتے ہیں جو اہل مغرب نے اختیار کیا اور تمام علمی حقائق اور مسائل کو اسی طرز پر مرتب کر کے ان کے ذہن میں اتار دیتے ہیں، جس طرز پر اہل مغرب نے ان کو مرتب کیا ہے اس کے بعد آپ چاہتے ہیں کہ تنہا دینیات کا شعبہ انہیں مسلمان بنادے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ وہ شعبہ دینیات کیا

کر سکتا ہے جس میں مجرد تصورات ہوں حقائق علمیہ اور مسائل حیات پر ان تصورات کا انطباق نہ ہو بلکہ طلباء کے ذہن میں جملہ معلومات کی ترتیب ان تصورات کے بالکل برعکس ہو"[1]۔

ایک شعبہ میں اسلام اور باقی تمام شعبوں میں غیر اسلام رکھ دینے سے، دین اسلام چند اعتقادات اور مراسم تک محدود رہ جائے گا اور جو سائنسدان، ڈاکٹر، انجینئر پیدا ہوں گے وہ غیر اسلامی فکر و نظر کے حامل ہوں گے۔ اسلام کا اپنا ایک زاویہ نظر اور اساسی اصول ہیں جو قرآن سے ملتے ہیں، جب دین اسلام کے تناظر میں تمام علمی حقائق کو مرتب کیا جائے گا اور اسلام کی نظر سے کائنات اور زندگی کے مسائل کو حل کیا جائے گا تو ہی طالب علموں میں اسلامی اسپرٹ پیدا ہو سکے گی۔

۳) علوم اسلامیہ کے مخصوص شعبوں سے متعلقہ معلومات کو اس کے مماثل مغربی علم کے کورس میں داخل کیا جائے۔ مثلاً علم معاشیات میں اسلامی معاشیات کے قوانین وضوابط اور فقہ کے وہ حصے جن کا تعلق معاشی مسائل اور اسلامی تناظر میں ان کے حل سے ہے شامل کیئے جائیں۔ قانون میں اسلامی حدود و قوانین اور فقہ کے وہ مضامین جو معاملات سے متعلقہ ہیں شامل کیئے جائیں۔ اسی طرح فلسفہ میں اسلامی فاسفے کی تاریخ اور مسلمانوں کا فلسفیانہ افکار کے ارتقاء میں کردار شامل کیا جائے وغیرہ۔ اس کے لیئے ایسے فضلاء اور پروفیسروں کی خدمات حاصل کی جائیں جو جدید علوم میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں۔ وہ مغربی علوم کے حقائق کو اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھالیں۔ اس کے ساتھ معاشیات، سیاسیات، قانون، عمرانیات اور فلسفہ سے متعلق عربی، اردو اور انگریزی زبان میں جس قدر لٹریچر موجود ہے اس کی چھان بین کی جائے جو کتب درست ہیں انہیں اخذ کیا جائے اور جن کتب میں خذف واصلاح کی ضرورت ہے، انہیں ترامیم کرنے کے بعد کارآمد بنایا جائے۔

۴) علوم اسلامیہ پر جو مواد ملتا ہے وہ زیادہ تر قدیم طرز پر پایا جاتا ہے۔ خصوصا اصول فقہ، اصول عمران، اسلامی معاشیات اور حکمت قرآنیہ وغیرہ پر پایا جانے والا مواد عصر حاضر کے طلباء کے لیئے قابل فہم نہیں۔ قدیم کتابیں آج کے دور میں درس وتدریس کے لیئے کارآمد نہیں ہیں۔ انہیں جدید طرز پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ جو آسان فہم ہوں اور وضاحت کے ساتھ ہوں۔ اہل علم کو چاہیئے کہ علوم اسلامیہ پر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید کتابیں لکھیں۔

۵) کالج کے چار سالہ نصاب تعلیم میں عربیت، قرآن اور تعلیمات اسلامی کو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ انٹر میڈیٹ میں کالج میں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے اس کے بعد عربی زبان لازمی ہونی چاہیئے۔ اس کی تعلیم ایسی متوسط ہونی چاہیئے، جو طلباء میں اتنی استعداد پیدا کر دے کہ بی-اے میں پہنچ کر طلباء خود قرآن کو اس کی زبان میں سمجھنے

---

(۱) تعلیمات، ص:۴۰

لگیں۔ پڑھانے والے اتنے آزمودہ کار ہوں جو جدید طریقوں پر قرآن سمجھانے کی اہلیت رکھتے ہوں اور طلباء کی مشکلات اور شبہات کو رفع کر سکیں۔ اس طرح سے انٹر میڈیٹ کے دو سالوں میں قرآن سے متعلقہ چند مقدمات تاریخی حیثیت، فضیلت، انداذ بیان اور انقلاب انگیز تعلیم پر مبنی وغیرہ کی توضیح کی جائے اور بی-اے میں اس کی جزئی بحثوں اور مفسر تفسیر سے اجتناب کر کے صرف طلباء پر اس کا مفہوم واضح کرنے پر اکتفا کیا جائے تو دو سال میں قرآن کو مکمل کیا جاسکتا ہے۔ کالج کے نصاب میں تیسری اہم چیز طلباء کو اسلام کے اساسی تصورات سے آگاہ کرنا ہے۔ اسلام سیرت و کردار کی تشکیل کن بنیادوں پر کرتا ہے۔ معاشی، سیاسی، معاشرتی اور بین الاقوامی تعلقات کو کن اصولوں پر منظم کرتا ہے، حقوق و فرائض اور حدود اللہ وغیرہ۔ چنانچہ اسلام کے مبادی، اصولوں اور تہذیب کو شامل نصاب کرتے ہوئے، کالج کے چار سالہ مدارج تعلیمی پر تقسیم کیا جائے اور اس کے لیئے جدید طرز پر کتب مرتب کی جائیں جن کو کالج کے نصاب میں شامل کیا جاسکے۔

۶) سکول کے نصاب تعلیم میں عقائد، اخلاق اور احکام شریعہ سے متعلق دی جانے والی تعلیم میں چند تغیرات کی ضرورت ہے۔ ایمانیات سے متعلق تعلیم فطری وجدان اور عقلی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دی جائے۔ لطیف انداذ بیان اختیار کرتے ہوئے طلباء کو یہ سمجھایا جائے کہ ایمانیات سے متعلقہ صداقتوں کا کائنات اور انسان کی زندگی سے گہرا ربط ہے۔ طلباء کے کردار کو اعلی اخلاقی قدروں کا پیکر بنانے کے لیئے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت سے متعلقہ واقعات کو شامل نصاب کیا جائے۔ احکام شریعہ سے روشناس کرانے کے لیئے جزئیات سے ہٹ کر انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلقہ فقہی احکامات، جن کو جاننا ایک مسلمان کے لیئے ناگزیر ہے اسے نصاب میں شامل کیا جائے۔ دینیات کا موجودہ نصاب تعلیمی مدارج کے لحاظ سے ناکافی اور غیر مربوط ہے۔ اس میں قرآن مجید، سیرۃ النبی ﷺ، حدیث، فقہ واصول سے متعلقہ مواد کو ڈالتے ہوئے توسیع کی ضرورت ہے۔ دینیات کے علاوہ باقی مضامین میں اسلامی تناظر سے ردوبدل کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ سائنس کے مضمون کی تدریس کے دوران جب یہ کہا جاتا ہے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن ملتے ہیں تو کیمیائی عمل سے پانی وجود میں آتا ہے تو اس کی جگہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی نے ہائیڈروجن اور آکسیجن میں ایک خاص خصوصیت رکھی ہے کہ جب وہ آپس میں خاص تناسب سے ملتے ہیں تو پانی بنتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے پرائمری اور ہائی سکول کے نصاب میں نظر ثانی کی ضرورت ہے تا کہ مواد اسلامی روح ڈالی جاسکے۔

۷) پرائمری اور ہائی سکول کے طلباء کا تدریس قرآن مجید کے لیئے اس طرح سے انتظام کرنا چاہیئے کہ پرائمری سکول کی تعلیم مکمل کرنے تک بچہ قرآن کا ناظرہ مکمل کرلے اور ساتھ ساتھ چند فضائل والی سورتیں بھی حفظ کرلے۔ پانچویں کے بعد قرآن کے فہم اور ترجمے کے لیئے پاروں کو اس طرح سے تقسیم کیا جائے کہ دسویں تک قرآن کا ترجمہ مکمل

ہو جائے۔ قرآن کا آخری پارہ حفظ کرنا سب بچوں کے لیئے لازمی ہو البتہ پورا قرآن حفظ کرنا اختیاری ہو، البتہ پورا قرآن وہی ادارے حفظ کرا سکتے ہیں جو اقامتی ہوں یا ان کا دورانیہ تعلیم پورے دن پر مشتمل ہو۔ ذیل میں تدریس قرآن کا جدول دیا جاتا ہے[1]۔

کلاس	ناظرہ قرآن	حفظ قرآن	ترجمہ قرآن
پہلی	تصحیح مخارج اور قاعدہ	کلمے، نماز بمع ترجمہ	
دوسری	تیسواں پارہ	تیسواں پارہ آدھا	
تیسری	پہلے پانچ پارے	تیسواں پارہ مکمل	
چوتھی	پندرہ پارے	سورہ یسین، سورہ ملک	
پانچویں	انتیس پارے	منتخب مسنون دعائیں	
چھٹی	--	--	پہلا پارہ
ساتویں	--	--	تین پارے
آٹھویں	--	--	آٹھ پارے
نویں	--	--	اٹھارہ پارے
دسویں	--	--	تیس پارے

۸) موجودہ معاشرے میں لوگ تعلیمی ثنویت پر مبنی تعلیمی اداروں، جدید تعلیمی ادارے اور دینی مدارس کے رول ماڈل کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے سامنے عدم ثنویت پر مبنی کوئی تیسرا رول ماڈل موجود نہیں۔ ایک نئے تعلیمی رول ماڈل کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔ جس میں اسلامی فکر و عمل کی عظمت اور پیش آمدہ مسائل کے لیئے دین اسلام ہی واحد موزوں حل ہے اس پر مسلمانوں کا ایمان مستحکم کیا جائے۔ اس نئے تعلیمی ماڈل کے تحت علوم اسلامیہ کا مواد کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس کے لیئے ایک ہو گا۔ ثانوی تعلیم کے بعد گریجویشن اور ماسٹرز کے نصاب میں اساسی کتب قرآن، حدیث، فقہ، عربی وغیرہ کے علاوہ جدید کتب جن جدید مسائل اور عصری تقاضوں کو بھی

(۱) ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل، محمد امین، دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۹۳-۱۰۳

مد نظر رکھا گیا ہو شامل نصاب کیا جائے گا۔ سماجی علوم مثلاً فلسفہ، تاریخ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ میں پچاس فیصد مواد اسلامی پہلوؤں سے شامل کیا جائے گا۔ علوم اسلامیہ گروپ کے طلباء کو گریجویشن کے بعد دینیات کے علاوہ دیگر مضامین سیاسات، معاشیات وغیرہ اور زبانوں مثلاً عربی، اردو اور انگریزی وغیرہ میں ماسٹرز کی اجازت ہو گی۔

۹) ایسی مقامی یونیورسٹیاں جن میں علوم اسلامیہ کا شعبہ ہو انہیں مدارس کے گریجوایشن (عالیہ) اور ماسٹرز (عالمیہ) کے طلباء کے امتحانات لینے اور حکومت کی منظور شدہ ڈگری جاری کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس طرح سے مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کی تعلیم اور ڈگریوں کو بھی وہی مقام حاصل ہو گا جو باقی یونیورسٹیوں کے طلباء کو ہوتا ہے اور ملازمتوں کے حصول میں بھی ان کو مساوی حیثیت حاصل ہو گی۔ مزید برآں دینی مدارس سے ماسٹر ڈگری حاصل کرنے والے طلباء کسی اچھی یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے بھی اہل ہوں گے۔

(ج) تربیت اساتذہ: ہر طالب علم محض کتابوں سے علم کے حصول پر اکتفا نہیں کر سکتا بلکہ اس کو کسی استاد کی خدمت میں رہ کر براہ راست اس سے درس لینا ضروری ہے۔ ایک اچھا استاد ہی طلباء کی حصول علم اور عقائد واعمال میں بہتر رہنمائی کر سکتا ہے۔ استاد طلباء کی تعلیم کے ساتھ تعمیر سیرت و کردار میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے، وہ طلباء میں خیر کی استعداد کو پروان چڑھاتا ہے۔ استاد طلباء کے لیئے بہترین نمونہ ہوتا ہے طلباء اس کے انداز گفتگو، عادات واطوار، لباس اور رہن سہن کے طریقوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر طلباء کو اچھا استاد نہ ملے، وہ اپنے منصب اور مرتبے سے غافل ہو تو وہ اپنے بے ڈھنگ انداز تدریس سے اچھے سے اچھے نصاب کو غیر مؤثر بنا کر طلباء کو برباد کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں اساتذہ میں احساس ذمہ داری ختم ہوتا جارہا ہے۔ وہ اپنے فرائض کو صحیح معنوں میں انجام نہ دیتے ہوئے بچوں کا وقت ضائع کرتے ہیں اور انہیں ٹیوشن پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

استاد کے لیئے ضروری ہے کہ وہ نہایت دل سوزی اور لگن سے کام کرے۔ استاد کو فن تعلیم سے خداداد ذوق اور فطری مناسبت ہونی چاہیئے۔ اس کو اپنے موضوع پر اتنا عبور ہو کہ وہ طلباء کے کسی بھی سوال کا بہتر جواب دے سکے۔ استاد مجتہد ہونا چاہیئے۔ اسے ادارے کے اصولوں کا پابند کر کے انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ اس میں خود دل و دماغ سے سوچنے، بات سے بات نکالنے اور اپنا راستہ خود نکالنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے تو ہی وہ اچھا معلم ثابت ہو سکتا ہے۔ طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھے اور اس سلسلے میں مضبوط قوت ارادی اور مستقل مزاجی سے کام لے۔ طلباء کو اسلامی اقدار سے روشناس کرانے کا انحصار معلمین کے علم و عمل پر ہے۔ اگر وہ خود اس سے خالی ہوں اور مغربی کلچر کے خواہاں ہوں تو وہ طلباء میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اسلامی افکار و نظریات کے تحت رہنمائی کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں محض دینیات کے مضمون کے لیئے چند مولوی حضرات کو متعین کر لینا بالکل بے سود ہو گا۔ چنانچہ اساتذہ کی تعیناتی کے وقت

تعلیمی انتظامیہ کا یہ دھیان رکھنا بھی ضروری ہے کہ استاد علوم وفنون میں مہارت رکھنے کے ساتھ پکا مسلمان بھی ہو اور ادارے کے اساسی مقصد اسلامی تہذیب وتمدن کے لیئے فکری و عملی دونوں لحاظ سے مفید ہو۔ جس چیز کی تلقین وہ کرتا ہے اس کا خود مجسم نمونہ ہو۔ عام آدمی کے مقابلے میں استاد پر کہیں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ترویج اسلام اور تربیت طلباء کے لیئے پہلے خود اس کا عملی نمونہ بنیں اور پھر اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ استاد چاہے کسی بھی موضوع میں خصوصیت رکھتا ہو وہ زندگی کے مسائل سے باخبر ہو اور طلباء کی بہتر رہنمائی کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ اسے اپنی شخصیت پر اتنا اعتماد ہو وہ کسی بھی مسئلے پر اپنی آزادانہ رائے دے سکے۔

اساتذہ کی مندرجہ بالا پہلوؤں کے حوالے سے تربیت کے لیئے پیشہ وارانہ تنظیم کی رکنیت ہے جو اساتذہ کی تربیت کے ضامن بنے۔ جس میں اساتذہ کو طلباء کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھانے کے طریقے سکھائے جائیں۔ جدید طرز تدریس سے آگاہ کیا جائے جو کہ تعلیمی مواد کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کے لیئے معاون ثابت ہوں۔ ان تنظیمزں کی پیشہ وارانہ اور علمی سرگرمیوں سے اساتذہ اپنی کارکردگی کو بلند کر سکتے ہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں فن معلمی کی ترقی کا بعت حد تک انحصار پیشہ وارانہ تنظیم پر ہے۔ یہ تنظیمیں اساتذہ کے تحقیق و مطالعہ کے کاموں اور دیگر پیشے سے حوالے کارکردگی کی حصلہ افزائی کرتی ہیں تا کہ وہ اپنے پیشہ معلمی کو معزز تصور کریں اور علمی لحاظ سے زیادہ بہتر نتائج حاصل ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ (Code of ethics) بھی ہیں جو ہر رکن تنظیم کے لیئے لازمی ہیں کہ وہ رضاکارانہ طور پر ان کی پابندی کرے۔ یہ ضابطہ اخلاق فرائض و حقوق اور مراعات کے بارے میں واضح نقطہ نظر فراہم کرتا ہے۔ ضابطہ اخلاق میں پائی جانے والی خصوصیات کو پیشے سے متعلق افراد خود تسلیم کرتے ہیں اور اپنے اوپر لاگو کرتے ہیں جیسا کہ طلباء میں اسلامی نظریہ حیات کا شعور بیدار کرنا ، طلباء کے ساتھ عادلانہ اور غیر جانبدارانہ سلوک کرنا اور ان کی جسمانی، روحانی تخلیقی اور اخلاقی تربیت کرنا وغیرہ[1]۔

اساتذہ کو طلباء کی اخلاقی تربیت کے حوالے سے معلم اعظم ﷺ کی حیات طیبہ کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے اور تربیت کے حوالے سے نبوی اقدامات کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نیز تعلیمی اداروں میں کانفرنس اور سیمینار کے انعقاد سے بھی اساتذہ کو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق نئے طریقہ تدریس سے روشناس کرایا جاسکتا ہے اور موجودہ دور کے پیش آمدہ مسائل اور ان کے حل تجاویز کیئے جاسکتے ہیں۔ سرکاری سطح پر بھی چند تبدیلیوں کی ضرورت ہے ، بہتر تعلیمی سہولیات، اساتذہ کی مناسب تنخواہیں اور بہتر مراعات سے بھی مؤثر نتائج حاصل کیئے جاسکتے ہیں۔

---

(۱) تعلیم وتدریس، ص:۳۴۴

(د) تعلیمی اداروں میں اسلامی ماحول: کسی بھی ادارے میں طلباء کی اخلاقی تربیت کے لیئے ضروری ہے کہ ایسا ماحول بھی فراہم کیا جائے جو ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے لیئے بھی موزوں ہو۔ عصر حاضر کے جامعات کے طلباء کے آداب واطوار، طرز معاشرت اور رفتار و گفتار کو دیکھا جائے تو ان میں مغربی رجحانات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ یونیورسٹیوں کا ۹۵ فیصد ماحول مغربی تہذیب و تمدن پر مبنی ہے۔ ایسے ماحول میں نشوونما پانے والے طلباء میں اسلامی طرز حیات اور اخلاقی اقدار کس قدر نمایاں ہو سکتی ہیں۔ اخلاقی تربیت کے لیئے اسلامی ماحول کو زندہ کرنا ضروری ہے۔ محض ذہنی تصورات اور اصولوں سے کوئی بھی تہذیب نہیں پیدا ہوتی بلکہ عملی برتاؤ سے نشوونما پاتی ہے اگر عمل مفقود ہو جائے تو ذہنی وجود بھی برقرار نہیں رہتا۔ تعلیمی اداروں کے ماحول میں اسلامی اصول وروایات کو ڈھالا جائے گا تو ہی طلباء میں اخلاقیات کی روح نظر آئے گی۔ دین اسلام ہی ایسا دین ہے جو طلباء میں تعلیم کے ساتھ اخلاقی وروحانی تربیت کو فروغ دیتا ہے اور حقیقی اعتقادی و عملی کامل مسلمان بننے کے لائق بناتا ہے مگر اس کے لیئے ضروری ہے کہ ایسے اسباب بھی فراہم کیئے جائیں جن میں دین اسلام کا غلبہ ہو، جس کے لیئے چند ضروری عوامل کو ذکر کیا جاتا ہے۔

۱) غیر نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کی اسلامی اصول ضوابط سے مطابقت ہونی چاہیئے۔

۲) جن اوقات کی نمازیں تعلیمی دورانیہ میں آئیں، ان کی ادائیگی کے لیئے اداروں میں اہتمام کیا جائے۔ ہر جماعت کے اندر ایک "ناظم صلوۃ" کا تقرر کیا جائے جو روزانہ ادائیگی صلوۃ کے لیئے طلباء کی حاضری کو یقینی بنائے۔ قرآن مجید کی تلاوت و تفہیم کے لیئے تعلیمی ادارے کے نظام الاوقات میں ایک پیریڈ ابتداء ہی میں مخصوص کر دیا جائے تاکہ دن کا آغاز اللہ کے کلام سے ہو۔

۳) طلباء میں اچھی عادات کو پیدا کرنے کے لیئے مثلاً کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، پانی پینے، چھینک آنے، سلام کرنے وغیرہ سے متعلق اسلامی تعلیمات پر تعلیمی اوقات کار میں عمل کروایا جائے۔

۴) سکول اور کالج کی سطح پر طلباء کو اخلاقی حسنہ کو اختیار کرانے اور برے اخلاق کو ترک کرنے کے لیئے ہر ہفتے ایک اخلاقی ماٹو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک ہفتہ سچ بولنے کے لیئے مخصوص کر لیا جائے اور ہر روز دوران اسمبلی اساتذہ اور طلباء اس کی وضاحت کریں اور تقاریر کی جائیں۔ نیز سب مل کر اس پر عمل کریں اور ایک دوسرے کا محاسبہ کریں۔ اسی طرح سے غیبت، امانت اور آداب زندگی پر بھی اخلاقی ماٹو اختیار کیئے جاسکتے ہیں۔

۵) تعلیمی اداروں کے اندر اسلامی تقریبات کا اہتمام کیا جائے۔ عیدین، لیلۃ القدر، شب معراج، استقبال رمضان وغیرہ کی اہمیت اور مقصدیت سے متعلق طلباء کو آگاہ کیا جائے۔

۶) طلباء میں نظم وضبط کی پابندی، ٹیم سپرٹ اور باہمی تعاون کا رجحان پیدا کرنے کے لیئے اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے کھیلوں کا انعقاد کیا جائے۔ جن سے طلباء کی جسمانی نشو ونما بھی ہو گی اور ہارنے اور جیتنے کا غم برداشت کرنے کی عادت بھی پیدا ہو گی۔

۷) تعلیمی اداروں میں مخلوط نظام تعلیم سے اجتناب کیا جائے۔ عمر کا ابتدائی حصہ جس میں بچے صنفی جذبات سے عاری ہوتے ہیں یعنی آٹھ نو سال کی عمر تک مخلوط تعلیم کی گنجائش ہے۔ لیکن جب بچوں میں جنسی شعور پیدا ہو جائے اور ان میں صنفی جذبات کی بھی پہچان ہو جائے تو دونوں کو ایک ساتھ مل بیٹھنے کا موقع دینا فتنے کا باعث ہے۔ شریعت میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے کی مکمل آزادی ہے مگر ایسی تعلیم گاہ کی گنجائش نہیں جس میں مرد اور عورت میں باہم اختلاط ہو۔ اسلام عورتوں کو تعلیم کی پرزور تاکید کرتا ہے ، البتہ تعلیم ایسی ہو جو ان کی فطرت اور قوت فکر وادراک کے مناسب ہو اور ان کی عفت کی حفاظت میں ممد و معاون ثابت ہو۔

(ح) زبانیں حصول علم کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ ہمارے طلباء کو نہ صرف اردو بلکہ عربی، انگلش اور فارسی وغیرہ پر بھی عبور ہونا چاہیئے۔ جس کے لیئے ضروری ہے کہ ابتدائی جماعتوں ہی میں زبانوں کی تدریس کو اہمیت دی جائے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم تشکیل دیتے وقت کسی بھی مضمون سے متعلقہ معلومات اس کی اصل زبان میں دی جائے، جیسا کہ سائنس سے متعلق معلومات انگریزی زبان میں، عبادات و اخلاقیات سے متعلق معلومات عربی زبان میں مہیا کی جائے۔ اس میں ایک اور بات کا خیال رکھا جائے کہ کسی بھی زبان کی تدریس میں اس کا کلچر اسلامی ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ انگریزی زبان کو پڑھانے کے لیئے ایسا مواد اکٹھا کیا جائے جو اسلامی نوعیت کا ہو نہ کہ انگریزی زبان اپنے ساتھ مغربی کلچر کو لے کر آئے۔ اسی طرح سے عربی زبان کی تدریس مشقوں میں وہ مواد ڈالا جائے جو قرآن مجید سے متعلقہ ہو تاکہ طلباء کو عربی کے ساتھ ساتھ قرآن کی تفہیم میں بھی آسانی ہو۔

(ذ) ایک قومی مہم کا آغاز کرنا چاہیئے جس میں سیاسی اور معاشرتی دباؤ کے ذریعے انگریزی کی بالادستی کو ختم کر کے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیئے سرگرم عمل ہونا چاہیئے۔ خاص طور پر مقابلے کے امتحان کا ذریعہ اردو ہونا چاہیئے تاکہ انگریزی زبان کی اہمیت کو کم کیا جا سکے۔ انگریزی زبان کے تسلط سے ایسا غلامانہ سوچ رکھنے والا طبقہ تیار ہو رہا ہے جو مغربی کلچر سے مرعوب اور اسلامی اقدار رو روایات کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہے۔ جس کی وجہ سے افراد انفرادی اور اجتماعی بگاڑ کا شکار ہیں۔ یکساں ذریعہ تعلیم ہی قومی اتحاد و یکجہتی کا ضامن ہے۔

نتائج مقالہ

۱) معاشرے میں انسانی تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیئے اخلاق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عقائد وعبادات کے بعد تیسرا درجہ اخلاق کا ہے۔ اخلاق کا تعلق اصلا کردار انسانی سے ہے مگر یہ ایسی باطنی کیفیت کا نام بھی ہے جو نفس انسانی میں اس قدر دائمی صورت میں موجود ہوتی ہے کہ اس کی فطرت بن جاتی ہے اور پھر بغیر فکر وارادہ کے اس سے اعمال صادر ہوتے ہیں جنہیں خلق کہتے ہیں۔

۲) انسان کے اندر فطری طور پر محرکات اخلاق کا پایا جانا کافی نہیں بلکہ اس کے لئیے ضروری ہے کہ ایسا ضابطہ اخلاق اپنایا جائے جو کہ معاشرے میں احسن طریقے سے طرز معاملات اور رویوں کے تحت متعین کیا گیا ہو جنہیں اخلاق حسنہ کہا جاتا ہے۔

۳) اسلام بنی نوع انسان کو اچھے اخلاق (احسان، عدل، صلہ رحمی اور عفو ودرگزر وغیرہ) کو اپنانے اور رذائل اخلاق (حرص، حسد، ظلم، غیبت وغیرہ) سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اچھے اخلاق کو اپنانے کے لیئے علم الاخلاق سے آگاہی بہت ضروری ہے ایسا علم جو خیر وشر میں فرق واضح کرتا ہے۔

۴) علم الاخلاق کا موضوع جماعت کی فلاح واصلاح ہے اور اجتماعی زندگی ہی میں فرد کا تحقق ممکن ہے۔ علم الاخلاق فلسفہ کی ایک شاخ ہے جو کہ باقی تمام علوم علم النفس، علم قانون، علم عمرانیات اور علم معاشیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۵) نوجوانوں کا طبقہ معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسلام نے معاشرے کی اصلاح کے لئے نسل نو کے کردار کو سراہا اور انہیں تعمیری اور ذمہ دارانہ سوچ مہیا کی۔

۶) نبی اکرم ﷺ نے نوجوانوں کی شخصیت میں اعتدال کی روش پیدا کی اور انہیں مثبت راہ پر گامزن کیا۔ آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت سے بڑی تعداد میں معلم ومربی نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منظر عام پر آئے۔ آپ ﷺ نے ان نوجوان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قائدانہ صلاحیتوں کو خوب بروئے کار لایا جس سے اسلام کو فروغ اور استحکام ملا۔ ان معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

۷) نوجوان قوم کا قیمتی اثاثہ ہیں، قوم کی کامیابی وکامرانی اسی میں ہے کہ نوجوان طبقہ فرض شناس اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتا ہو۔ نسل نو کو اصلاح معاشرہ کے لیئے دعوت وتبلیغ، جہاد، تعلیمی نظام کی اصلاح، خاندانی استحکام اور ذرائع ابلاغ وغیرہ میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔

۸) تعلیم ایک بہت بڑی نعمت ہے، تمام مخلوقات میں سے صرف بنی نوع انسان کو اللہ تعالی نے تعلیم و تعلم کے لیئے چنا۔ تعلیم کا مقصد ذات الہی کی پہچان، تزکیہ نفس، تعمیر انسانیت اورانسان کو عطا کردہ خداداد صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔

۹) کسی بھی ریاست کے اندر تعلیمی اداروں کا نظم وڈھانچہ ایسا یکساں اور معیاری ہونا چاہیئے، جس سے اجتماعی سطح پر ریاست کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ افراد معاشرہ کی روحانی واخلاقی ضروریات کی تکمیل بھی ہو۔ تعلیمی اداروں میں نظام تعلیم کے بنیادی عناصر استاد، طالب علم، نصاب اور معاشرہ مل کر ایک نظام تشکیل دیتے ہیں۔

۱۰) عصر حاضر میں متوازی سطح پر دو مختلف اقسام کے نظام تعلیم کام کر رہے ہیں۔ ایک دینی مدارس کا نظام تعلیم جو صرف علوم دینیہ کے حصول تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور جدید مغربی علوم واصطلاحات سے ناواقف ہیں۔ دوسری طرف جدید علوم پر مشتمل ادارے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں وغیرہ جو جدید مغربی افکار وقدروں کے تو حامل ہیں مگر وہ جدید علوم ومسائل سے متعلقہ تعلیمات اسلامی سے نا آشنا ہیں۔ لہذا ان دونوں طرح کے نظام تعلیم سے دو الگ شخصیات تیار ہو رہی ہیں اور کسی کو بھی مثالی شخصیت نہیں کہا جاسکتا جو دینی ودنیاوی دونوں علوم پر عبور رکھتی ہو۔

۱۱) اسلام وحدانیت ویکسانیت کا قائل ہے اور دین الہی تمام تر علوم کا مجمع ہے۔ اہل علم کو مشترکہ معاونت سے ایسا یکساں نصاب تیار کرنے کی ضرورت ہے جو افراد معاشرہ کو تعلیمات اسلام کو عصری تقاضوں کے مطابق معاملات زندگی میں عملاڈھالنا کا اہل بنائے۔

۱۲) سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں نے معاشرے میں طبقاتی تفاوت پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ جس طرح سے حکومت کی بنائی ہوئی تعلیمی پالیسیوں، نصاب اور اساتذہ کے مشاہرے وغیرہ سرکاری اداروں پر لاگو ہوتے ہیں اسی طرح نجی اداروں میں بھی ان کا نفاذ یقینی بنایا جائے۔

۱۳) جامعات کے نصاب تعلیم میں مغربی کلچر چونکہ عصری عنصر ہے اس لیئے وہ زیادہ اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ نصاب کو اسلامی رنگ دینے کے لیئے اسلامیات کو بطور مضمون کے شامل کر دینا مساویانہ طرز عمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں، مغربی تہذیب کے دلدادہ اور دین سے دور ہیں۔

۱۴) اسلامی واخلاقی اقدار کو فروغ دینے کے لیئے فنی وپیشہ وارانہ تعلیم کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ منسلک کرنا چاہیئے تاکہ جہاں بے روزگاری کا خاتمہ ممکن ہو وہاں ہر شعبہ زندگی میں عملا اسلامی اقدار کا عکس نظر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ مغربی علوم وفنون کے درست اجزاء کو بھی اپنے اندر جذب کرلے۔

۱۵) عصر حاضر کے تعلیمی اداروں میں سیکولر نظام تعلیم اور مغربی تہذیب کی بالادستی نے اخلاقی اقدار کو مفقود کر دیا ہے۔ سیکولر نظام تعلیم نے دین کو ایک پرائیویٹ مسئلہ بنادیا ہے جس کا اجتماعی اور قومی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۶) معیار تعلیم غیر ملکی زبان انگریزی کو بنایا جارہا ہے جس نے معاشرے میں طبقاتی تفاوت پیدا کر دیا ہے، تخلیقی صلاحیتیں مفلوج ہو گئی ہیں اور تقلیدی اذہان پیدا ہو رہے ہیں۔

۱۷) سرمایہ دارانہ نظام تعلیم کی رو سے تعلیم کا مقصد روزگار کا حصول اور سرمایہ کی خدمت ہے۔ تعلیمی اداروں میں اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا فقدان ہے، دین کو محض قرآن کا ناظرہ پڑھانے تک محدود کر دیا گیا ہے۔

۱۸) اسلامی تربیت کا سب سے پہلا وسیلہ معلم کا کردار ہے۔ دیکھا جائے تو اساتذہ اپنے فرائض و ذمہ داریوں سے غفلت برتے ہوئے ہیں اور محض ایک مخصوص کورس طلباء تک پہنچانے تک اپنے آپ کو محدود کیا ہوا ہے۔ طلباء کی تعلیمی و معاشرتی سرگرمیوں اور دینی و اخلاقی تربیت کا کوئی رجحان نہیں۔

۱۹) الیکٹرانک میڈیا پر ٹی وی اور انٹرنیٹ پر دکھائی جانے والی فحش فلمیں عریانی اور کارٹون وغیرہ نسل نو کی اخلاقی اور دیگر برائیوں کا سبب ہیں۔

۲۰) والدین اخلاقی و روحانی تربیت کی بجائے سٹیٹس بنانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں جبکہ والدین کو مادی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ اخلاقی و روحانی تربیت کا فریضہ بھی انجام دینا چاہیئے۔ بچوں کی صحیح پرورش کے لیئے خاندانی نظام کا استحکام بہت ضروری ہے۔ والدین کا باہمی انتشار و تنازعہ بچوں کی تربیت پر برا اثر ڈالتا ہے۔

۲۱) بچوں کی بری صحبت ان کے اخلاق و کردار پر برا اثر ڈالتی ہے۔ غیر موزوں کتابیں اور رسالے بھی نسل نو کی اخلاقی تنزلی کا سبب ہیں۔

۲۲) نبی اکرم ﷺ نے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت دین و دنیا دونوں میں اعتدال کی روش اختیار کرنے پر کی۔ آپ ﷺ وقت و حالات کے تقاضوں، سننے والے کے میلانات و رجحانات کو سمجھتے ہوئے، سوال و جواب کے ذریعے، بیانیہ و اطلاعی، تقریری و خطابت طریقہ کار وغیرہ سے مؤثر انداز میں تعلیم و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔

۲۳) آپ ﷺ نے اخلاقی و روحانی تربیت کے لیئے نوجوانوں کو زندگی کے اصل نصب العین سے روشناس کرایا۔ دعوت و تبلیغ کے ذریعے اسلام کی اخلاقی قدروں کی وضاحت کی اور بذات خود عملی نمونہ بن کر دکھایا۔ مسلمانوں کو برائیوں سے نکالنے کے لیئے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے تدریجاً احکامات الٰہی کو ان کی زندگیوں میں ڈھالا۔

۲۴) عہد نبوی ﷺ کے تعلیمی مدارس میں اسلامی ماحول، حریت فکر، مساوات، بغیر معاوضے کے تعلیم اور اخوت و عدل و انصاف جیسی قدروں پر مبنی تھے۔ انہیں اخلاقی اقدار کو اگر عصر حاضر کے نظام تعلیم میں سمو یا جائے تو معاشرتی، سیاسی، فکری اور معاشی لحاظ سے بہت سے مثبت نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

سفارشات

۱. عصر حاضر میں نظام تعلیم کو دین اسلام کی بنیادوں اور اصولوں پر قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ افراد معاشرہ کی روحانی ومادی دونوں لحاظ سے تربیت کی جاسکے۔

۲. نوجوان نسل کو انفرادی واجتماعی سطح پر معاشرے کی اصلاح میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔ دین اسلام کی ترویج واشاعت کے لیئے جدید ذرائع ابلاغ سوشل ویب سائٹس، موبائل ایپلی کیشنز وغیرہ کو بروئے کار لاتے ہوئے، اسے دشمنان اسلام کے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لیئے خالی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

۳. استاد کا فرض طلباء کو محض علوم کی فراہمی نہیں بلکہ ان کی روحانی واخلاقی تربیت بھی ہے۔ اساتذہ کو اپنے فرائض کی انجام دہی کی فکر ہونی چاہیئے اور طلباء کی تربیت اور کردار سازی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔ جس کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو دوسروں کے لیئے مشعل راہ بنائیں۔

۴. ملت اسلامیہ کی یکجہتی کے لیئے ضروری ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں ایک ہی نوعیت کے تعلیمی مقاصد کا عملا نفاذ کیا جائے، ایسے مقاصد جو طلباء کی دینی تعلیمات کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ جدید علوم ومسائل پر بھی روشنی ڈالیں۔

۵. تمام تعلیمی اداروں میں یکساں نصاب سازی کے لیئے ضروری ہے کہ ایک ایک منظم ومربوط مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔ جس میں ماہرین واساتذہ پر مبنی کمیٹیاں بنائی جائیں جن کی آراء اور مشورے سے، قوم کی ذہنی واخلاقی تربیت اور معاشی واقتصادی نشوونما کے لیئے نصاب سازی کی جائے۔ ایک ہی منبع سے نصاب کا تیار ہونا فکری یکسانیت اور قومی ہم آہنگی کے لیئے بہت ضروری ہے۔ تمام نجی وسرکاری تعلیمی اداروں میں اسی نصاب کی پیروی کو یقینی بنایا جائے۔

۶. دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کے دوالگ نظام تعلیم کو ختم کیا جائے۔ درس نظامی کے نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں اور جدید نظام تعلیم کو تعلیمات اسلامی سے مطابقت دینے کی اشد ضرورت ہے۔ نئے سرے سے ایسا نظام تعلیم مرتب کیا جائے جو دینی ودنیاوی دونوں مقاصد کو پورا کرے۔ جس کے لیئے ایک مشترکہ تعلیمی بورڈ کا انعقاد ہونا چاہیئے۔ یہ تعلیمی بورڈ دونوں اقسام کے علوم کے ماہرین اور تمام مسالک کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور ان کی باہم مشاورت اور حتمی فیصلے سے کتب کا چناؤ کرتے ہوئے نصاب کو مدون کیا جائے۔

۷. مذہبی تعصب، فرقہ وارانہ اختلافات اور جہالت کا خاتمہ کرنے کے لیئے اہل علم وفضل کو چاہیئے کہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے افکار و نظریات کو تحمل اور خندہ پیشانی سے سمجھتے ہوئے، مشترکہ معاونت سے اسلامی نظام تعلیم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں اور دینی تعلیم کو جدید خطوط پر نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔

۸. حکومت کو چاہیئے کہ نصاب سازی کے دوران دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کے لیئے مخصوص تعلیمی کورسز کا شمار کریں، جن کے حصول سے وہ کسی ہنر میں مہارت حاصل کر سکیں اور صاحب روزگار ہوں۔ دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کو بھی ملکی قیادت سنبھالنے کے مواقع فراہم کیئے جاسکتے ہیں۔

۹. حکومت اور دینی مدارس کے درمیان تعلقات کو استوار کیا جائے۔ حکومت پاکستان کو مدارس کے اندرونی معاملات اورانتظامی خود مختاری کو یقینی بنانا چاہیئے۔

۱۰. سرکاری تعلیمی اداروں کی طرح نجی اداروں میں بھی حکومت کی بنائی گئی تعلیمی پالیسیوں کا نفاذ یقینی بنایا جائے۔ ان میں نصاب تعلیم، کتب، اساتذہ کے لیئے مشاہرے اور امتحانات کا انعقاد اسی طرح سے ہو جو سرکاری تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ حکومت سرکاری اداروں کی جانچ پڑتال کی طرح نجی اداروں کی نگرانی کا بھی اہتمام کرے۔

۱۱. جامعات کے چارٹر میں نظریہ پاکستان کے مطابق مقاصد میں ترامیم کی جائیں اور نظریاتی مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کے فرائض و تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بنایا جائے۔ غیر ملکی تہذیب و تمدن کی نسبت ملکی شعور اور اخلاقی وروحانی تربیت کو فروغ دیا جائے۔

۱۲. جامعات میں پڑھائے جانے والے دینیات کے مضمون کو تربیت نو کی ضرورت ہے۔ اسے عصر حاضر میں درپیش مسائل سے منطبق کیا جائے۔

۱۳. معاشرے میں فلاحی اور اصلاحی انقلاب لانے کے لیئے الیکٹرانک میڈیا کو بجائے مغربی تہذیب کی بالادستی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے کے لیئے بروئے کار لانا چاہیئے۔

۱۴. ملک میں یکساں ذریعہ تعلیم ہی اتحاد و یکجہتی کا ضامن ہے۔ جبکہ مختلف ذریعہ ہائے تعلیم کی موجودگی ملک میں تعلیم کے معیار کو بھی پست کر رہی ہے۔ لہذا دستوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ذریعہ تعلیم اردو ہی کو بنانا چاہیے تاکہ معیار تعلیم کو یکساں تقاضوں پر بلند کیا جاسکے۔

۱۵. حکومتی سطح پر درست تعلیمی پالیسز، انتظامات اور اچھی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے تعلیمی و معاشرتی مسائل پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔

۱۶. اسلامی طرز فکر کو ہر علم میں جاری وساری کیا جائے چاہے اس کا تعلق قرآن وحدیث سے ہو یا سائنسی علوم سے تاکہ انسان جس دائرے میں بھی کام کر رہا ہو اس کا انداز فکر اسلام سے مطابقت رکھتا ہو۔ نئے نظام تعلیم میں تشکیل سیرت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔

۱۷. اسلام کے ماخذ اصلیہ تک پہنچنے کے لیئے عربی زبان ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ اعلی تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔

۱۸. کالج کے چار سالہ نصاب تعلیم میں عربیت، قرآن اور تعلیمات اسلامی کو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ انٹر میڈیٹ میں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے اس کے بعد عربی زبان لازمی ہونی چاہیئے۔ اس کی تعلیم ایسی متوسط ہونی چاہیئے، جو طلباء میں اتنی استعداد پیدا کر دے کہ بی-اے میں پہنچ کر طلباء خود قرآن کو اس کی زبان میں سمجھنے لگیں۔

۱۹. سکول کے نصاب تعلیم میں عقائد، اخلاق اور احکام شریعہ سے متعلق دی جانے والی تعلیم میں ترامیم کی جائیں۔ ایمانیات سے متعلق تعلیم عقلی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دی جائے۔ اور طلباء کے کردار کو اعلیٰ اخلاقی قدروں کا پیکر بنانے کے لیئے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت سے متعلقہ واقعات کو شامل نصاب کیا جائے نیز احکام شریعہ سے روشناس کرانے کے لیئے جزئیات سے ہٹ کر انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلقہ فقہی احکامات کو نصاب میں شامل کیا جائے۔

۲۰. دینیات کا موجودہ نصاب تعلیمی مدارج کے لحاظ سے ناکافی اور غیر مربوط ہے۔ اس میں قرآن مجید، سیرۃ النبی ﷺ، حدیث، فقہ واصول سے متعلقہ مواد کو ڈالتے ہوئے توسیع کی ضرورت ہے۔

۲۱. ایسی مقامی یونیورسٹیاں جن میں علوم اسلامیہ کا شعبہ ہو انہیں مدارس کے گریجوایشن (عالیہ) اور ماسٹرز (عالمیہ) کے طلباء کے امتحانات لینے اور حکومت کی منظور شدہ ڈگری جاری کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے تاکہ مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کی تعلیم اور ڈگریوں کو بھی وہی مقام حاصل ہو گا جو باقی یونیورسٹیوں کے طلباء کو ہوتا ہے اور ملازمتوں کے حصول میں بھی ان کو مساوی حیثیت حاصل ہو۔

۲۲. زبانیں حصول علم کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ ہمارے طلباء کو نہ صرف اردو بلکہ عربی، انگلش اور فارسی وغیرہ پر بھی عبور ہونا چاہیئے جس کے لیئے ضروری ہے کہ ابتدائی جماعتوں ہی میں زبانوں کی تدریس کو اہمیت دی جائے۔

فہارس مقالہ

فہرست آیات کریمہ

فہرست احادیث

فہرست شخصیات

مصادر والمراجع

فہرست آیات کریمہ

نمبر شمار	آیات	سورۃ اور آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱.	الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ ...	البقرۃ:۲/۲۹	۷۲
۲.	وَإِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِإِنِّي جَاعِلٌ	البقرۃ:۲/۳۰	۱۲۱،۱۱۰
۳.	وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَكُلَّهَا	البقرۃ:۲/۳۱	۱۰۰
۴.	أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ	البقرۃ:۲/۶۷	۴۷
۵.	يَاأَيُّهَاالنَّاسُ كُلُوامِمَّافِي الْأَرْضِ حَلَالًا....	البقرۃ:۲/۱۶۸-۱۶۹	۱۰۲
۶.	وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ ----	البقرۃ:۲/۱۷۹	۱۰۷
۷.	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ....	البقرۃ:۲/۲۰۷	۱۳۱
۸.	كَانَ النَّاسُ أُمَّةًوَاحِدَةًفَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ...	البقرۃ:۲/۲۱۳	۱۲۴
۹.	يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ ---	البقرۃ:۲/۲۶۹	۳۵
۱۰.	زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ....	آل عمران:۳/۱۴	۲۲
۱۱.	شَهِدَاللَّهُ أَنَّهُ لَاإِلَهَ إِلَّاهُوَوَالْمَلَائِكَةُ	آل عمران:۳/۱۸	۱۱۶
۱۲.	قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ	آل عمران:۳/۳۲	۱۷
۱۳.	ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ	آل عمران:۳/۶۱	۵۱
۱۴.	وَاعْتَصِمُوابِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًاوَلَاتَفَرَّقُوا	آل عمران:۳/۱۰۳	۱۰۸
۱۵.	وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ	آل عمران:۳/۱۰۴	۱۲۴
۱۶.	كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ	آل عمران:۳/۱۱۰	۴۳
۱۷.	وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	آل عمران:۳ /۱۳۳-۱۳۴	۴۱
۱۸.	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ	آل عمران:۳/۱۵۹	۱۵
۱۹.	لَقَدْمَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْبَعَثَ	آل عمران:۳/۱۶۴	۱۳۰

۲۰.	يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ --	النساء:۴/۱	۴۲
۲۱.	وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ	النساء:۴/۲۴	۳۴
۲۲.	يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ --	النساء:۴/۲۹	۷۴
۲۳.	أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ....	النساء:۴/۵۴	۴۸
۲۴.	مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ	النساء:۴/۸۰	۱۷
۲۵.	وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا	النساء:۴/۱۲۲	۳۷
۲۶.	أَوْ تَعْفُوا عَن سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا	النساء:۴/۱۴۹	۴۰
۲۷.	وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى	المائدہ:۵/۲	۱۸۳
۲۸.	وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُفَاقْطَعُواأَيْدِيَهُمَا	المائدہ:۵/۳۸	۱۰۷
۲۹.	إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ	الأنعام:۶/۵۶	۲۷
۳۰.	قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي	الأنعام:۶/۱۶۲	۱۲۲
۳۱.	قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ	الأنعام:۶/۱۶۴	۱۲۲
۳۲.	قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ	الأعراف:۷/۲۹	۱۸
۳۳.	وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي....	الأعراف:۷/۴۳	۵۲
۳۴.	يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ	التوبہ:۹/۲۳	۶۶
۳۵.	الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا	التوبہ:۹/۳۴	۷۲
۳۶.	فَلَوْلَانَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍمِنْهُمْ طَائِفَةٌ....	التوبہ:۹/۱۲۲	۱۵۵
۳۷.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ	التوبہ:۹/۱۱۹	۱۹۰
۳۸.	وَمَاكَانَ النَّاسُ إِلَّاأُمَّةًوَاحِدَةً	یونس:۱۰/۱۹	۱۲۵
۳۹.	لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ	یونس:۱۰/۲۶	۳۱
۴۰.	فَمَا آمَنَ لِمُوسَى إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِنْ قَوْمِهِ	یونس:۱۰/۸۳	۸۲
۴۱.	إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ	یوسف:۱۲/۴۰	۲۷
۴۲.	وَمَاأُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ	یوسف:۱۲/۵۳	۱۲۳
۴۳.	وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ	النحل:۱۶/۷۸	۱۲۶

۴۴.	إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ	النحل:۱۶/ ۹۰	۱۵،۳۶
۴۵.	ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ....	النحل:۱۶/ ۱۲۵	۲۲۳
۴۶.	وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا	الاسراء:۱۷/ ۲۶	۲۳
۴۷.	إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ	الاسراء:۱۷/ ۳۰	۷۵
۴۸.	نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ	الکھف:۱۸/ ۱۳-۱۴	۷۹
۴۹.	فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ	المریم:۱۹/ ۳۷	۱۴۱
۵۰.	فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ	المریم:۱۹/ ۵۹	۵۶
۵۱.	الزَّانِيَةُوَالزَّانِيفَاجْلِدُواكُلَّوَاحِدٍمِنْهُمَامِائَةَجَلْدَة	النور:۲۴/ ۲	۱۰۸
۵۲.	وَأَنْكِحُواالْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ ---	النور:۲۴/ ۳۲	۱۰۶
۵۳.	وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي	الفرقان:۲۵/ ۲۷-۲۸	۱۹۰
۵۴.	أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ	الفرقان:۲۵/ ۴۳	۲۰۷
۵۵.	مَن كَانَ يَرجُو لِقَاءَ اللهِ	العنکبوت:۲۹/ ۵	۱۶
۵۶.	وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ...	الروم:۳۰/ ۳۹	۲۵
۵۷.	اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ ----	الروم:۳۰/ ۵۴	۴۲
۵۸.	لَقَدْكَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌحَسَنَةٌ	الأحزاب:۳۳/ ۲۱	۲۱۲
۵۹.	وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ	الأحزاب:۳۳/ ۳۵	۳۸
۶۰.	يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ...	الأحزاب:۳۳/ ۵۹	۲۱
۶۱.	هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَايَعْلَمُونَ	الزمر:۳۹/ ۹	۱۱۶
۶۲.	وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًامِمَّ نْدَعَ اإِلَى اللَّهِ	فصلت:۴۱/ ۳۳	۹۹
۶۳.	وَسَخَّرَلَكُمْ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ	الجاثیہ:۴۵/ ۱۳	۱۳۵
۶۴.	حَتَّى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً	الأحقاف:۴۶/ ۱۵	۸۰
۶۵.	إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ	الحجرات:۴۹/ ۱۰	۲۴
۶۶.	وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا	الحجرات:۴۹/ ۱۲	۴۹

٦٧.	وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّالِيَعْبُدُونِ	ذریت:۵۱/۵۶	۱۲۲
٦٨.	وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى	النجم:۵۳/۳	۵۹
٦٩.	وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى	النجم:۵۳/۳۹	۷۵
٧٠.	هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ	الرحمن:۵۵/۶۰	۳۶
٧١.	خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ	الرحمن:۵۵/۳-۴	۱۹۸
٧٢.	لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ...	الحدید:۵۷/۲۵	۱۸
٧٣.	وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ	الحدید:۵۷/۲۷	۷۲
٧٤.	يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوامِنْكُمْ	المجادلہ:۵۸/۱۱	۱۱۷
٧٥.	هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا....	الجمعہ:۶۲/۲	۲۲۰
٧٦.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ ...	التحریم:۶۶/۶	۱۸۶
٧٧.	وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ	القلم:۶۸/۴	۵
٧٨.	اقْرَأْبِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ...	العلق:۹۶/۱-۵	۱۱۵
٧٩.	إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ	النصر:۱۱۰/۱-۳	۹۳

فہرست احادیث کریمہ

فہرست احادیث کریمہ

نمبر شمار	طرف حدیث	مآخذ / حدیث نمبر	صفحہ نمبر
۱.	الْإِحْسَانِ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ	الجامع الصحیح / ۴۴۹۹	۳۶
۲.	اغْتَنِمْ خَمْسًاقَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ ...	المستدرک علی الصحیحین / ۷۸۴۶	۸۲
۳.	أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا	سنن أبی داؤد / ۴۶۸۲،	۱۲
۴.	إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ	صحیح مسلم / ۶۶۹۴	۱۶
۵.	إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي	الجامع الصحیح / ۵۷۴۳	۲۰
۶.	إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ ...	سنن أبی داؤد / ۴۷۹۸	۱۲
۷.	إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَأَبَاكُمْ وَاحِدٌ، وَلَا فَضْلَ ...	المعجم الأوسط / ۴۷۴۹	۴۲
۸.	إِنَّكُم لَن تَسعُوَا النَّاسَ بِأموَالِكُم	مسند أبی یعلی / ۶۵۵۰	۱۴
۹.	إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍأَمِينًا،وَأَمِينُ	الجامع الصحیح / ۴۱۲۴	۹۵
۱۰.	اِنَّمَا بُعِثتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الاَخلَاقِ	السنن الکبری / ۲۰۷۸۲	۱۴
۱۱.	إِنَّمَابُعِثْتُ مُعَلِّمًا	سنن ابن ماجہ / ۲۲۹	۸۷
۱۲.	إِنَّمَامَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ...	مسند الشہاب / ۱۳۶۷	۴۳
۱۳.	إنما مثل جليس الصالح و جليس السوء..	شعب الایمان / ۹۴۳۵	۱۹۱
۱۴.	إياكم والحسد فإن الحسد يأكل الحسنات...	الجامع الصحیح / ۴۹۰۳	۴۹
۱۵.	آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ...	الجامع الصحیح / ۲۵۳۶	۵۱
۱۶.	تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوامَاتَمَسَّكْتُمْ...	موطأ امام مالک / ۱۳۹۵	۱۰۲

۱۷.	ثَلَاثٌ مَنْكُنَّ فِيهِ وَجَدَبِهِنَّ حَلَاوَةَالْإِيمَانِ...	الجامع الصحیح/۱۶	۱۰۵
۱۸.	خُذُوا الْقُرْآنَ مِنْ أَرْبَعَةٍ	مسند أحمد بن حنبل/۶۷۹۰	۹۰
۱۹.	الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ	سنن ابی داؤد/۴۸۳۳	۱۹۰
۲۰.	الرَّحِمُ شِجْنَةٌ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ	الجامع الصحیح/۵۹۸۹	۳۹
۲۱.	سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمْ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ....	صحیح مسلم/۴۸۱۶	۸۳
۲۲.	طَلَبُ العِلمِ فَرِيضَةٌعَلٰى كُلِّ مُسلِمٍ	سنن ابن ماجہ/۲۲۴	۱۱۸
۲۳.	فَضْلُ العَالِمِ عَلَى العَابِدِكَفَضْلِي عَلَى ...	الجامع الکبیر/۲۶۸۵	۱۱۹
۲۴.	كَانَ خُلُقُهُ القُرآنَ	مسند أحمد بن حنبل/۲۴۶۰۱	۱۴
۲۵.	كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ	الجامع الصحیح/۸۹۳	۱۸۱
۲۶.	كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ	الجامع الصحیح/۱۳۸۵	۱۸۶
۲۷.	لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا	موطأامام مالک/۱۴۱۱	۵۳
۲۸.	لَاتَزُولُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ القِيَامَةِمِنْ ...	سنن الترمذی/۲۴۱۶	۸۴
۲۹.	لاَ حَسَدَ إِلاَّ فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ	الجامع الصحیح/۷۰۹۱	۴۸
۳۰.	لاَ حُكْرَةَ فِي سُوقِنَا، لاَ يَعْمِدُ رِجَالٌ بِأَيْدِيهِمْ	موطاامام مالک/۵۶	۷۳
۳۱.	اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَايَنْفَعُ وَمِنْ ...	صحیح مسلم/۴۸۹۹	۱۵۶
۳۲.	لما عرج بي مررت بقوم لهم أظفار ...	سنن أبی داؤد/۶۸۷۸	۵۰
۳۳.	مَا أَحَلَّ اللَّهُ شَيْئًا أَبْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ	سنن أبی داؤد/۲۱۷۷	۱۹۲
۳۴.	مَامِنْ شَيْءٍيُوضَعُ فِي المِيزَانِ أَثْقَلُ ...	سنن الترمذی/۲۰۰۳	۱۰۳
۳۵.	مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللَّهُ...	صحیح مسلم/۴۶۸۹،	۴۱
۳۶.	مروا الصبيان بالصلاة لسبع سنين	المستدرک علی الصحیحین/۷۰۸	۱۸۷

۳۷.	الْمُسْلِمُ أَخُوالْمُسْلِمِ لَايَظْلِمُهُ وَلَايُسْلِمُهُ	الجامع الصحیح/ ۲۳۱۰	۱۰۹
۳۸.	مُعَلِّمُ الْخَيْرِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ كُلُّ شَيْءٍ ...	سنن الدارمی/ ۳۵۵	۱۳۱
۳۹.	مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًامِمَّايُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللَّهِ	سنن أبي داؤد/ ۳۶۶	۱۳۴
۴۰.	مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ العِلْمِ فَهُوَفِي سَبِيلِ ...	الجامع الکبیر/ ۲۶۴۷	۱۱۸
۴۱.	مَنْ دَعَاإِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنْ الْأَجْرِمِثْلُ ...	صحیح مسلم/ ۴۸۳۱	۹۹
۴۲.	مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ رِزْقُهُ	الجامع الصحیح/ ۱۹۶۱	۳۹
۴۳.	مَنْ سَلَكَ طَرِيقًايَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا	سنن ابن ماجہ/ ۲۲۳	۱۱۹
۴۴.	مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلَمَةٌ لِأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ ...	الجامع الصحیح/ ۲۳۱۷	۱۳
۴۵.	مَنْ يُرِدْ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ	الجامع الصحیح/ ۷۱	۱۱۸
۴۶.	الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌوَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ	سنن الدارمی/ ۲۸۲۶	۸۳
۴۷.	نَعَمْ تُرْجُمَانُ الْقُرْآنِ ابْنُ عَبَّاسٍ	المستدرک علی الصحیحین/ ۶۲۹۱	۹۲
۴۸.	وَأَعْلَمَهُمْ بِالْحَلالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ	سنن ابن ماجہ/ ۱۵۴	۹۰
۴۹.	وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ....	سنن أبي داؤد/ ۳۶۴۱	۱۳۰
۵۰.	يَامَعْشَرَالشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ ...	الجامع الصحیح/ ۴۷۷۹	۱۰۶
۵۱.	يَسِّرُوا وَلاَ تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا، وَلاَ تُنَفِّرُو	سنن ابی داؤد/ ۳۶۴۱	۱۳۲

فہرست شخصیات

نوٹ: اس فہرست میں ان ماہر نفسیات اور شخصیات کا ذکر کیا گیا جن کی آراء یا کوئی تحقیقی رپورٹ مقالہ کے اندر ذکر ہوئی ہیں۔ راویان مصنفین اور معروف شخصیات کے تذکرہ سے اجتناب کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	شخصیات	صفحہ نمبر
۱.	ارسطو	۳۲
۲.	ایف۔ ایچ گڈ نگز	۶۲
۳.	رالف لنٹن	۶۳
۴.	کارل مارکس	۶۴
۵.	اگست کومٹے	۶۴
۶.	میکس ویبر	۶۵
۷.	درخائیم	۶۵
۸.	آدم سمتھ	۷۰
۹.	الفریڈ مارشل	۷۰

مصادر والمراجع

۱. ابراہیم مصطفیٰ، المعجم الوسیط، دارالدعوۃ، استنبول، ترکی، ۱۹۸۹م

۲. ابن القطاع الصفلی، علی بن جعفر بن علی السعدی، کتاب الأفعال، عالم الکتب، ۱۹۸۳م

۳. ابوالاعلیٰ مودودی(۱۹۷۹)، اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ، الاخوان پبلیکیشنز کراچی، اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۹۸۰ء

۴. ابوالاعلی مودودی(۱۹۷۹)، اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامک پبلیکشنز لمیٹیڈ، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، س ن

۵. ابوالحسن علی بن اسماعیل، المحکم والمحیط الأعظم، المرسی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۰م

۶. ابوالفداء، إسماعیل حقی بن مصطفی(۱۷۱۵م)، روح البیان، دار الفکر، بیروت، س ن

۷. ابوحاتم، محمد بن حبان بن أحمد، الثقات، دائرۃ المعارف العثمانیہ بحیدر آباد الدکن الھند، ۱۹۷۳م

۸. ابوعبدالرحمن الخلیل بن تمیم، الفراہیدی، کتاب العین، دار ومکتبہ الھلال، س ن

۹. ابوعبداللہ محمد بن احمد، شمس الدین القرطبی، الجامع الاحکام القرآن، دار الکتب المصریہ، القاھرۃ، ۱۹۶۴ء

۱۰. ابوعبداللہ محمد بن سعد بن منیع، الطبقات الکبری، (تحقیق محمد عبد القادر عطا)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰م

۱۱. ابوالاعلیٰ مودودی(۱۹۷۹)، تعلیمات، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لوئر مال روڈ لاہور، ۱۹۵۵ء

۱۲. ابوالأعلی مودودی(۱۹۷۹)، امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل، ادارہ معارف اسلامیہ، منصورہ لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۳. ابوالاعلی مودودی(۱۹۷۹)، نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید(تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)، استاذ محمد قطب، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، م۱۹۸۷

۱۴. ابوالاعلی مودودی(۱۹۷۹)، اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء

۱۵. ابوالحسن علی بن اسماعیل، ابن سیدہ، المخصص داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۷م

۱۶. ابوعمر یوسف بن عبداللہ، القرطبی، الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، (تحقیق: علی محمد البجاوی) دارالجیل، بیروت، ۱۹۹۲م

۱۷. الجوھری، أبو نصر اسماعیل بن حماد، الصحاح تاج اللغۃ و صحاح العربیۃ، دار العلم للملایین، بیروت، الطبعۃ الرابعہ، ۱۹۸۷م

۱۸. احمد بن ادریس الطالقانی، الکافی الکفاۃ، المحیط فی اللغۃ، عالم الکتب بیروت، لبنان، ۱۹۹۴م

۱۹. احمد بن فارس بن زکریا، أبو الحسین، مجمل اللغۃ، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۸۶م

۲۰. احمد حسن محدث دہلوی(۱۹۲۰ء)،احسن التفاسیر،،المکتبہ السلفیہ،لاہور،۱۹۹۶ء

۲۱. احمد رضا،علامہ اللغوی، معجم متن اللغۃ،دار مکتبہ الحیاۃ،بیروت،۱۹۵۸م

۲۲. احمد شبلی نعمانی ،تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ ، مترجم(محمد حسین خان زبیری)،ادارہ ثقافت اسلامیہ ،کلب روڈ لاہور،۱۹۸۹ء

۲۳. احمد بن علی بن حجر العسقلانی،الإصابہ فی تمییز الصحابہ،(تحقیق علی محمد البجاوی)دار الجیل،بیروت،۱۴۱۲ھ

۲۴. الأزدی، أبو بکر محمد بن الحسن بن درید، جمھرۃ اللغۃ، دار العلم للملایین،بیروت الطبعۃ الأولی،۱۹۸۷م

۲۵. اسماعیل بن محمد بن الفضل الأصبہانی ،سیر السلف الصالحین، ، (تحقیق کرم بن حلمی بن فرحات) ،دار الرایۃ للنشر،الریاض،س ن

۲۶. امام راغب اصفہانی(۱۱۰۸) ، ابو القاسم الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دارالقلم،الدار الشامیہ،دمشق،بیروت،۱۶۱۲ھ

۲۷. امام فخر الدین الرازی،التفسیر الکبیر،داراحیاء التراث العربی،بیروت،لبنان،۱۹۹۶م

۲۸. آر۔اے۔پی۔روجرس،تاریخ اخلاقیات،،دارالطبع جامعہ عثمانیہ،حیدر آباد دکن،۱۹۳۲ء

۲۹. بشیر احمد ڈار، قرآن مجید کا نظریۂ اخلاق،اسلامک بک سروس،اردو بازار لاہور،۱۹۸۹ء

۳۰. ثریا بتول علوی،استاد ملت کا محافظ، تنظیم اساتذہ پاکستان(خواتین)،المکتبہ الرحمانیہ،جے ماڈل ٹاؤن،لاہور،۲۰۰۶ء

۳۱. جان ڈیوی،اخلاقیات،دارالطبع جامعہ عثمانیہ،حیدر آباد دکن،۱۹۳۲ء

۳۲. جبران مسود،الرائد،دار العلم للملایین،بیروت،۱۹۶۴ء

۳۳. جلال الدین سیوطی،عبد الرحمان بن ابی بکر،الاشباہ والنظائر،دار الکتب العلمیہ،۱۹۹۰م

۳۴. حامد صادق، محمد رواس قلعجی، معجم لغۃ الفقہاء،دار النفائس،الطبعہ الثانیہ،۱۹۸۸م

۳۵. حجۃ الاسلام امام غزالی(۵۰۵ھ)،،احیاء علوم الدین،(مترجم:محمد احسن نانوتوی)،مکتبہ رحمانیہ،اردو بازار،لاہور،س ن

۳۶. حفظ الرحمان سیوہاروی،اخلاق اور فلسفۂ اخلاق،،مکتبہ رحمانیہ،خالد مقبول پبلیشرز،اردو بازار لاہور،۱۹۷۶ء

۳۷. حیدر زماں صدیقی،اسلام کا معاشیاتی نظام،کتاب منزل،لاہور،۱۹۴۹ء

۳۸. خالد علوی، تعلیم اور جدید تہذیبی چیلنج،دعوہ اکیڈمی،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد،۲۰۰۵ء

۳۹. خالق داد رانجھا،اسلام میں قانون سازی،دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری،نسبت روڈ لاہور،س ن

۴۰. الخراسانی، محمد واعظ زادہ،المعجم فی فقہ لغۃ القرآن وسر بلاغتہ،، معجم البحوث الاسلامیۃ،۱۳۹۰ھ

۴۱. سعید احمد رفیق، مسلمانوں کا نظام تعلیم، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ،آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۲

۴۲. سید ریاست علی ندوی، اسلامی نظام تعلیم، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو-پی)، س ن

۴۳. سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، دینی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۵ء

۴۴. سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا،، الفیصل، اردو بازار لاہور، س ن

۴۵. شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، ستارہ مارکیٹ، جی سیون مرکز، اسلام آباد، ۱۹۹۵م

۴۶. شاہ معین الدین احمد ندوی، سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم (مہاجرین)، اسلامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، س ن

۴۷. شاہ ولی اللہ ابن عبد الرحیم (احد)، حجۃ اللہ البالغۃ، دار الکتب، الحیثیہ، مکتبہ المثنی، القاھرہ، بغداد

۴۸. شہاب الدین، محمد دین عبد اللہ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار الکتب العمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ

۴۹. الطاف علی، تعلیمی مسائل پس منظر اور پیش منظر، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۹۵ء

۵۰. عبد الحمید عمر، أحمد مختار، معجم الغۃ العربیۃ المعاصرۃ،، عالم الکتب، ۱۴۲۹ھ

۵۱. عبد الرحمن بن خلدون مقدمہ بن خلدون ، (مترجم :راغب رحمانی دہلوی)، نفیس اکیڈمی ،اسٹریچن روڈ، کراچی، ۱۹۸۲ء

۵۲. عبد الکریم بن ھوازن، القشیری، لطائف الاشارات تفسیر القشیری، الھیئۃ المصریہ، مصر، س ن

۵۳. عبد الوحید، عالمی شخصیات (انسائیکلوپیدیا)، مشتاق بک کارنر، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۴ء

۵۴. عبد الحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات،، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، مکتبہ دانیال، اردو بازار، لاہور، س ن

۵۵. عز الدین ابن الأثیر، أبو الحسن علی بن أبی الکرم، أسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ،، (تحقیق: علی محمد معوض) دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۴م

۵۶. علامہ ابن منظور، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۸۸م

۵۷. علی بن محمد بن علی، الجرجانی، کتاب التعریفات، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۳ء

۵۸. غلام رسول، اسلام کا عمرانی نظام، علم عرفان پبلیشرز، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۴ء

۵۹. غلام عابد خان، عہد نبوی کا نظام تعلیم، عوامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۸ء

۶۰. کرٹ بائیر، اخلاقی نقطۂ نظر (اخلاقیات کی عقلی بنیاد)، مترجم (غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنسز)، ادبی مارکیٹ، لاہور، ۱۹۷۰ء

۶۱. المجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب، فیر وز آبادی ،القاموس المحیط، ، مؤسہ الرسالہ للطباعۃ و النشر، بیروت، لبنان، ۲۰۰۵م

۶۲. محمد الأمین بن محمد المختار، الشنقیطی، أضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن، دار الفکر، بیروت لبنان، ۱۹۹۵م

۶۳. محمد امین، ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل، دائرہ معارف اسلامیہ ،پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء

۶۴. محمد بن ابی بکر بن سعد ، ابن قیم الجوزیہ، مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین، ، دارالکتب العربی، بیروت ۱۹۹۶ء

۶۵. محمد بن احمد بن ابو بکر، قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، دارالفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵م

۶۶. محمد بن جریر، أبو جعفر الطبری، جامع البیان فی تاویل القرآن، مؤسۃ الرسالہ، ۲۰۰۰م

۶۷. محمد ثناء اللہ عثمانی (۱۲۲۵)،،(تفسیر مظہری، مترجم: عبد الدائم الجلالی)، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۸۰ء

۶۸. محمد ذکاء اللہ دہلوی، مکارم الاخلاق، مجلس ترقی ادب، لاہور، س ن

۶۹. محمد صابر الفاروقی، بن علی ابن القاضی، موسوعۃ کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، ، مکتبہ لبنان ناشرون، بیروت، ۱۹۹۹ء

۷۰. محمد عبد المعبود، عہد نبوی میں نظام تعلیم، مکتبہ رحمانیہ، اقراء سنز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، س ن

۷۱. محمد فاروق (۱۴۲۵ھ)، رحمت دو عالم ﷺ اور اسلامی اخلاق، بیت العلوم، ناصبہ روڈ، پرانی انار کلی، لاہور، س ن

۷۲. محمد یوسف الدین، اسلام کے معاشی نظریے، الائیڈ بک کمپنی، جامعہ کراچی، ۱۹۸۴ء

۷۳. محمد بن علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء

۷۴. محمد رفیق وڑائچ، تعلیمی جائزہ اور جائزہ کار، اردو سائنس بورڈ، اپر مال لاہور، ۲۰۰۷ء

۷۵. محمود احمد غازی ،(مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم ، مرتب :عزیز الرحمن) ،الشریعہ اکادمی ،ہاشمی کالونی ، کنگی والا، گوجرانوالہ، ۲۰۰۹ء

۷۶. مسلم سجاد، مجلہ تعلیم (خصوصی تعلیم، شمارہ ۴)، پاکستان میں یکساں نظام تعلیم ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسز اسٹڈیز، مرکز ایف /۷، اسلام آباد،، ۱۹۹۵ء، مقالہ (خواص اور عوام کے تعلیمی ادارے، سلیم منصور خالد)

۷۷. مسلم سجاد، اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۷۸. مسلم سجاد، دینی مدارس کا نظام تعلیم ،(مقالہ: دینی نظام تعلیم :ایک نظر میں از مولانا مفتی عبد القیوم ہزاروی)، انسٹیٹیوٹ آف پالیسیز اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۷۹. مشتاق الرحمن صدیقی تعلیم و تدریس، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

۸۰. مظفر حسین ملاٹھوی، معاشیات اسلام، مکتبہ برہان، غضنفر اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۴ء
۸۱. معین الدین احمد، اسلام کا نظامِ قانون، لاء پبلیکیشنز سیریز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۴ء
۸۲. مہذب لکھنوی، مہذب اللغات، انجمن محافظ اردو بک ڈپو، نیا محل، منصور نگر لکھنؤ، س ن
۸۳. مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات، فیروز سنز لمٹیڈ، عبد السلام، لاہور، س ن
۸۴. ناصر الدین، أبو سعید عبد اللہ بن عمر البیضاوی، أنوار التنزیل وأسرار التأویل، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۸۵. نور الیدن املا، علی بن (سلطان) محمد، جمع الوسائل فی شرح الشمائل، المطبعہ الشرفیہ، مصر، س ن
۸۶. نیر مرحوم نورالحسن، نوراللغات، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
۸۷. وارث سرہندی، قاموس مترادفات، اردو سائنس بورڈ، اپر مال لاہور، ۱۹۸۶ء
۸۸. وحید قریشی، تعلیم کے بنیادی مباحث، انسٹیٹیوٹ آف پالیسز اسٹڈیز اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
۸۹. یوسف بن الزکی عبد الرحمن، تھذیب الکمال، المزی، مؤسسہ الرسالہ، بیروت، ۱۹۱۸۰ء

انگریزی کتب:

90. Catherine Schwarz, George Davidson,Chambers English dictionary, Great Britain by Richard clay Ltd. Bungay Suffolk, Cambridge, U.K, 1988
91. E. Muret and D.sanders ،New Muret- sanders Encyclopedic Dictionary, Langenscheidt , U.S.A Ban Francisco, California,1969
92. G.&.C. Merriam company ,Webster's New Collegiate Dictionary, spinafield, Massachusetts,U.S.A ,nd.
93. John.J. Macionis,Sociology 2nd edition, Neelab printers, Gawalmandi Rawalpind, nd.
94. long man group limited,Longman Dictionary of the English Language, , longman house, Burnt Mill Harlow, England, Merriam –webster.1984
95. John.J. Macionis,Sociology 2nd edition, Neelab printers, Gawalmandi Rawalpind, nd.
96. William Lillie, An introduction to ethics, Methuen 8 co.ltd.London,1995

Websites

97. www.asanet.org

98. www.britannica.com

99. www.finance.gov.pk (Pakistan economic survey-Education 2016-17)